معارفِ اسلامی

بسم الله الرحمن الرحيم

معارفِ اِسلامی

سطح اوّل

تحریر

علماء و محققین

ھدایات

دفتر مرجع آیۃ اللہ الشیخ محمد یعقوبی دام ظلہ

ناشر

مرکز معارف اسلامی

مقدمہ

اسلام خدا کی سب بڑی نعمت ہے۔ نبی کریم ﷺ اور آپؑ کی آل پاکؑ نے اِس دین کی بہت عظمت بتائی ہے۔ اِسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنا سب کچھ اپنی جانوں اور اجساد طاہرہ کو اِس دینِ برحق کی خاطر قربان کیا۔

اسلام ایک ایسا منہج، دستور اور طریقہ وشریعت ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ اِسے اختیار کرلے۔ تاکہ وہ کمال و انسانیت کے اعلیٰ مراتب وحاصل کر سکے۔ اور خلافتِ الٰہیہ کا مستحق قرار پائے۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے: اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اِس آیت میں لفظ 'جاعل' وارد ہوا ہے کہ جو استمرار ودوام پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا زمین پر خدا کی طرف سے مقرر کردہ ایک خلیفہ کا موجود ہونا ضروری ہے کہ جو پوری دنیا پر لوگوں کے لیے اِسلام کی ذمہ داری اُٹھائے۔ اِس بنا پر اِسلام ہی انسانی فطرت کے نمو وارتقاء کا ضامن ہے اور اُسے کمال کی طرف لے کر چلتا ہے۔

لیکن یہ کمال کی طرف سفر' کافی اور کٹھن مراحل سے گزر کر طے ہوتا ہے۔ جیسے خدا فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلاقِيهِ (الإنشقاق-الآية 6)

اے انسان! بے شک تو اپنے رب کی طرف جانے کی مسلسل کوشش میں ہے، اِس لیے تم اُس سے ملاقات کرنے والا ہے۔''

عربی زبان میں لغت الکدح سے مراد مسلسل، دائمی اور سخت جدوجہد ہے۔

لیکن اِس سفر میں جو چیز موجبِ سکون واطمینان ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ سفر انسان کو خدا سے ملاتا ہے اور اِس کی منزل خدا ہے۔ جیسا کہ سورۃ النجم آیت 42 میں ہے: وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ (42 النجم).

خدا کے نزدیک بلند مقامات ومراتب حاصل کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ وہ ہے دین اِسلام کے احکامات کی سختی کے ساتھ پابندی کرنا۔ کیونکہ اِسلام خدا کا پسندیدہ دین ہے۔

اِسلام صرف ایک اخلاقی دین ہی نہیں کہ جس کا کام صرف وعظ وہدایت کرنا ہے۔ بلکہ یہ ایک جامع اور کامل دین ہے۔ جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ جیسا کہ شہید مطہری فرماتے ہیں۔

یا شہید محمد باقر الصدر کے بقول اِسلام انسانیت کے لیے ایک کامل نظام ہے۔

خدائے عز وجل فرماتا ہے۔

مَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ (38-الإنعام).

ہم نے اِس کتاب میں کسی بھی چیز کو بیان کیے بغیر نہیں چھوڑا۔

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ (12-یس).

اور ہم نے ہر شے کو امام مبین میں محفوظ کر دیا ہے۔

اسلام انسان کے انفرادی، اجتماعی اور سیاسی تمام معاملات کے ساتھ ساتھ خدا کے ساتھ تعلق و ربط قائم کرنے کے کو بیان کرتا ہے۔ اِسلام ہمیں دو قسم کا دستور العمل دیتا ہے:

۱۔حقوق اللہ

۲۔حقوق مخلوق

پیش نظر کتاب معارف اِسلامی ہے۔ جو محققین اِسلام کی محنتوں کا ثمر ہے۔ اِس میں اسلام کے مختلف پہلوؤں احکام، فقہ، سیرت، عبادت، قرآن اور عقیدہ وغیرہ کے بارے میں بالاختصار بیان کیا گیا ہے۔

مرکز معارف اسلامی ایک دینی، ثقافتی اور اجتماعی ادارہ ہے۔ جو مرجع عالی قدر کے وکیل کے زیر نگرانی پاکستان میں تبلیغی سرگرمیاں انجام دے رہا ہے۔ تا کہ آپ کو صحیح محمدی اسلام سے روشناس کرایا جاسکے۔ واللہ ولی التوفیق

مرکز معارف اِسلامی

احکام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

’’کورس کا تعارف واہداف‘‘

تعارف

فقہ یا احکام اسلامی تعلیمات کا وسیع ترین موضوع ہے۔ اسلام وہ جامع ضابطہ حیات ہے جس میں زندگی کے تمام ممکنہ حالات سے متعلق راہنما اصول دیئے گئے ہیں اور کوئی ایسا موقع یا حالت نہیں ہے جس کے متعلق اسلامی احکام خاموش ہوں خصوصاً مکتب اہل البیتؑ میں کسی انسان کو کسی بھی وقت یا حالت میں پریشانی کا سامنا کرنا ہی نہیں پڑتا۔

لیکن ان تمام راہنما اصولوں کو جو انسانی زندگی کے تمام ممکنہ حالات کو احاطہ کررہے ہیں ایک عام انسان خود سے سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتا۔ بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح اسلامی تعلیمات میں بھی اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق یافتہ ہستیاں اپنی زندگی کو صرف کرتی ہیں اور اسلامی تعلیمات کو خود سے بڑی باریک بینی اور احتیاط سے سمجھ کر ہمیں بتانے کی کوشش کرتے ہیں اس کا نام اجتہاد ہے اور ہم ان کے بتائے ہوئے فرامین پر عمل کرتے ہیں اس کا نام تقلید ہے۔

اجتہاد اور تقلید دونوں امام زمان علیہ السلام کے دور غیبت میں واجب عمل ہیں۔ اسی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر نئی نسل کو احکام سے آشنا کرنے کے لیے ہم نے بھی اس موضوع کو بڑی اہمیت کے ساتھ اپنے نصاب کا حصہ بنایا ہے۔

یہاں طلبہ کو اسلامی احکام سے آشنائی، تقلید، نجاسات مطہرات، وضو، نماز، روزہ، احکام اموات وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اہداف

اس کورس کو پڑھنے کے بعد طلبہ ان شاء اللہ:

۱۔ اسلامی احکام واجب حرام، مستحب مکروہ، مباح وغیرہ اور تقلید کے مسائل کو آسانی کے ساتھ سمجھیں گے۔

۲۔ نجاسات ومطہرات کا عملاً خیال رکھیں گے۔

۳۔ وضو، غسل، تیمم، جبیرہ اور نماز کے ضروری اور بنیادی احکام کو درست طور پر سمجھیں گے اور اُن پر عمل پیرا ہوں گے۔

۴- اجتماعی عبادات جیسی نماز جمعہ، نماز عیدین نیز احکام اموات، روزہ، احکام مسجد، احکام نگاہ وغیرہ سے آشنا ہوں گے۔

۵- اسلامی آداب سے روشناس ہونگے۔

سبق1

احکام خمسہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔ انسان اپنی زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے جب انسان بچپنے سے نکل کر عاقل و بالغ ہو جاتا ہے تو جہاں اس کو پر وقار شخصیت مل جاتی ہے وہاں اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ انسان کو ایک ذمہ دار اور سمجھدار فرد کی حیثیت سے اس کی ذمہ داریاں واضح فرماتا ہے۔ اس مرحلے پر اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اس کا بندہ اپنی زندگی شریعت الٰہی کے مطابق گزارے۔ ایسے انسان جس پر اللہ تعالی اپنی شریعت کے احکام لاگو کرتا ہے اسے شرعی اصطلاح میں مُکلّف کہا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ حکم ان پانچ حالتوں سے خالی نہیں ہوتا۔

۱۔واجب ۲-حرام ۳۔مستحب ۴۔مکروہ ۵۔مباح

ان پانچ اصطلاحات کی وضاحت درج ذیل ہیں:

۱۔واجب

واجب کا لغوی معنی ہے''لازمی''اور اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کام کو انسان پر ضروری قرار دیا ہو اسے واجب کہتے ہیں۔ مثلاً نماز پڑھنا، والدین کا احترام کرنا۔

واجب کام کرنے کے فوائد

* سب سے بڑا فائدہ یہ کہ اس کی ذمہ داری ادا ہو جاتی ہے۔
* اللہ تعالیٰ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور معصومینؑ خوش ہوتے ہیں۔
* واجب کام کے کرنے سے انسان کو بہت سا ثواب ملتا ہے۔

دنیا میں دین پر عمل کرنے کی حکمتیں حاصل ہو جاتی ہیں اور آخرت میں ہلاکت سے نجات مل جاتی ہے۔

واجب کام کو ترک کرنے کے نقصانات

* واجب کو ترک کرنے والا انسان اپنی ذمہ داریوں سے غافل انسان کہلاتا ہے۔
* احکام الٰہیہ میں موجود دنیاوی حکمتوں سے اپنے آپ کو محروم کرتا ہے۔
* واجب کو ترک کرنا انسان کو اخروی ہلاکت کی جانب لے جاتا ہے۔
* واجب کے ترک کرنے سے انسان گناہ میں مبتلا ہوتا ہے اور وہ پاکیزہ زندگی کی بجائے گناہوں کی گندگی

والی زندگی گزارتا ہے۔

* اللہ تعالی اوراس کے تمام مقرب و نیک بندے بھی ناراض ہوتے ہیں جبکہ ایسا انسان شیطان اور شیطان صفت بندوں کا غلام اور دوست بن جاتا ہے۔

۲۔حرام

حرام واجب کے مقابل میں ہے یعنی انسان کا اس کام کو ترک کرنا ضروری ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہو۔مثلا: چوری کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، مومن کی غیبت کرنا۔

حرام کام کرنے کے نقصانات

*حرام کام کا ارتکاب کرنے والا انسان اپنے آپ کو اپنی ذمہ داریوں سے غافل انسان کہلواتا ہے۔

*حرام کام میں موجود نقصانات کا انسان کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔

*حرام کام کا ارتکاب کرنا انسان کو اخروی ہلاکت کی جانب لے جاتا ہے۔

*حرام کام کے ارتکاب کرنے سے انسان گناہ میں مبتلا ہوتا ہے اور وہ پاکیزہ زندگی کی بجائے گناہوں کی گندگی والی زندگی گزارتا ہے۔

* اللہ تعالیٰ اوراس کے تمام مقرب و نیک بندے بھی ناراض ہوتے ہیں جبکہ ایسا انسان شیطان اور شیطان صفت بندوں کا غلام اور دوست بن جاتا ہے۔

* اگر حرام کام کو بجالائیں تو گناہ ملے گا۔

* معاشرے میں عزت بھی نہیں رہے گی اور ذلیل وخوار ہوجائے گا۔

حرام کام کو ترک کرنے کے فوائد

*سب سے بڑا فائدہ یہ کہ اس کی ذمہ داری ادا ہوجاتی ہے۔

* اللہ تعالی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور معصومینؑ خوش ہوتے ہیں۔

*حرام کام کے ارتکاب سے اپنے آپ کو بچانے سے انسان کو بہت سا ثواب ملتا ہے۔

* دنیا میں دین پر عمل کرنے کی حکمتیں حاصل ہوجاتی ہیں اور آخرت میں ہلاکت سے نجات مل جاتی ہے۔

* اس کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے اور معاشرے میں اچھا مقام حاصل کرتا ہے۔

*حرام کو ترک کرنے سے اللہ تعالی، اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور معصومینؑ بھی خوش ہوں گے۔

۳۔ مستحب

اہل لغت اس کا معنی ''پسندیدہ کام'' کرتے ہیں اور اصطلاح میں ان سے مراد ایسا کام جسے اللہ اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پسندیدہ قرار دیا ہو۔ مثلاً: ہر وقت وضو میں رہنا سلام میں پہل کرنا، کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا اور پانی پینے کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کی پیاس کو یاد کرنا، دوسروں کی مدد کرنا۔

مستحب کام کرنے کے فوائد

* اگر سنت پر عمل کریں گے تو ثواب ملے گا اور اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی حاصل ہوگی۔
* اللہ تعالیٰ کا قرب اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور معصومینؑ کی شفاعت نصیب ہوگی۔
* مستحبات پر عمل کرنے سے واجبات پر عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے۔
* عبادت میں لطف آتا ہے۔
* زندگی میں اطمنان، سکون اور خوشحالی نصیب ہوتی ہے۔
* احکام الٰہیہ میں موجود پوشید حکمتیں حاصل ہوجاتی ہیں۔
* بلاؤں اور مختلف قسم کے آفات سے انسان محفوظ رہتا ہے۔

مستحب کام ترک کرنے کے نقصانات

اس کے ادا نہ کرنے سے انسان کو گناہ تو نہیں ملتا البتہ

* اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے محروم ہوجاتا ہے۔
* انسان ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔ درجات بھی حاصل نہیں کر پاتا۔
* مستحبات چھوڑنے سے واجبات پر بھی عمل کرنا انسان کے لیے گراں ہوتا ہے۔

۴۔ مکروہ

یہ مستحب کے مقابل میں ہے یعنی ایسا کام جو ناپسندیدہ ہو یعنی جسے اللہ تعالیٰ پسند نہ کرے۔ مثلاً صبح دیر تک سوتے رہنا، بائیں ہاتھ سے کھانا کھانا۔

مکروہ کام کے نقصانات

* اگر مکروہ کام کریں گے تو گناہ نہیں ملے گا البتہ:
* خدا کا قرب حاصل نہیں ہوگا۔

*مکروہ کام کرنے سے آدمی آہستہ آہستہ حرام کی طرف بڑھنے لگتا ہے اس لیے مکروہ کام سے اجتناب کرنا چاہیے۔

*مکروہ عمل میں موجود نقصاندہ اثرات انسان پر مرتب ہوتے ہیں۔

مکروہ کام کے ترک کرنے کے فوائد

*مکروہ کو اگر ترک کر دیں تو خوشنودی خدا حاصل ہوگی۔

*مکروہ کام کو ترک کرنے سے آدمی مستحبات اور واجبات کو ادا کرنے کی طرف بڑھتا ہے اور وہ یقینی طور پر حرام کاموں سے بچتا ہے۔

*مکروہ کام میں موجود نقصانات کے اثرات سے انسان محفوظ رہتا ہے۔

۵۔مباح

مباح کام کے کرنے سے انسان کو نہ تو ثواب حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی گناہ حاصل ہوتا ہے۔انسان کی مرضی ہے یا چاہیے تو اپنے فائدے کے لیے کرے چاہے اسے ترک کر دے اور ہاں اگر اللہ کی خوشنودی کے لیے کرے تو اس مباح کام کا ثواب بھی حاصل ہو جاتا ہے مثلا: کھانا کھانا مباح ہے لیکن نیت قربت الی اللہ کر کے کھایا جائے تو اس کا ثواب بھی ملے گا۔اسی طرح دین اور اپنی ملت کی خدمت کی نیت سے تعلیم حاصل کرے تو یہ عین عبادت ہے۔

سبق2

تقلید

لوگوں کی ہدایت کے لیے انبیاء کرامؑ تشریف لائے۔سلسلہ نبوت ختم ہوا تو سلسلہ امامت شروع ہو گیا اور لوگوں کی ہدایت کے لیے بارہ امامؑ آئے اور آخری امامؑ اس وقت پردہ غیبت میں ہیں۔امامؑ پردہ غیبت میں ہونے کے باوجود اس ذمہ داری (لوگوں کی ہدایت) کو نبھا رہے ہیں۔غیبت امامؑ کے دور میں امام زمانہ علیہ السلام کے نائبین لوگوں کو صراط مستقیم پر گامزن رکھتے ہیں۔تو سب سے پہلے لوگوں نے انبیاء کرامؑ کی پیروی کر کے ہدایت حاصل کی۔پھر آئمہ معصومین کی سیرت پر عمل کر کے ہدایت حاصل کی اور آخری امامؑ کے دور میں امامؑ کے نائبین کی تقلید کر کے ہدایت حاصل کر رہے ہیں۔

جس طرح زندگی کے معاملات چلانے کے لیے متعلقہ شعبہ زندگی کے ماہرین کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اسی طرح دین کے معاملے میں دین کے ماہر کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ دین کے ماہر کو مجتہد کہتے ہیں اس کی پیروی کرنے یعنی اس کے فتویٰ پر عمل کرنے کو تقلید اور مجتہد کے فتویٰ پر عمل کرنے والے کو مقلد کہتے ہیں۔ مکلفین (جن لوگوں پر احکام شرعیہ کی ادائیگی واجب ہے) کی تین اقسام ہیں:

۱۔ مکلف مجتہد ہوگا۔

۲۔ یا مکلف احتیاط پر عمل کرے گا۔

۳۔ یا مکلف کسی جامع الشرائط مجتہد کی تقلید کرے گا (مقلد)۔

ہر آدمی کا مجتہد ہونا، یہ بہت مشکل کام ہے۔ کیونکہ ہر آدمی پر مجتہد ہونا واجب ہو تو معاشرتی نظام خراب ہو جائے گا۔ اسی طرح احتیاط پر بھی آدمی قادر نہیں کیونکہ ہر شخص کے لیے یہ مشکل ہوتا ہے کہ کسی مسئلے کا حکم خود تلاش کریں اور پھر حکم نہ ملنے کی صورت میں اُس مسئلے میں احتیاط پر عمل کریں۔ بلکہ یہ کام کافی حد تک اعلیٰ دینی تعلیم کے بعد ہو سکتا ہے۔ اور احتیاط کے موارد کو جاننے اور پہچاننے میں جو زحمت اور تکلیف ہوتی ہے وہ اجتہاد کی مشقت اور تکلیف سے کم نہیں ہے۔

لہٰذا عوام الناس پر کسی جامع الشرائط مجتہد کی تقلید کرنا واجب ہے جس طرح امام مہدی آخر الزمان علیہ السلام نے فرمایا:

''بہر حال واقع ہونے والے امور و حوادث میں ہماری احادیث کے راوی علماء کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ ہماری طرف سے تم پر حجت ہیں اور ہم خدا کی طرف سے ان پر حجت ہیں''۔

ضروری ہے کہ دینی احکام میں کسی مجتہد کے فتوے پر عمل کیا جائے اور ضروری ہے کہ جس مجتہد کی تقلید کی جائے وہ ان شرائط کا حامل ہو:

۱۔ مرد ہو۔ ۲۔ بالغ ہو۔ ۳۔ عاقل ہو۔ ۴۔ شیعہ اثنا عشری ہو۔

۵۔ حلال زادہ ہو۔ ۶۔ زندہ ہو۔

۷۔ عادل ہو۔ (یعنی واجبات کو بجالاتا ہو اور محرمات سے اجتناب کرتا ہو)

مجتہد کے فتویٰ حاصل کرنے کے طریقے

مجتہد کے فتویٰ حاصل کرنے کے چار طریقے ہیں:

۱۔ خود مجتہد سے سننا۔

۲۔ مجتہد کا فتویٰ دو عادل اشخاص سے سننا۔

۳۔ کسی ایسے شخص سے سنا جس کی بات پر اطمینان حاصل ہوتا ہو۔

۴- مجتہد کے فتاویٰ کی کتاب (توضیح المسائل) کی طرف رجوع کرنا۔

سبق3

نجاسات

نجاسات سے مراد وہ چیزیں جو خود نجس ہوں اور (مخصوص شرائط کے تحت) پاک چیزوں کو بھی نجس کریں۔

پاک چیز کیسے نجس ہوتی ہیں؟

پاک اشیا کے نجس ہونے کے دو طریقے:

۱۔ مذکورہ بالا نجس اشیاء میں سے اگر کوئی چیز بھی گیلی ہو اور کسی بھی پاک خشک چیز سے لگ جائے تو وہ پاک چیز نجس ہو جائے گی۔

۲-اسی طرح اگر پاک چیز گیلی ہو اور نجس چیز خشک ہو تو بھی پاک چیز نجس ہو جائے گی۔

نجاسات دس ہیں

۱۔ پیشاب ۲ پاخانہ ۳۔منی ۴۔خون ۵۔ مردار ۶۔کتا ۷۔سور

۸-کافر ۹۔شراب ۱۰۔نجاست خوار حیوان کا پسینہ

۱،۲۔ پیشاب و پاخانہ

انسان اور ان تمام حرام گوشت جانوروں کا پیشاب و پاخانہ کہ جو خون جہندہ (جن کا خون اچھل کر نکلتا ہو) رکھتے ہوں نجس ہیں۔ لہٰذا ان جانوروں کا پیشاب و پاخانہ نجس نہیں ہیں جو خون جہندہ نہیں رکھتے۔ مثلاً مکھی، مچھر وغیرہ۔

۳۔ منی

انسان اور تمام خون جہندہ رکھنے والے حیوانات کی منی نجس ہے۔

۴۔ مردار

انسان اور خون جہندہ رکھنے والے تمام حیوانات کے مردہ جسم نجس ہیں۔ اگر وہ خود مر جائیں یا انہیں غیر شرعی

طریقے سے ذبح کیا جائے۔لہذا وہ جانور کہ جو خون جہندہ نہیں رکھتے اگر وہ مر جائے تو ان کا مردہ نجس نہیں ہوگا۔

۵۔خون

انسان کا اور تمام خون جہندہ رکھنے والے حیوانات کا خون نجس ہے۔

۶،۷۔کتا اور سور

یہ دونوں جانور نجس العین ہیں حتی کہ ان کے تمام اجزا نجس ہیں۔مثلاً ناخن بال وغیرہ۔

۸۔کافر

ایسا شخص کہ جو اللہ کے وجود کا انکار کرتا ہو، اللہ کی وحدانیت کا انکار کرتا ہو تو اسے کافر کہا جاتا ہے اور یہ نجس ہے۔اسی طرح اللہ کا کوئی شریک بنائے تو وہ مشرک ہے اور وہ بھی نجس ہے۔

۹۔شراب

شراب اور ہر وہ چیز جو انسان کو مست کر دیتی ہو اور مائع ہو تو وہ نجس ہے اور اس کا پینا حرام ہے۔

۱۰۔نجاست خور حیوان کا پسینہ

ایسا جانور کہ جو نجس چیزیں کھاتا ہو مثلا بعض جانوروں کو پاخانہ کھانے کی عادت ہوتی ہے۔تو ان جیسے جانوروں کا پسینہ نجس ہے اور اگر یہ پسینہ کسی انسان کو لگ جائے تو وہ بھی نجس ہو جائے گا۔

سبق4

مطہرات (1)

بارہ چیزیں ایسی ہیں جو خود پاک ہیں اور نجاست کو پاک کرتی ہیں۔انہیں مطہرات کہا جاتا ہے۔

ا۔پانی

پانی چار شرطوں کے ساتھ نجس چیز کو پاک کرتا ہے:

ا۔پانی مطلق ہو یعنی اس میں کوئی چیز ملی ہوئی نہ ہو۔

۲۔پانی پاک ہو۔

۳۔نجس چیز کو دھونے کے دوران پانی مضاف نہ بن جائے اور اس پانی کا رنگ، بو یا ذائقہ تبدیل نہ ہو جائے۔

۴۔نجس چیز کو پانی سے دھونے کے بعد اس میں عین نجاست کے ذرات باقی نہ رہیں۔

نجس برتن کو پاک کیسے کیا جاتا ہے؟

اس کے لیے دو طریقے ہیں:

ا۔برتن کو تین دفعہ بھرا جائے اور ہر دفعہ خالی کر دیا جائے۔

۲۔برتن میں تین دفعہ مناسب مقدار میں پانی ڈالیں اور ہر دفعہ پانی کو یوں گھمائے کہ پانی تمام نجس مقامات تک پہنچ جائے اور پھر اسے گرا دیں۔

نجس کپڑے کو پاک کیسے کیا جاتا ہے؟

کپڑا نجس ہو جائے تو اس کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کپڑے کو اس طرح دھویا جائے کہ اس سے عین نجاست زائل ہو جائے پھر اس کپڑے پر پانی کو اس طرح ڈالا جائے کہ کپڑے کے تمام اطراف تک پہنچ جائے اس کے بعد اس کپڑے کو نچوڑا جائے پھر دوسری بار پانی ڈالا جائے اور پھر نچوڑا جائے تو اس طرح کپڑا پاک ہوگا۔

نجس چیز یا بدن کو پاک کیسے کیا جاتا ہے؟

عین نجاست کو زائل کر دیا جائے اس بدن یا چیز پر پانی کو اس طرح ڈالا جائے کہ اس نجس بدن یا چیز سے پانی بہہ جائے۔

۲۔زمین

زمین پاؤں کے تلوے اور جوتے کے نچلے حصے کو چار شرطوں سے پاک کرتی ہے۔

ا۔زمین پاک ہو۔

۲۔زمین خشک ہو۔

۳۔پاؤں یا جوتے کی نجاست زمین سے لگی ہو۔

۴۔نجاست زمین پر چلنے یا رگڑنے سے دور ہو جائے۔

۳۔سورج

سورج زمین، عمارت، اور دیواروں کو درج ذیل شرائط کے ساتھ پاک کرتا ہے:

ا۔نجس چیز تر ہو۔

۲۔عین نجاست زائل ہو جائے۔

۳۔نجس چیز پر دھوپ پڑنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہ ہو۔

۴۔فقط سورج ہی نجس چیز کو خشک کرے۔

سبق5

مطہرات(2)

۴۔استحالہ

استحالہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نجس چیز کی جنس تبدیل ہو کر کسی پاک چیز کی شکل اختیار کرے تو وہ نجس چیز پاک ہو جاتی ہے۔مثلاً: کتے کا نمک کی کان میں گر کر نمک میں تبدیل ہو جانا۔

۵۔انتقال

اگر انسان یا خونِ جہندہ (یعنی اچھلنے والا خون رکھنے والے حیوان کا خون) رکھنے والے حیوان کا خون کوئی ایسا حیوان چوس لے جو عرفاً خون نہیں رکھتا۔تو وہ پاک ہو جاتا ہے اور اسے انتقال کہا جاتا ہے۔مثلا: مچھر انسان کے بدن سے خون چوسے تو وہ خون (جو مچھر کے بدن سے بعد میں نکلے) پاک ہو جاتا ہے۔

۶۔اسلام

اگر کوئی کافر شہادتین (کلمہ طیبہ) پڑھ لے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے اور وہ پاک ہو جاتا ہے۔

۷۔تبعیت

نجس چیز کسی دوسری چیز کے پاک ہونے کے ساتھ پاک ہو جائے۔اگر کوئی نجس چیز دھو رہے ہوں تو جب وہ پاک ہو جائے تو ہاتھ خود بخود پاک ہو جائیں گے۔

۸۔عین نجاست کا دور ہونا

اگر کسی جانور کا جسم کسی نجس مٹی یا کسی نجس چیز سے آلودہ ہو جائے تو جب وہ نجاست زائل ہو جائے گی تو جانور کا بدن پاک ہو جائے گا۔

۹-نجاست خور حیوان کا استبراء

اگر کسی جانور کو انسانی نجاست کھانے کی عادت پڑ جائے۔تو اس کو مخصوص مدت کے لیے اس عمل سے دور رکھا جائے۔مثلا: گائے کو 20 دن بھیڑ کو دس 10 دن اور پالتو مرغی کو تین دن تک انسانی نجاست نہ کھانے دی جائے

اوراس کو پاک غذا کھلائی جائے۔تواس کا پسینہ پاک ہے۔

۱۰۔مسلمان کا غائب ہوجانا

اگر مسلمان کا جسم یا اس کے کپڑے یا برتن وغیرہ نجس ہوجائیں پھر وہ شخص وہاں سے غائب ہوجائے اور ایک عرصہ بعد واپس لوٹے تو اس کی نجس چیزوں کو پاک شمار کیا جائے گا۔

۱۱۔انقلاب

یہ شراب کو پاک کرتا ہے جب شراب خود بخود یا کسی طریقے سے تبدیل ہوکر سرکہ بن جائے تو پاک ہوجاتا ہے اسی طرح شیرہ انگور بھی سرکہ میں تبدیل ہوجائے تو وہ بھی پاک ہوجاتا ہے۔

۱۲۔ذبیحہ کے خون کا متعارف مقدار میں بہہ جانا

کسی جانور کو شرعی طریقے سے ذبح کرنے کے بعد اس کے بدن سے معمول کے مطابق خون نکل جائے تو جو خون اس کے بدن میں باقی رہ جائے وہ پاک ہے۔

سبق 6

وضو

وہ چیزیں جن کے لیے وضو کرنا ضروری ہے

چھ چیزوں کے لیے وضو کرنا واجب ہے۔

۱۔واجب نمازوں کے لیے وضو کرنا واجب ہے۔

۲۔بھولے ہوئے سجدے اور تشہد کو انجام دینے کے لیے۔

۳۔خانہ کعبہ کے واجب طواف کے لیے۔

۴۔جب کسی نے منت مانی ہو کہ مثلاً قرآن مجید کا بوسہ لوں گا۔

۵۔وضو کرنے کی نذر کی ہو۔

۶۔نجس شدہ قرآن مجید (خدانخواستہ) کو پاک کرنے کے لیے۔

طریقہ وضو

وضو کی نیت کے ساتھ دونوں ہاتھوں کو کلائی تک دھوئیں پھر تین مرتبہ کلی کرلیں پھر تین مرتبہ ناک میں پانی ڈال دیں پھر چہرے کو دھوئیں، چہرے کو اس طرح دھوئیں کہ بالوں کے اگنے کی جگہ سے لے کر ٹھوڑی تک لمبائی میں اور چوڑائی میں چہرے کا وہ حصہ دھوئیں جس کو درمیانی انگلی اور انگوٹھا گھیر لے۔ اس کے بعد ہاتھوں کا کہنیوں سے لے کر انگلیوں کے سروں تک دھوئیں پھر سر کے اگلے حصے اور دونوں پاؤں کے اوپر والے حصوں پر مسح کریں۔

وضو کے واجبات

۱۔ چہرہ کا دھونا۔ ۲۔ دونوں ہاتھوں کا کہنیوں تک دھونا۔ ۳۔ سر کے اگلے حصے کا مسح کرنا۔

۴۔ دونوں پاؤں کے اوپر والے حصے کا مسح کرنا۔

وضو کے مستحبات

۱۔ وضو سے پہلے دونوں ہاتھوں کو کلائیوں تک دھونا۔

۲۔ تین مرتبہ کلی کرنا۔

۳۔ تین مرتبہ ناک میں پانی ڈالنا۔

۴۔ مسواک کرنا اگرچہ انگلی سے ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ وضو کے تمام افعال کو بجالاتے وقت وضو کی دعائیں پڑھنا۔

۶۔ شروع میں بسم اللہ پڑھنا۔

۷۔ وضو کرتے وقت قبلہ رخ ہونا۔

۸۔ ہر عضو پر پانی ڈالنے کے لیے چلو داہنے ہاتھ کا دھونا۔

۹۔ مرد کے لیے مستحب ہے کہ ہاتھ دھوتے وقت پہلی مرتبہ کہنی کی پشت سے ابتدا کرے اور دوسری مرتبہ کہنی کے اندر کی طرف پر پانی ڈالے جبکہ عورت کے لیے اس کے برعکس انجام دینا مستحب ہے۔

۱۰۔ وضو کرنے کی حالت میں سورہ انا انزلناہ پڑھنا (دعاؤں کے علاوہ)۔

۱۱۔ وضو کے بعد آیت الکرسی پڑھنا۔

مبطلات وضو

وہ چیزیں جن کی وجہ سے وضو باطل ہوجاتا ہے درج ذیل ہیں:

۱۔ پیشاب ۲۔ پاخانہ۔ ۳۔ ہوا کا خارج ہونا۔ ۴۔ بے ہوشی۔

۵-حدث اکبر یعنی منی وغیرہ خارج ہونا۔

۶۔ایسی نیند جو کانوں اور آنکھوں پر غالب آجائے یعنی جس کے سبب نہ سن سکے نہ دیکھ سکے۔

سبق 7

وضو کی شرائط

وضو کو صحیح کرنے کے لیے درج ذیل شرائط ہیں۔

۱۔وضو کا پانی مطلق ہو (مضاف نہ ہو)

۲۔وضو کا پانی پاک ہو (نجس نہ ہو)

۳۔وضو کا پانی مباح ہو، یعنی غصبی نہ ہو۔ (البتہ ندی نالوں سے وضو کرنے کے لیے مالک کی اجازت ضروری نہیں ہے)۔

۴۔وضو سے پہلے اعضاءِ وضو کا پاک ہونا شرط ہے۔

۵۔وضو کرنے اور نماز پڑھنے کے لیے وقت کافی ہو یعنی کوئی شخص آخری وقت میں نماز پڑھنا چاہتا ہو اور وضو کرنے سے نماز قضا ہو جانے کا خوف ہو۔

۶۔قصد قربت یعنی وضو رضاءِ الٰہی کے لیے کرے۔

۷۔وضو اس ترتیب سے کیا جائے جس کو بیان کیا گیا ہے۔

۸۔موالات یعنی وضو کے افعال کو پے در پے بجالانا۔

۹۔وضو کرنے میں کسی اور سے مدد نہ لی جائے۔

۱۰۔اعضاءِ وضو پر کوئی ایسی چیز نہ ہو جو اعضاء تک پانی پہنچنے میں مانع بنے۔ مثلاً: کلر ٹیپ وغیرہ۔

۱۱۔وضو کرنے والے کے لیے پانی کے استعمال میں کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو مثلاً ایسی مرض نہ ہو جس سے پانی کا استعمال مضر ہو۔

سبق8

واجب غسل

واجب غسل سات ہیں:

۱۔غسل جنابت ۲۔غسل میت ۳۔غسل مس میت ۴۔غسل نذر وعہد ۵۔غسل حیض ۔غسل استحاضہ ۷۔غسل نفاس

غسل جنابت: انسان کے لیے منی نکلنے یا ہمبستری کرنے کے بعد کی حالت جنابت کہلاتی ہے۔غسل جنابت کسی واجب (مثلاً نماز) یا کسی اور وجہ (مثلاً قرآن کو مس کرنا) کے لیے واجب ہوتا ہے۔

جنابت کے احکام

وہ شخص (مجنب) جو حالت جنابت میں ہو اس کے لیے پانچ چیزیں حرام ہیں۔

۱۔اپنے بدن کا کوئی حصہ قرآن مجید کے الفاظ یا اللہ تعالٰی کے نام سے خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہو مس کرنا۔

۲۔مسجد الحرام اور مسجد نبوی میں داخل ہونا۔

۳۔ان دو مسجدوں کے علاوہ دوسری مسجدوں میں ٹھہرنا۔

۴۔کسی مسجد میں کوئی چیز رکھنے یا اٹھانے کے لیے جانا

۵۔واجب سجدہ والی آیات کا پڑھنا۔وہ آیات ان سوروں میں ہیں:

1 پارہ ۲۱،سورۃ السجدۃ آیت ۱۵۔2 پارہ ۲۴ سورۃ حم السجدہ آیت ۳۷۔3 پارہ ۲۷ سورۃ النجم آخری آیت۔4 پارہ ۳۰ سورۃ العلق آخری آیت۔

غسل میت: انسان کے مرنے کے بعد اس کو دفن کرنے سے پہلے غسل دینا واجب ہے۔

غسل مس میت: انسان کے مرنے کے بعد جب میت ٹھنڈی ہو جائے اور اسے غسل میت کے ذریعے پاک کرنے سے پہلے اگر کوئی میت کو چھوئے تو اس پر غسل مس میت واجب ہو جاتا ہے۔

غسل نذر وعہد: جب انسان منت مانے یا نذر وعہد باندھے کہ "میرا فلاں کام ہو جائے تو میں غسل کروں گا تو کام ہونے کے بعد اس پر نذر وعہد کا غسل واجب ہو جاتا ہے۔

نوٹ: غسل کی کچھ اقسام مرد اور عورت دونوں کے درمیان مشترک ہیں۔جبکہ غسل حیض،استحاضہ اور نفاس یہ عورت کے ساتھ مختص ہیں۔

سبق9

طریقہ غسل

سب سے پہلے جسم کونجاست سے پاک کیا جائے اور پھر میل کچیل دور کی جائے اس کے بعد غسل دو طریقوں سے انجام دیا جا سکتا ہے۔

۱۔ترتیبی ۲۔ارتماسی

ترتیبی:

غسل کی نیت کر کے پہلے سر اور گردن کا دھونا پھر جسم کے دائیں طرف کندھے سے پاؤں تک اور پھر اسی طرح جسم کے بائیں طرف کو دھونا۔

ارتماسی:

غسل کی نیت کر کے تالاب یا نہر وغیرہ میں اس طرح غوطہ لگانا کہ پورا جسم پانی میں ڈوب جائے اور پاؤں کو اٹھا کر سارے جسم کو حرکت دے۔

تیمم

طریقہ:

نیت کے بعد دونوں ہاتھوں کو مٹی پر مارے پھر ہاتھوں کو جھاڑے اس کے بعد دونوں ہتھیلیوں کو عرض (چوڑائی) میں اکھٹا کر کے پیشانی سے اوپر بال اُگنے کی جگہ سے تمام پیشانی پر رکھے اور ناک کے بلند سرے سے نیچے کی طرف اس طرح کھینچے کہ تمام پیشانی دونوں طرف سے اور دونوں آبروئیں نیچے آجائیں۔ان کا پوری طرح مسح ہو جائے، پھر بائیں ہتھیلی دائیں ہاتھ کی پشت پر ہاتھ کے جوڑ سے لے کر انگلیوں کے سروں تک کھینچے اور پھر اسی طرح دائیں ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پشت پر کھینچے۔

تیمم کے کچھ ضروری احکام

۱۔اس طرح نیت کرے کہ وضو یا غسل کے بدلے تیمم کرتا ہوں قربۃ الی اللہ۔

۲۔انگوٹھی وغیرہ ہاتھ پر نہ ہو۔

۳۔اعضاء تیمم پر کوئی چیز چپکی ہوئی نہ ہو۔

۴۔تیمم کرتے وقت اعضاء کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ ہو۔

۵۔سر کے بال پیشانی پر آئے ہوئے ہوں تو انہیں پیچھے ہٹانا ضروری ہے۔

۶۔اگر کسی شخص کو پانی ہی نہ ملے یا پانی کا استعمال کسی وجہ سے مضر ہو یا نماز کے لیے صرف تیمم کرنے کا وقت ہی بچ گیا ہو تو اس کے لیے وضو یا غسل کے بدلے تیمم کرنا ضروری ہے۔

۷۔تیمم کرنے کے لیے مٹی، ریت، ڈھیلے، جپسم، چونے کا پتھر ان چیزوں کا پاک اور مباح (یعنی غصبی نہ ہونا) ضروری ہے۔

جبیرہ

اگر چہرہ یا ہاتھوں پر ایسا زخم ہو جس کے اردگرد کو دھویا جاسکے اور زخم پر کپڑا یا پٹی رکھ کر مسح کیا جاسکے۔تو ایسے عمل کو جبیرہ کہتے ہیں۔اس صورت میں وضو کافی ہے تیمم کی ضرورت نہیں ہے۔

وضو جبیرہ کا طریقہ

۱۔اگر پٹی اتار سکتے ہو تو پٹی اتار کر عام طریقے سے وضو کریں۔

۲-اگر پٹی نہیں اتار سکتے ہو اور پٹی کے اوپر سے پانی ڈال سکتے ہیں۔تو پٹی کے اوپر عام طریقے سے وضو کریں۔

۳۔پٹی بھی نہیں اتار سکتے اور پانی بھی مضر ہو تو پٹی کے آس پاس کی جگہ دھوئیں اور پٹی کے اوپر گیلا ہاتھ پھیریں۔

۴۔پٹی اتار سکتے ہو،مگر زخم کے لیے پانی مضر ہو تو آس پاس کی جگہ دھوئیں اور زخم پر گیلا ہاتھ پھیریں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو زخم پر کوئی پاک کپڑا ڈال کر اس کپڑے پر گیلا ہاتھ پھیریں اور اگر براہ راست زخم پر کوئی پاک کپڑا ڈال کر اس کپڑے پر گیلا ہاتھ پھیریں۔مذکورہ چار صورتیں ممکن نہ ہوں اور پٹی نجس بھی ہو۔تو وضو کے بدلے تیمم کریں۔

سبق10

واجب نمازیں

واجب نمازیں چھ قسم کی ہیں۔

1۔نماز پنجگانہ 2۔نماز آیات 3۔نماز طواف 4۔ بڑے بیٹے پر باپ کی قضاء نمازیں 5۔نماز میت 6۔نماز منت یا نذر

نماز پنجگانہ کی کل واجب رکعات

۱۔نماز صبح ۲ رکعت ۲۔نماز ظہر ۴ رکعت ۳۔نماز عصر ۴ رکعت

۴۔نماز مغرب ۳ رکعت

۵۔نماز عشاء ۴ رکعت

نوٹ:۔ یومیہ مستحب نماز ۳۴ رکعات ہیں اور ۱۱ رکعات نماز شب کی ہیں تو یہ کل ۵۱ رکعت ہیں یومیہ نماز ۵۱ رکعت پڑھنا مومن کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔

ارکان نماز

رکن نماز کا مطلب ہے کہ نمازی سے جان بوجھ کر یا غلطی سے کمی یا زیادتی ہوجائے تو نماز باطل ہوجاتی ہے۔ ارکان نماز مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔نیت ۲۔تکبیرۃ الاحرام ۳۔ قیام متصل بہ رکوع (رکوع سے پہلے کا قیام، قیام متصل بہ رکوع کہا جاتا ہے)

۴۔رکوع ۵۔دونوں سجدے

غیر رکنی واجبات

غیر رکن کا مطلب یہ ہے کہ نمازی جان بوجھ کر کمی یا زیادتی کردے تو نماز باطل ہوجاتی ہے۔لیکن اگر غلطی سے ان میں کمی بیشی ہوجائے تو نماز باطل نہیں ہوتی البتہ سجدہ سہو یا نماز احتیاط کے ذریعے اس غلطی کو صحیح کرلیا جاتا ہے۔ غیر رکنی مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔قرائت ۲۔ذکر ۳۔تشہد ۴۔سلام ۵۔ ترتیب ۶۔موالات

سبق 11

واجبات نماز

واجبات نماز گیارہ ہیں، جن میں سے بعض رکن ہیں اور بعض غیر رکن ہیں۔

۱۔ نیت

نیت سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور خوشنودی کی خاطر نماز کا ارادہ کر لے۔ نیت زبان پر جاری کرنا ضروری نہیں ہے صرف ارادہ ہو تو کافی ہے۔

۲۔ تکبیرۃ الاحرام

ضروری ہے کہ نیت کے بعد قیام کی حالت میں بلند آواز میں تکبیرۃ الاحرام کہی جائے اسے تکبیرۃ الاحرام کہا جاتا ہے۔ اس تکبیر کے بعد وہ تمام چیزیں ترک کرنا ضروری ہیں جو نماز کے باطل ہونے کا سبب بنیں۔ تکبیر کہتے وقت جسم بالکل ساکن ہو یعنی حرکت میں نہ ہو۔

۳۔ قیام یعنی کھڑا ہونا

تکبیرۃ الاحرام کہنے کے موقع پر اور رکوع سے پہلے والا قیام (قیام متصل بہ رکوع) رکن ہے، لیکن الحمد اور سورہ پڑھتے وقت کا قیام اور رکوع کے بعد والا قیام رکن نہیں ہے۔

۴۔ قرائت

قرائت سے مراد پہلی اور دوسری رکعت میں سورہ حمد اور ایک سورہ کا پڑھنا ہے۔

مردوں کے لیے واجب ہے کہ نماز فجر، مغرب اور عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں حمد اور دوسرا سورہ اتنی بلند آواز سے پڑھے کہ ساتھ کھڑے شخص کو سنائی دے، صرف سنائی دینا کافی ہے، سمجھ میں آنا ضروری نہیں ہے۔

ظہر اور عصر کی نماز میں حمد و سورہ مرد اور عورت دونوں پر اخفات یعنی آہستہ پڑھنا واجب ہے۔

۵۔ رکوع

ضروری ہے کہ ہر رکعت میں سورہ پڑھنے کے بعد اس قدر جھکے کہ اپنی انگلیوں کے سرے گھٹنے پر رکھ سکے۔

۶۔ دونوں سجدے

ہر رکعت میں رکوع کے بعد دو سجدے کرے۔ سجدہ یہ ہے کہ خاص شکل میں پیشانی کو خضوع کی نیت سے

زمین پر رکھے، نماز کے سجدے کی حالت میں واجب ہے کہ پیشانی دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں کے انگھوٹھے زمین پر رکھے جائیں۔

۷۔تشہد

تمام واجب اور مستحب نمازوں کی دوسری رکعت میں نماز مغرب کی تیسری رکعت اور ظہر وعصر اور عشاء کی چوتھی رکعت میں انسان کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے سجدے کے بعد اور بدن کے سکون کی حالت میں تشہد پڑھے۔ پس دوسری یا آخری رکعت کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر شہادتین کا پڑھنا تشہد کہلاتا ہے۔

۸۔نماز کا سلام

نماز کی آخری رکعت کے تشہد کے بعد جب نمازی بیٹھا ہو اور اس کا بدن سکون کی حالت میں تو سلام پڑھے۔

۹۔ذکر

رکوع اور دونوں سجدوں میں ذکر پڑھنا ضروری ہے۔

۱۰۔ترتیب

ضروری ہے کہ نماز کے تمام اعمال ترتیب سے انجام دئے جائیں۔

۱۱۔موالات

ضروری ہے کہ نماز کے تمام اعمال پے در پے اور بغیر کسی وقفے کے مسلسل انجام دیے جائیں۔

سبق 12

مکروہات نماز

نماز پڑھتے ہوئے مندرجہ ذیل چیزیں مکروہ ہیں:۔

۱۔آنکھوں کا بند کرنا۔ ۲۔ہاتھوں اور انگلیوں سے کھیلنا۔ ۳۔حمد سورہ و یا ذکر پڑھتے وقت رک کر کسی کی بات کو سننا۔

۴۔ایسا کام کرنا جس سے خشوع اور خضوع ختم ہوتا ہو۔ ۵- چہرے کا قبلہ کی طرف سے تھوڑی مقدار میں موڑنا نہ کہ پورا، وگرنہ نماز باطل ہو جائے گی۔

۶۔پیشاب یا پاخانہ کو روک کر نماز پڑھنا۔

وہ مقامات جہاں نماز پڑھنا مکروہ ہے

چند مقامات پر نماز پڑھنا مکروہ ہے جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

۱۔حمام ۲ شورزدہ زمین ۳ کسی انسان کے مقابل

۴۔اس دروازے کے مقابل جو کھلا ہو۔

۵۔سڑک اور گلی کوچے میں۔ ٦۔آگ اور چراغ کے مقابل۔ ۷۔ باورچی خانے میں اور ہر اس جگہ جہاں آتش دان ہو۔

۸۔جاندار کے فوٹو یا مجسمے کے سامنے۔ ۹-ایسے کمرے میں جس میں جنب شخص موجود ہو۔

۱۰۔قبر کے مقابل۔

۱۱۔قبر کے اوپر۔ ۱۲۔دو قبروں کے درمیان۔ ۱۳۔ایسے کنوئیں اور گھڑے کے مقابل جس میں پیشاب کیا جاتا ہو۔ ۱۴۔قبرستان میں

سبق13

روزہ

اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر صبح صادق سے لے کر مغرب ہونے تک کھانے پینے اور دیگر مبطلات روزہ سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا روزہ کہلاتا ہے۔

مبطلات روزہ

۱۔کھانا اور پینا:

روزہ کی حالت میں کوئی چیز جان بوجھ کر کھانے اور پینے سے روزہ باطل ہوجاتا ہے۔

۲۔جماع:

جماع سے مراد بیوی کے ساتھ ہمبستری کرنا ہے۔روزے میں جماع کرنے سے روزہ باطل ہوجاتا ہے اور حرام ہے کفارہ بھی واجب ہوجاتا ہے۔

۳۔استمناء:

یعنی انسان کا جماع کے علاوہ کسی اور فعل کے ذریعے منی خارج کرنے سے روزہ باطل ہوجاتا ہے لیکن دن کو روزہ دار سوجائے اور احتلام ہوتو روزہ باطل نہیں ہوتا۔

۴۔اللہ تعالی،رسول اکرمؐ اور معصومینؑ پر بہتان باندھنا

اگرروزہ دارزبان سے یا لکھ کر یا اشارے سے یا کسی اور طریقے سے اللہ تعالیٰ یا پاک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپؐ کے برحق جانشینوں میں سے کسی سے جان بوجھ کرکوئی جھوٹی بات منسوب کرے تو اس کا روزہ باطل ہوجاتا ہے۔ جھوٹی بات منسوب کرنے سے مراد یہ ہے کہ اگرروزہ دارکو معلوم نہ ہوتو حوالہ کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے جیسے روایت بیان کرتے وقت راوی کا نام یا کتاب کا نام لے کر بیان کرے۔

۵-غبار کو حلق تک پہنچانا:

کثیف غبار حلق تک پہنچنے سے روزہ باطل ہوجاتا ہے چاہے کھانے کی چیز حلال ہو جیسے آٹا یا کوئی ایسی چیز ہو کہ جس کا کھانا حرام ہے جیسے مٹی۔

۶-اذان صبح تک جنابت کی حالت میں رہنا:

اگرروزہ دار جان بوجھ کر ماہ رمضان المبارک میں صبح صادق تک غسل نہ کرے تو اس کا روزہ باطل ہے اور کفارہ بھی واجب ہے۔

۷۔قے کرنا:

جان بوجھ کرقے کرنے سے روزہ باطل ہوجاتا ہے۔

۸۔حقنہ لینا

سیال چیز سے حقنہ (انیما) اگر چہ یہ امر مجبوری اور علاج کی غرض سے لیا جائے تو روزہ باطل ہوجاتا ہے۔

مکروہات روزہ

روزے دار کے لیے کچھ چیزیں مکروہ ہیں اور ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔آنکھ میں دواڈالنا اور سرمہ لگانا جبکہ اس کا مزہ یا بو حلق میں پہنچے۔

۲۔ہر ایسا کام کرنا جو کمزوری کا باعث ہو مثلاً خون دینا اور حمام جانا۔

۳۔ناک میں دواڈالنا جب کہ یہ علم نہ ہو کہ حلق تک پہنچے گی اور اگر یہ علم ہو کہ حلق تک پہنچے گی تو اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔

۴۔خوشبودار پودوں کا سونگھنا۔

۵۔عورت کا پانی میں بیٹھنا۔

۶۔شیاف استعمال کرنا یعنی کسی خشک چیز سے انیما کرنا۔

۷۔جو لباس پہن رکھا ہوا سے تر کرنا۔

۸۔دانت نکلوانا اور ہر وہ کام کرنا جس کی وجہ سے منہ سے خون نکلے۔

۹۔تر لکڑی سے مسواک کرنا۔

۱۰۔بلاوجہ پانی یا کوئی اور سیال چیز منہ میں ڈالنا۔

سبق14

احکام میت

احتضار

مسلمان پر محتضر (یعنی جان کنی کی حالت میں موجود شخص) کو سیدھا لٹانا واجب ہے۔اس طرح کہ اس کے پاؤں قبلہ کی طرف ہوں تا کہ اس کا منہ قبلہ کی طرف ہو اور مستحب ہے کہ محتضر کو شہادتیں اور بارہ اماموں کی تلقین کرائی جائے۔اور جو دعائیں منقول ہیں ان کی بھی تلقین کرائی جائے۔

مکروہات

۱۔محتضر کو اکیلا چھوڑنا۔ ۲۔کوئی وزنی چیز اس کے پیٹ پر رکھنا۔ ۳۔جنب اور حائض کا اس کے پاس ٹھہرنا۔

۴۔اس کے پاس زیادہ بولنا۔ ۵۔اس کے پاس گریہ کرنا (حالت احتضار میں)

۶۔محتضر کے پاس عورت کا تنہا ہونا۔

احکام غسل وکفن ونماز ودفن

ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اگر کوئی مسلمان مرجائے تو اس کو غسل وکفن دے اور نماز پڑھ کر دفن کرے میت کے غسل وکفن، نماز اور دفن کے لیے اس کے ولی کی (سرپرست) اجازت لینا واجب ہے۔

غسل میت کا طریقہ

ابتداء میں میت کے بدن سے نجاست کو دور کرنا چاہیے کیونکہ غسل دینے سے پہلے میت کے پورے بدن کو پاک کرنا مستحب ہے۔میت کو تین غسل دینے واجب ہیں۔

ا۔ بیری کے پتوں والے پانی کے ساتھ۔

۲۔کافوروالے پانی کے ساتھ۔

۳۔خالص پانی کے ساتھ۔

غسل میت کا آغاز سب سے پہلے سراور گردن دھونے سے ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد میت کے دائیں اور بائیں جانب کا دھونا واجب ہے۔میت کو تین غسل ترتیب وار دینا واجب ہیں اور واجب ہے کہ غسل دینے والا اس طرح نیت کرے کہ اس میت کو غسل دیتا ہو آب سدر (بیری) یا کافور ملے ہوئے پانی یا خالص پانی سے قربتہ الی اللہ۔اس کے بعد سر اور گردن کو اس طرح دھوئے کہ پانی بالوں کی جڑ تک پہنچ جائے۔ پھر ذرا کروٹ بدل کر میت کی دائیں جانب گردن سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک دھوئے۔اور اسی طرح بائیں جانب کو دھوئے۔اور دائیں بائیں دونوں سمتوں سے غسل دیتے وقت عورتیں (شرمگاہ) کو مکمل دھوئے۔

نوٹ: پانی میں بیری کے پتے نہ ہی بہت زیادہ ہوں اور نہ ہی بہت کم ہوں اگر بیری کے پتے یا کافور کا پانی میسر نہ ہوتو پھر خالص پانی سے ان کی جگہ غسل دیا جائے۔

کفن

واجب کفن

ا۔لنگ (کپڑا)۔جو میت کو ناف سے زانو تک چھپائے بہتر ہے کہ سینے سے پاؤں تک چھپائے۔

۲-کفنی (قمیص)-کندھے سے لے کر نصف پنڈلی تک ہو۔

۳۔ بڑی چادر: جو تمام بدن کو ڈھانپ لے۔اس کی لمبائی میت کی لمبائی سے زیادہ ہو اور چوڑائی اتنی ہو کہ ایک سرے کو دوسرے سرے پر رکھا جاسکے۔

نوٹ: میت کو کفن کے ساتھ ساتھ حنوط کرنا واجب ہے یعنی میت کے اعضاء سجدہ پر کافور کا ملنا۔

مستحبات کفن

ا۔واجب چادر کے علاوہ ایک پوری چادر باندھنا۔

۲۔مرد کے سر پر عمامہ باندھنا اور عورت کے سر پر مقنعہ باندھنا۔

۳۔عورت کے سینے پر کپڑا باندھنا۔

۴۔کفن کا پاک ہونا۔

۵۔کفن کا سفید ہونا۔

۶۔کفن کے ہر حصے پر کافور چھڑکنا۔

سبق15

نمازمیت کا طریقہ

میت کی نماز میں پانچ تکبیریں ہیں اور نماز پڑھنے والا شخص مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ پانچ تکبیریں کہے نیت کرلے اور پہلی تکبیر کہنے کے بعد یہ دعا پڑھے۔

اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له و اشهد ان محمدا عبده ورسوله ارسله بالحق بشيرا ونذيرا بين يدى الساعة

اور دوسری تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھے۔

اللهم صل على محمد و آل محمد و بارك على محمد و آل محمد و ارحم محمدا و آل محمد كافضل ما صليت و باركت و ترحمت على ابراهيم وآل ابراهيم انك حميد مجيد و صل على جميع الانبياء والمرسلين والشهداء والصديقين و جميع عباد الله الصالحين

اور تیسری تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھے۔

اللهم اغفر للمؤمنين والمؤمنات والمسلمين والمسلمات الاحياء منهم والاموات تابع بيننا و بينهم بالخيرات انك مجيب الدعوات انك على كل شئى قدير۔

اور اگر میت مرد کی ہے تو چوتھی تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھے۔

اللهم ان هذا عبدك و ابن عبدك و ابن امتك نزل بك و انت خير منزول به اللهم انا لا نعلم منه الا خيراً و انت اعلم به منا اللهم ان كان محسنا فزد فى احسانه وان كان مسيئا فتجاوز عنه واغفر له اللهم اجعله عندك فى اعلى عليين واخلف على اهله فى الغابرين وارحمه برحمتك يا ارحم الرحمين

اور اگر میت عورت کی ہو۔تو چوتھی تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھے۔

اللهم ان هذه امتك وابنة عبدك وابنة امتك نزلت بك وانت خيز منزول به

اللھم انا لا نعلم منھا الاخیراً وانت اعلم بھا منا اللھم ان کانت محسناً فزدفی احسانھا وان کانت مسیئۃ فتجاوز عنھا واغفر لھا اللھم اجعلھا عندك فی اعلی علیین واخلو علی اھلھا فی الغابرین وارحمھا برحمتك یاارحم الرحمین۔

اوراس کے بعد پانچویں تکبیر پڑھے۔

دفن میت

میت کواس طرح زمین میں دفن کرنا واجب ہے کہ اس کی بو باہر نہ آئے اور نہ ہی درندے اس کو باہر نکال سکیں اور اگر اس بات کا خوف ہوتو اس کی قبر کو اینٹوں وغیرہ سے پختہ کیا جائے۔میت کو قبر میں دائیں پہلو اس طرح لٹایا جائے کہ اس کے بدن کے سامنے کا حصہ رو بہ قبلہ ہو۔

سبق16

نماز جمعہ نماز آیات نماز عیدین

نماز جمعہ

جمعہ کی نماز صبح کی طرح دو رکعت کی ہے نماز فجر اور نماز جمعہ میں فرق یہ ہے کہ نماز جمعہ میں پہلے دو خطبے ہوتے ہیں اور امام زمانہ علیہ السلام کی غیبت میں جمعہ کی نماز واجب تخییری ہے آپ چاہے جمعہ کے دن نماز ظہر بجالائیں یا چاہے تو نماز جمعہ بجالائیں۔لیکن جمعہ کے دن نماز جمعہ کا بجالانا زیادہ ثواب کا حامل ہے اور نماز جمعہ واجب تب ہوتی ہے کہ جب زوال کا ٹائم ہوجائے اور اس کا وقت اول زوال عرفی ہے۔اور اگر اس سے تاخیر ہوجائے تو نماز ظہر کو بجالانا بہتر ہے۔

نماز جمعہ کے احکام

۱۔جب امام خطبہ دے رہا ہوتو اسوقت باتیں کرنا جائز نہیں ہے

۲۔دونوں خطبوں کو غور سے سننا چاہیے۔

۳۔جمعہ کے دن کے غسل جمعہ سے نماز بھی پڑھی جاسکتی ہے۔

۴۔نماز جمعہ صرف جماعت کے ساتھ ہوگی۔

۲۔نماز آیات

واجب نمازوں میں سے ایک نماز آیات ہے جو آسمانی یا زمینی آفات کی وجہ سے واجب ہو جاتی ہے۔ مثلا: زلزلہ، سورج گرہن، چاند گرہن، خوفزدہ کر دینے والی بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک، سرخ اور زرد آندھی یا طوفان کہ جو خوفزدہ کر دینے والی ہو۔

نماز آیات کا طریقہ

اس کے دو طریقے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ نماز آیات کی دو رکعتوں میں سے ہر رکعت میں پانچ رکوع ہیں اور ہر رکوع سے پہلے سورہ حمد اور ایک پورا سورہ مثلا سورہ توحید یا سورہ کوثر وغیرہ پڑھے۔

۲۔ دونوں رکعتوں میں سورہ حمد کے بعد دوسری سورہ کے پانچ حصے کرے اور ہر ایک حصے کے بعد رکوع کرے، مثلا سورہ حمد پڑھنے کے بعد سورہ توحید کے پانچ حصے یوں کرے

۱۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم پھر رکوع کرے۔

۲۔ قل ہو اللہ احد پھر رکوع۔

۳۔ اللہ الصمد پھر رکوع۔

۴۔ لم یلد ولم یولد پھر رکوع۔

۵۔ ولم یکن لہ کفوا احد پڑھے اور پھر رکوع میں جائے۔

اسی طرح دوسری رکعت بھی بجالائے اور اس کے بعد سجدوں کو بجالائے اور دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے اور اس کو بھی اسی طریقہ پر پڑھے۔

۳۔ نماز عیدین

امام عصر علیہ السلام کے زمانہ حضور میں عید الفطر و عید قربان کی نمازیں واجب ہیں اور انہیں جماعت کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے لیکن ہمارے زمانے میں کہ جب تک امام عصر غیبت میں ہیں، یہ نمازیں مستحب ہیں اور با جماعت اور فرادی دونوں پڑھی جاسکتی ہے اور اس کا وقت عید کے دن طلوع آفتاب سے ظہر تک ہے۔

عید فطر و قربان کا طریقہ:

عید فطر و قربان کی نماز بھی دو رکعتی ہے جس کی پہلی رکعت میں الحمد اور سورہ کے بعد پانچ تکبیریں کہی جاتی ہیں ۔ اور ہر دو تکبیروں کے درمیان ایک قنوت پڑھا جاتا ہے۔ اور پانچویں تکبیر کے بعد ایک اور تکبیر کہی جاتی ہے اور رکوع

میں چلا جاتا ہے۔ پھر دو سجدے بجالائے اور اٹھ کھڑا ہونے کے بعد دوسری رکعت میں چار تکبیریں کہی جاتی ہیں۔ ہر دو تکبیروں کے درمیان قنوت پڑھی جائے اور چوتھی تکبیر کے بعد ایک اور تکبیر کہہ کر رکوع میں چلا جائے، دو سجدے، تشہد اور سلام کہہ کر نماز کو تمام کردے۔ عید فطر و قربان کی نماز کے قنوت میں جو بھی دعا اور ذکر پڑھا جائے کافی ہے۔

سبق 17

نگاہ

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ: ناجائز نگاہ شیطان کا ایک ایسا زہر آلود تیر ہے جو آتے ہی مالک کے دل میں پیوست ہوجاتا ہے۔ کتنی ہی ناجائز نظریں طویل پچھتاوے رکھتی ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ: جسم کے ہر حصے کا ایک زنا ہوتا ہے چنانچہ آنکھ کا زنا ناجائز نگاہ ہے۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ: جو بھی اپنی آنکھ کو حرام سے ناپاک کرتا ہے خدا قیامت کے دن ان کی آنکھوں کو دوزخ کی آگ سے بھر دے گا، جو شخص اپنی آنکھوں سے کسی نامحرم عورت کو بہت دیکھے گا تو قیامت کے دن خدا اس کی دونوں آنکھوں میں آگ کی سلاخیں اس وقت سیک لگائے رکھے گا، جب تک تمام لوگوں کو فیصلے سنا نہ دے۔ اس کے بعد اسے جہنم میں پھینک دیے جانے کا حکم ملے گا۔

ا۔ نگاہ کے احکام

کسی بھی مرد کے لیے نامحرم عورت کو ارادہ و اختیار کے ساتھ دیکھنا حرام ہے اور اگر کسی عورت پر اچانک نگاہ پڑ جائے تو حلال ہے۔ البتہ ایک نظر کے بعد اس کی طرف دیکھتے رہنا حرام ہے۔ حتیٰ کہ کسی کو بھی چاہے مرد مرد کو، عورت عورت کو یا مرد عورت (اپنی بیوی کے علاوہ) کو اور عورت مرد (اپنے شوہر کے علاہ) کو لذت کی نگاہ سے دیکھنا حرام ہے۔ اسی طرح اگر نامحرم عورت کی آواز کو قصد لذت کی خاطر سننا چاہے تو یہ بھی حرام ہے۔

مرد اور خاتون کے درمیان محرمیت کس طرح ہوتی ہے؟

ا۔ خونی رشتے ۲ رضاعت ۳۔ نکاح

ا۔خونی رشتے

انسان کے لیےمحرم خواتین یہ ہیں:

ا۔ماں

۲۔دادی، یہ سلسلہ جتنا اوپر چلتا جائے۔

۳۔۔نانی، یہ سلسلہ جتنا اوپر چلتا جائے۔

۴۔بیٹی اور پوتیاں اور یہ سلسلہ جتنا نیچے چلا جائے (پوتی کی بیٹی، پوتیاں وغیرہ)۔

۵۔بہن، خواہ سگی ہو یا صرف ماں کی طرف سے یا صرف باپ کی طرف سے اور بہن کی بیٹیاں، نواسیاں وغیرہ۔

۶۔پھوپھی، نیز ماں اور باپ کی پھوپھی۔

۷۔خالہ نیز ماں اور باپ کی خالائیں۔

۸۔بھتیجی، نیز اس کی پوتیاں نواسیاں اور یہ سلسلہ جتنا نیچے چلا جائے۔

عورتوں کے لیے مندرجہ ذیل مرد محرم ہیں:

ا۔باپ اور دادا اور یہ سلسلہ جتنا اوپر چلتا جائے۔

۲۔نانا اور اس طرح یہ سلسلہ اوپر چلا جائے، پرنانا، وغیرہ۔

۳۔بیٹا اور جتنا یہ سلسلہ نیچے چلا جائے۔

۴۔بھائی۔

۵۔بھائی کے بیٹے، اور پوتے اور نواسے۔

۶۔بہن کے بیٹے اور پوتے اور نواسے۔

۷۔چچا اور ماموں نیز ماں اور باپ کے چچا اور ماموں۔

۲۔رضاعت

رضاعت سے بھی رشتے حرام ہوجاتے ہیں۔رضاعت یہ ہے کہ بچہ کوئی اور غذا کھائے پیئے بغیر دن میں دس یا پندرہ مرتبہ رضاعی ماں کا دودھ پئے اور اس دودھ سے بچے کا گوشت و پوست بنے تو اس سے بھی رضاعی ماں، رضاعی بہن، رضاعی خالہ، رضاعی پھوپھی، یہ سب محرم بن جاتے ہیں۔

۳۔نکاح

عورت سے شادی کرنے کے بعد بھی بیوی کے لیے شوہر کے کچھ رشتہ دار اور شوہر کے لیے بیوی کے کچھ رشتہ دار محرم بن جاتے ہیں جیسے شوہر کا باپ اور شوہر کے لیے بیوی کی ماں محرم بن جاتی ہیں۔

ان خواتین کے علاوہ انسان کے لیے دیگر تمام خواتین نامحرم ہیں، مثلاً، بھابھی، کزن یا اس کے علاوہ جتنے بھی رشتے ہو، بھابھی کی بہنیں کزنیں اسی طرح جتنا آگے چلتے جائیں ان کو بھی لذت کی نگاہ، یا ان کے بالوں پر یا کسی اور جگہ جہاں شریعت نے اجازت نہ دی ہو دیکھنا حرام ہے۔

سبق18

مسجد

جس جگہ تمام مسلمان اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اس جگہ کو مسجد کہتے ہیں۔ مسجد اللہ کا گھر ہے اس کا تمام مسلمان احترام کرتے ہیں۔ اس کے احکام و آداب درجہ ذیل ہیں:

مسجد کے احکام

۱۔ ا مسجد کو نجس کرنا حرام ہے۔ ۲۔ نجاست کو مسجد میں لے جانا احترام مسجد کے خلاف ہے۔

۳۔ مسجد کو پاک رکھنا واجب ہے۔ ۴۔ سونے اور جانداروں کی تصویروں سے مسجد کو زینت نہ دی جائے۔

۵۔ مسجد کو صاف رکھنا چاہیے۔ ۶۔ چراغ جلانا چاہیے۔

۷۔ داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں پہلے اندر رکھنا چاہیے اسی طرح باہر نکلتے وقت بایاں پاؤں باہر رکھنا چاہیے۔

۸۔ روبقبلہ مسجد میں دعائیں مانگنا چاہیے۔ ۹۔ باوضو مسجد میں داخل ہونا چاہیے۔

۱۰۔ مسجد کی طرف جانے میں جلدی کرنا چاہیے۔ ۱۱۔ مسجد میں دیر تک رہنا چاہیے۔

۱۲۔ خوشبو لگا کر اور عمدہ لباس پہن کر مسجد میں داخل ہونا چاہیے۔ ۱۳۔ مسجد کے احترام کے لیے دو رکعت نماز پڑھنا۔

مکروہات

۱۔ مسجد میں تصویریں یا مجسمے بنانا۔ ۲۔ اذان کے علاوہ آواز بلند کرنا۔ ۳۔ مسجد میں سونا

۴۔ شور و غل کرنا ۵۔ محراب مسجد کو عمارت میں داخل ہونے کا دروازہ بنانا۔

۶۔تھوکنا۷۔اشعار پڑھنا

۸۔ پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آنا۔۹۔چھوٹے بچوں اور دیوانوں کو مسجد میں لانا تاکہ مسجد کو نجس نہ کریں۔

سبق19

کھانا کھانے کے آداب

مستحبات

۱۔کھانا کھانے سے پہلے دونوں ہاتھ دھوئے۔۲۔کھانا کھالینے کے بعد اپنے ہاتھ دھوئے اور رومال وغیرہ سے خشک کرئے۔۳۔میزبان سب سے پہلے کھانا کھانا شروع کرے اورسب کے بعد کھانے سے ہاتھ کھینچے۔

۴۔کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھے لیکن اگر ایک دسترخوان پر کئی انواع واقسام کے کھانے ہوں تو ان میں سے ہر کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔

۵۔کھانا دائیں ہاتھ سے کھائیں۔۶۔تین یا تین سے زیادہ انگلیوں سے کھانا کھائے۔

۷۔اگر چند اشخاص دسترخوان پر بیٹھیں تو ہر ایک اپنے سامنے سے کھانا کھائے۔

۸۔چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کر کھائے۔۹۔دسترخوان پر زیادہ دیر بیٹھے اور کھانے کو طول دے ۱۰۔کھانا خوب اچھی طرح چبا کر کھائے۔

۱۱۔کھانا کھالینے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے۔۱۲۔انگلیوں کو چاٹے۔

۱۳۔کھانا کھانے کے بعد دانتوں میں خلال کرے۔البتہ ریحان کے تنکے، انار کی لکڑی یا کھجور کے درخت کے تنکے اور پتے سے خلال نہ کرے۔

۱۴۔جو غذا دسترخوان سے باہر گر جائے اسے جمع کرے اور کھالے (اگر وہ نجس نہ ہو تو پاک کر کے کھائیں)۔

۱۵۔دن اور رات کی ابتدا میں کھانا کھائے۔

۱۶۔کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے پیٹھ کے بل لیٹے اور دائیں پاؤں کو بائیں پاؤں پر رکھے۔

۱۸۔کھانا شروع کرتے وقت اور کھالینے کے بعد نمک چکھے۔۱۷۔پھل کھانے سے پہلے انہیں پانی سے دھو لے۔

مکروہات

کھانا کھاتے وقت چند باتیں مکروہ شمار کی گئی ہیں:

ا۔کھانا کھاتے وقت باتیں کرتا۔ ۲۔ بہت زیادہ کھانا۔ ۳۔کھانا کھاتے وقت دوسروں کے منہ کی طرف دیکھنا۔

۴۔گرم کھانا کھانا۔ ۵۔جو چیز کھائی یا پی جارہی ہو اسے پھونک مارنا۔ ۶۔دسترخوان پر کھانا لگ جانے کے بعد کسی اور چیز کا انتظار کرنا۔

۷۔روٹی کو چھری سے کاٹنا۔ ۸۔روٹی کو کھانے کے برتن کے نیچے رکھنا۔ ۹۔ہڈی سے چپکے ہوئے گوشت کو یوں کھانا کہ ہڈی پر گوشت بالکل باقی نہ رہے۔

۱۰۔اس پھل کا چھلکا اتارنا جو چھلکے کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ ۱۱۔پھل پورا کھانے سے پہلے پھینک دینا۔

پانی پینے کے آداب

مستحبات

ا۔پانی چوسنے کی طرز پر پیئے۔ ۲۔پانی دن میں کھڑے ہوکر پیئے۔

۳۔پانی پینے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم اور پینے کے بعد الحمد اللہ کہے۔

۴۔پانی (غٹا غٹ نہ پیئے بلکہ) تین سانس میں پیئے۔ ۵۔پانی خواہش کے مطابق پیئے۔

۶۔پانی پینے کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے اہل بیت اطہارؑ کو یاد کرے اور ان کے قاتلوں پر لعنت بھیجے۔

مکروہات

ا۔زیادہ پانی پینا۔ ۲۔مرغن کھانے کے بعد پانی پینا۔ ۳۔رات کو کھڑا ہوکر پانی پینا۔

۴۔کوزے کی ٹوٹی سے پانی پینا۔ ۵۔کوزے کے دستے والی جگہ سے پانی پینا۔

سبق20

سونے اور رفع حاجت کے آداب

سونے کے آداب

۱۔وضو کر کے سونا چاہیے۔ ۲ تسبیح جناب سیدہ سلام اللہ علیہا پڑھ کر سونا چاہیے۔ ۳۔سوتے وقت ذکر خدا کرنا چاہیے۔ ۴۔رات کو جلدی سو جانا چاہیے۔۵۔تنہا نہیں سونا چاہیے۔۶۔نماز صبح کے بعد نہیں سونا چاہیے۔۷۔طہارت کر کے سونا چاہیے۔۸۔دائیں کروٹ پر سونا چاہیے۔

بیت الخلاء کے احکام

۱۔ پیشاب یا پاخانہ کرتے وقت رو بہ قبلہ نہ ہو۔ ۲۔سر کو ڈھانپنا چاہیے۔ ۳۔ دوسروں سے اپنی شرم گاہ کو چھپانا لازم ہے۔ ۴۔مردوں کو استبراء کرنا چاہیے۔

استبراء

استبراء ایک مستحب عمل ہے جو مرد پیشاب کرنے کے بعد اس غرض سے انجام دیتے ہیں تا کہ اطمینان ہو جائے کہ اب پیشاب نالی میں باقی نہیں رہا۔اس کی کئی ترکیبیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ: پیشاب سے فارغ ہو جانے کے بعد اگر مقعد نجس ہو گیا ہو تو اسے پاک کرے اور پھر تین دفعہ بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی کے ساتھ مقعد سے لے کر عضو تناسل کی جڑ تک کھینچے اور اس کے بعد انگوٹھے کو عضو تناسل کے اوپر اور انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی کو اس کے نیچے رکھے اور تین دفعہ سپاری تک کھینچے پھر تین دفعہ سپاری کو جھٹکے۔

چار جگہوں پر رفع حاجت کرنا حرام ہے:

۱۔ بند گلی میں

۲۔اس جگہ میں جو کسی کی نجی ملکیت ہو جب کہ مالک اجازت نہ دے۔

۳۔ان جگہوں میں جو مخصوص لوگوں کے لیے وقف ہو، مثلاً مدرسہ صرف دینی طلبا کے لیے وقف خاص ہو۔

۴۔مؤمنین کی قبروں پر جبکہ ان کی بے حرمتی ہوتی ہو۔

اخلاقیات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کورس کا تعارف اور اہداف

تعارف

اخلاقیات تمام ادیان کا ایک مشترک موضوع ہے اور ہر دین نے خصوصاً آسمانی ادیان بالاخص اسلام نے اخلاقیات کو غیر معمولی اہمیت دی ہے، اسلامی اخلاقیات کی ائمہ معصومینؑ نے رہنما اصولوں اور عملی کردار کے ذریعے مزید وضاحت فرمائی ہے۔

مکتب اہل بیتؑ کے نزدیک اسلامی اخلاقی اصولوں اور عملی سیرت کے ذخیرے کو نئی نسل تک پہنچانے کے لیے ہم نے نصاب میں بھی اس موضوع کو خاص طور پر شامل کیا ہے۔اس میں اسلامی اخلاقیات اور اسلامی آداب سے متعلق پندرہ ۲۰ ابواب شامل کئے گئے ہیں ان ابواب میں اخلاق کے تعارف و اہمیت اخلاقیات حسنہ اور اخلاقیات رزیلہ کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز مختلف امور سے متعلق اسلامی آداب کو بھی طلبہ تک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔

اہداف

اس نصابی کتاب کے حصہ اخلاقیات کو پڑھنے کے بعد:

۱۔طلبہ کو اخلاق کا تعاف اور اہمیت نیز اخلاق حسنہ اور اخلاق رذیلہ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور ان میں اس لحاظ سے فکری تبدیلی بھی آئے گی۔

۲۔طلبہ کے روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے امور میں طلبہ اسلامی اخلاقیات اور آداب کو ایک راہنما اصول اور ضابطہ حیات کے طور پر اپنائیں گے۔

۳۔طلبہ کے عمومی سلوک، رویہ اور عادات میں مثبت فرق دیکھنے میں آئے گا۔

سبق 1

اخلاق

آغازِ سخن

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی فلاح کی خاطر جس دستور کو اپنے آخری رسول ﷺ کے ذریعے بیان فرمایا ہے وہ بنیادی طور پر تین اقسام کا ہے۔

۱۔عقائد (اصول دین)

۲۔اعمال واحکام (فروع دین)

۳۔اخلاقیات

قرآن مجید میں بھی ان تینوں قسموں کی اہمیت وتشخیص کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورہ عصر میں ان تینوں اقسام کا ایک ساتھ ذکر کرتے ہوئے۔

ارشاد فرماتا ہے:

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

انسان خسارے میں ہے سوائے ان (انسانوں) کے جو ایمان لائے (عقائد) اور عمل صالح کرتے رہے (فروع دین) اور حق وصبر کی تلقین کرتے رہے۔(اخلاقیات)[1]

اخلاقیات

اس حقیقت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ہر انسان نقصان سے بچنا چاہتا ہے اور انسان کی عقل اس کو ہر مضر اور نقصاندہ کام کو انجام دینے سے منع کرتی ہے۔اگر چہ کسی کام سے نقصان پہنچنے کا احتمال بھی ہو تو اس سے بچاؤ کی تدبیر کرنا ضروری ہے اور اگر نقصان یقینی ہو تو اس سے بچنا مزید ضروری ہو جاتا ہے۔

اگر کسی کام کی وجہ سے آنے والے دنوں میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو حال ہی میں اس سے بچاؤ کی تدبیر کرنا چاہیے۔بالکل اسی طرح اگر کسی کام سے کوئی فائدہ ملنے کا علم ہو تو عقل انسانی اس عمل کو انجام دینے کی تشویق دلاتی ہے کہ اس سے فائدہ حاصل کر لیں۔اگر یہ فائدہ ونقصان دنیا سے مربوط ہوں تو اس فائدہ کا حاصل نہ ہونا اور نقصان و

ضرر کا اٹھانا قابل برداشت ہیں مگر انبیاء کرامؑ اوران کے اوصیاءؑ نے ہمیں آخرت کے یقینی فائدہ ونقصان کو بالکل واضح کر کے بیان کر دیا ہے اوران کی صداقت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم آخرت کے فائدہ کے حصول اوراس دائمی وابدی نقصان سے بچنے کے لیے ابھی سے تدبیر کریں۔

علم اخلاق واخلاقیات معاشرے میں ہمیں صحیح طریقہ سے رہنے سہنے کے آداب اورلوگوں سے معاشرت کی تربیت دیتا ہے اوراسی علم کی وجہ سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کون ساعمل ہمارے فائدے کا ہے اورکن کاموں کی وجہ سے ہمیں خسارہ اٹھانا پڑے گا۔

اخلاق

اخلاق واخلاقیات ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں اور ہرایک اپنے حساب سے رہنے سہنے اورمعاشرت کے کچھ قوانین وضوابط رکھتے ہیں۔ مذہب اسلام کا یہ خاصہ ہے کہ اس سے بہتر تعلیمات واخلاقیات کسی اور مذہب میں موجودنہیں ہیں اورشریعت اسلام نے ''اخلاقیات'' کوحد درجہ اہمیت دی ہے اوراخلاقیات کی اہمیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اکرم ﷺ کی تعریف میں آپؐ کی اس صفت وخوبی کوخصوصی طور پر بیان فرمایا کہ:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ

اور بے شک آپؐ اخلاق کے عظیم مرتبے پر فائز ہیں۔

اوراسی طرح خودرسول اکرم ﷺ نے بھی اپنی بعثت کا مقصد ''اخلاقیات'' کوقرار دیا ہے۔

چنانچہ آپؐ سے منقول ہے کہ:

انّما بعثتُ لاتمم مکارم الاخلاق

بے شک مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔

یہی حسن خلق اوراچھا کردار ہے کہ جس کے ذریعے انسان پوری دنیا کواپنا بنا سکتا ہے اور دنیاوی فوائد کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی لاتعداد فوائد اچھے اخلاق والے کے منتظر ہیں۔

جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

قیامت کے دن کسی شخص کے ''میزان'' میں حسن خلق سے بہتر کوئی چیز نہیں رکھی جائے گی۔

اخلاق، اسلام سے ہٹ کر کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے بلکہ اسلامی عقائد واحکام کا عملی نمونہ اخلاق کہلاتا ہے یعنی اخلاق کا کچھ حصہ خالق اور کچھ مخلوق کے ساتھ خاص ہے۔اس اعتبار سے اخلاق کودوقسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

ا۔حقوق اللہ

اللہ کے ساتھ حسن سلوک یہ ہے کہ اس کی اطاعت کے جائے اور ایک بندے پر اس کے مولا کے جتنے حقوق واجب الادا ہوتے ہیں ان کو بطریق احسن انجام دیا جائے۔

۲۔حقوق العباد

حقوق العباد میں اخلاق کو مزید دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ا۔حق النفس

یعنی انسان کی اپنی ذات کا بھی اس پہ حق ہے کہ اس سے احسن طریقہ سے پیش آئے اگر انسان کوئی ایسا عمل نہ کرے جو اس کی ذات ونفس کے لیے نقصان دہ نہ ہو تو یہ اس کا اپنے ساتھ حسن خلق ہوگا۔اسی وجہ سے اسلام نے خود کو تکلیف دینا اور نقصان پہنچانا حرام قرار دیا ہے۔ا)المستدرک الحاکم، ج ۲،ص ۶۱۳

2.حق الغیر

جہاں اسلام نے انسان کی اپنی ذات کی پرواہ کی ہے۔ وہیں دوسروں کی بھی پرواہ کی ہے اور اُن کی جان و مال کا بھی خیال رکھا ہے۔اسلام نے انسان پہ بہت سے افراد کے حقوق کو ضروری قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ماں، باپ، ہمسایہ، مومن بھائی وغیرہ کے حقوق کہ جن کو انجام نہ دینے سے بہت بڑے خطرہ کا سامنا کرنا ہوگا۔

ہر انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ معاشرہ میں معزز و معتبر مانا جائے اور وہ عزت و مقام کو حاصل کرنے کے لیے کوشش و محنت کرتا ہے۔اس عزت وکمال کو حاصل کرنے کے لیے وہ خود سے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے بعض اوقات تو وہ طریقے اسے عزت دلاتے ہیں مگر اکثر طور پر وہ کچھ ایسے راستے پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے دنیا میں بھی ملامت اٹھانی پڑتی ہے اور آخرت میں بھی ذلت آمیز عقاب چکھنا پڑے گا۔

دین و مذہب فقط چند مخصوص اوقات میں چند خاص طرح کے افعال انجام دینے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ طرز حیات ہے کہ جس کو خالق کائنات نے ہمارے لیے تیار کیا ہے۔ ہم اپنے لیے خود طریقہ حیات ڈھونڈتے ہیں اور دنیا و آخرت کی خواری اٹھاتے ہیں اور اگر ہم اس کے طریقہ کو اختیار کریں کہ جس نے ہمیں خلق کیا اور جو ہماری ساری ضروریات سے آگاہ ہے تو ہم دنیا و آخرت میں عزت و مقام کے ساتھ ساتھ فلاح پا سکتے ہیں۔

حقیقی عزت وکمال تک رسائی اس وقت ممکن ہے جب انسان خالق کے بیان کردہ قانون کی اتباع کرے۔ پس اچھی معاشرت اور بہترین اخلاق رہی ہے جو اللہ نے بیان فرمایا ہے اور اسی کے ذریعے انسان عزت وکمال کو حاصل

کرسکتا ہے اور دوسری طرف اخلاق سے عاری انسان اپنے لبادہ کا کفن اوڑھے جسم کا جنازہ اٹھائے پھرتا رہتا ہے کیونکہ جس طرح جسم کی زندگی روح سے مربوط ہے اسی طرح حیات روح اچھے اخلاق سے پیوستہ ہے۔

خلاصہ اخلاق اچھے کردار اور رویہ کو کہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اخلاق کو دین اسلام کا تیسرا بڑا رکن قرار دیا ہے۔

خداوند متعال سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ویسا بننے کی توفیق عطا کرے کہ جیسا وہ ہمیں دیکھنا چاہتا ہیں۔

سبق 2

جھوٹ

شریعت اسلام میں جہاں بھی انسان کو کسی غیر اخلاقی عمل سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے تو اس عمل میں حکم الہی کی تعمیل کے ساتھ ساتھ انسان کا اپنا بھی کوئی نہ کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے اور اس عمل کی مخالفت کی صورت میں جہاں انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے عذاب میں مبتلا ہوتا ہے وہیں پر اس دنیا میں بھی اسے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

جھوٹ ایک ایسی بیماری ہے کہ جس کی برائی سب پر واضح اور عیاں ہے اور اس کی وجہ سے انسان دوسروں کی نظروں میں اپنا مقام واعتبار کھو بیٹھتا ہے۔ جھوٹ ایک ایسا گناہ کبیرہ ہے کہ جس کو تمام آسمانی شریعتوں میں حرام قرار دیا گیا ہے حتی کہ ایسے لوگ جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ بھی اس کو برا سمجھتے ہیں۔

تعریف

ایسی خبر دینا یا کسی کو ایسی بات بتانا جو صحیح نہ ہو جھوٹ کہلاتی ہے۔

جھوٹ بولنا، جھوٹ لکھنا، اور جھوٹے اشخاص کی باتوں پر کان دھرنا حرام ہے۔ جس طرح معاشرہ اس برائی کو ناپسند کرتا ہے۔ اسی طرح خدوا ند کریم کی نظر میں بھی جھوٹے لوگوں کی کوئی عزت ومنزلت نہیں ہے۔

چنانچہ ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ

پس تم لوگ بتوں کی پلیدگی سے اجتناب کرو اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو۔[1]

ایک اور مقام پر ارشاد رب العزت ہے:

إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ

جھوٹ تو وہی لوگ بولتے ہیں جو خداوند کریم کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے۔[1]

اگر ہم ائمہ معصومینؑ کے فرامین کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں جھوٹ اور جھوٹے شخص کی مذمت میں بے شمار احادیث ملتی ہیں کہ جن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ معصومینؑ اس قبیح عمل سے بالکل ہی راضی نہیں ہیں جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

سب سے بڑی خیانت یہ ہے کہ تیرا بھائی تجھ سے سچ بولے اور تو اس سے جھوٹ بولے۔

اسی طرح امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ جھوٹ ایمان کی بنیاد کو منہدم کر دیتا ہے۔

اور امام حسن عسکری سے منقول ہے کہ تمام برائیاں اگر ایک گھر میں ہوں تو اس کی چابی جھوٹ ہوگی۔

جھوٹا شخص کمزور ایمان اور خیانت کار ہوتا ہے اور امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ: مسلمان کو اس آدمی سے باز رہنا چاہیئے جو اکثر جھوٹ بولتا ہو کیونکہ جھوٹا آدمی اعتبار کھو دیتا ہے اور اگر کبھی وہ سچ (بھی) بولے گا تو کوئی اس کا اعتبار نہیں کرے گا۔

جھوٹ کے اسباب

مختلف روایات احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ بولنے کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں ان وجوہات میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

۱۔ انسان میں نقص کا ہونا یعنی جھوٹ وہی بولتا ہے جس کی ذات میں کوئی نقص پایا جاتا ہو۔

۲۔ بری صحبت اور برے اجتماعات میں شمولیت انسان کو جھوٹ پر آمادہ کرتی ہے۔

۳۔ جھوٹ کی عاقبت و نقصان سے جاہل ہونے کی وجہ سے بھی انسان جھوٹ بولتا ہے۔

نقصانات

جہاں جھوٹے شخص کو آخرت میں عذاب الٰہی کا سامنا کرنا پڑے گا تو وہاں وہ اس دنیا میں بھی بہت سی مشکلات اور نقصانات کا سامنا کرے گا۔ جن میں سے چند ایک نقصانات حسب ذیل ہیں:

۱۔ دنیا میں وہ ذلیل و خوار ہوگا اور اسے ہر مقام پر ندامت اٹھانی پڑے گی۔

۲۔ اس کا ایمان کمزور ہوگا۔

۳۔ اس کے رزق میں کمی ہوگی۔

۴۔ اس کا رعب و ہیبت ختم ہو جائے گا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ جھوٹے شخص کو ہدایت کی نعمت سے محروم فرما دیتا ہے۔

۶۔جھوٹا شخص اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

۷۔جھوٹ کی وجہ سے انسان کئی دیگر گناہوں میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے کہ جس سے اُسے دہرے عذاب کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔

ایسے مقامات جہاں جھوٹ بولنا جائز ہے

البتہ روایات میں چند ایسے موارد کا ذکر ملتا ہے کہ جہاں پر جھوٹ بولنے کی اجازت دی گئی ہے۔

۱-جنگ میں دشمن کو غافل کرنے کے لیے

۲۔دو مومن بھائیوں کے درمیان صلح وصفائی کرانے کے لیے

۳-بیوی کا دل رکھنے کے لیے کسی چیز کا وعدہ کرنا اگر چہ اس چیز کے دینے کی نیت نہ ہو۔

۴۔ایسا مقام کہ جہاں جان، مال یا عزت کو خوف لاحق ہو تو اس ضرورت کے تحت جھوٹ بولنا جائز ہے

جھوٹی قسم

جھوٹ گناہانِ کبیرہ میں سے ہے مگر گناہ کے عذاب میں مختلف وجوہات کی وجہ سے اضافہ یا کمی ہوتی رہتی ہے مثلاً اگر ہم کسی گلی میں کھڑے ہو کر جھوٹ بولیں تو اس کا عذاب کچھ اور ہوگا اور اگر ہم وہی جھوٹ مسجد میں جا کر بولیں تو اس کا عقاب اُس سے کہیں زیادہ ہوگا۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم کھانا گناہ کبیرہ ہے۔

قرآن کریم میں اس کی سخت مذمت وارد ہوئی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

جو لوگ اللہ سے کئے گئے عہد و پیمان اور قسم اقسام کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیتے ہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔خدا قیامت کے دن نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف نظر (رحمت) کرے گا اور نہ ان کو (گناہوں کی کثافت سے) پاک کرے گا۔اوران کے لئے دردناک عذاب ہے۔(سورۃ آل عمران)

روایات معصومینؑ میں بھی جھوٹی قسم کھانے اور جھوٹی گواہی دینے کی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی ہے جیسا کہ امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ:

جو کوئی جانتے بوجھتے ہوئے اللہ کی جھوٹی قسم کھائے گا گویا وہ خدا سے جنگ کرے گا۔

اسی طرح ایسی گواہی دینا کہ جس کی حقیقت معلوم نہ ہو جھوٹی گواہی کہلاتی ہے۔اور یہ بھی گناہ کبیرہ ہے اور اسلام اس کی مذمت کرتا ہے۔

علاج

جھوٹ کا علاج یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان اس گناہ کی خباثت کے بارے میں آگاہی حاصل کرے اور اس کو معمولی بات سمجھ کر اس سے بے اعتنائی نہ برتے مثلاً کوئی آپ کے گھر میں آپ کو ملنے آئے اور آپ اس کو یہ پیغام بھجوائیں کہ آپ گھر میں نہیں ہیں تو یہ جھوٹ ہے اور اس طرح کے روزمرہ کے موارد میں جھوٹ سے بچنا چاہیئے تا کہ کہیں اس طرح یہ قبیح عمل ہماری عادت نہ بن جائے۔

سبق 3

دوسروں کے مال کا استعمال

اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں عرب کا معاشرہ غیر مہذب اور ناخواندہ تھا۔ اور لوگ دوسروں کے حقوق سے اصلاً ناآشنا تھے۔ وہ ایک ایسا معاشرہ تھا کہ جس میں انسانی جان کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی بلکہ وہ لوگ اپنی اولاد (بیٹیوں) تک کو زندہ درگور کرنے پر راضی ہو جاتے تھے مگر شریعت مقدسہ اسلام نے اسی معاشرے کو ایک مہذب ترین معاشرے کے تمام قواعد و قوانین سے آشنا کرایا اور انسانی جان کے ساتھ ساتھ اس کی عزت و مال کی حفاظت کو بھی ملحوظ رکھا۔ اسی وجہ سے شریعت اسلام میں اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ کسی کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر استعمال کیا جائے۔ اور بلا اجازت دوسروں کا مال استعمال کرنے کی سخت مذمت کی گئی۔ دوسروں کا مال چند طرح سے بلا اجازت استعمال کیا جاسکتا ہے جن میں سے صرف دو کو ذکر کریں گے۔

ا۔ چوری کرنا ۲۔ خیانت کرنا

ا۔ چوری

چوری کسی دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر خفیہ طور پر یا چھپا کر لے لینے کا نام ہے۔

یہ وہ واحد گناہ ہے کہ جس کی سزا اللہ تعالی نے واضح طور پر ہاتھ کاٹنا قرار دیا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد رب العزت ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾

اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ دو یہ ان کے عمل کی سزا اور اللہ کی طرف سے عبرت ہے

اور اللہ زبردست اور صاحب حکمت ہے۔

چوری کرنا گناہان کبیرہ میں سے ہے اور روایات معصومینؑ میں بھی اس کی بہت زیادہ مذمت کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں بہت سی احادیث میں یہ بات ملتی ہے کہ جب چور چوری کرنے میں مصروف ہوتا ہے تو اس وقت اس کے پاس ایمان نہیں ہوتا۔ چور کے بارے میں فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر چور ایک دفعہ چوری کرے تو اسکے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو جڑ سے کاٹ دیا جائے اور اگر اس کے بعد وہ پھر چوری کرے تو اس کے بائیں پاوں میں سے نصف قدم کو کاٹ دیا جائے، اور اگر اس کے باوجود وہ باز نہ آئے تو اس کو عمر قید کی سزا سنائی جائے اور اگر وہ پھر بھی باز نہ آئے اور زندان میں بھی چوری کرے تو اس کو سزائے موت دے دی جائے۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

چوری اس لیے حرام ہے کہ اس سے مال برباد ہوتا ہے، جانیں ضائع ہوتی ہیں، نزاع وحسد کے جذبات ابھرتے ہیں۔ چور کا دایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ انسان اپنے اکثر کام دائیں ہاتھ سے کرتا ہے۔ دایاں ہاتھ انسانی وجود کا سرمایہ ہے چوری کی سزا میں دایاں ہاتھ اس لیے کاٹا جاتا ہے کہ چور کو نصیحت اور دوسروں کو عبرت ہو، اور چور کا انجام دیکھ کر دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں اور چوری نہ کریں۔

نقصانات

چوری کی بری عادت کی وجہ سے چور کو دنیا وآخرت میں مختلف قسم کے نقصانات جھیلنے پڑتے ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱- چوری کرنے سے چور کا ایمان زائل ہوجاتا ہے اور وہ اس عمل کی وجہ سے مومن نہیں رہتا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اور اس کی برگزیدہ ہستیوں کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۳۔ چور اس دنیا میں اپنے جسم کے اہم اجزا (ہاتھ اور پاؤں) یا پھر بعض اوقات اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

۴۔ چور کبھی حلال مال نہیں کھا سکتا۔

۵۔ چور چوری کرنے کی وجہ سے سستی اور کاہلی کا شکار ہوجاتا ہے اور محنت مزدوری کر کے کھانے سے کتراتا ہے۔

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ دوسروں کے مال کو بلا اجازت استعمال کرنے سے مراد صرف چوری کرنا ہی ہے۔ جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں ڈاکہ وغیرہ بھی شامل ہے۔

اسی طرح معاشرے میں جب ہم یہ دیکھیں کہ دو دوست بیٹھے ہوں اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے دوست کی کسی چیز کو بغیر اجازت کے اٹھالے اور وہ چیز جس کی ہے وہ راضی نہ ہو، تو یہ بھی دوسروں کے مال کو بلا اجازت استعمال کرنے میں شامل ہوگا۔ اسی طرح کسی کے موبائل سے اس کی اجازت کے بغیر کہیں پر کال یا ایس ایم ایس کرنا جبکہ مالک راضی نہ ہو یا یہ کہ آدمی کسی کی دکان پر جائے اور باتوں میں اس کی دکان میں سے کوئی چیز اٹھا کر کھالے جبکہ دکاندار اس بات پر راضی نہ ہو تو یہ سب باتیں دوسروں کے مال کو بلا اجازت استعمال کرنے کے ضمن میں آجاتی ہیں اس طرح کی اور بھی مثالیں جو حقیقتاً دوسروں کے مال کو بلا اجازت استعمال کرنے میں شمار ہوتی ہیں مگر ہم ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں اور بے خیالی میں اتنے بڑے گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں لہٰذا ہر کام کرنے سے پہلے ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں اس کام سے کسی کا حق یا مال تو ضائع نہیں ہو رہا۔

۲۔خیانت

یعنی وہ حقوق جن کی محافظت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان کی حفاظت نہ کرنا خیانت کہلاتا ہے۔

علماء اخلاق نے خیانت کو بھی دوسروں کے مال کو بلا اجازت استعمال کرنے کی ایک قسم شمار کیا ہے۔ خیانت چاہے جس طرح بھی کی جائے یہ ممنوع اور حرام ہے۔ ہاں البتہ مختلف موارد میں خیانت کا گناہ مختلف ہوتا ہے۔ اسی لیے اگر کوئی شخص کسی کی امانت میں خیانت کرے تو اسے گناہان کبیرہ میں سے شمار کیا گیا ہے۔

عام طور پر معاشرے میں خیانت سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے پاس کوئی مال امانت کے طور پر رکھے اور وہ اس مال کے واپس کرنے سے انکار کر دے یا اصلاً مال رکھنے سے ہی مکر جائے تو اسے خیانت کہا جاتا ہے۔ مگر خیانت کا مفہوم عام ہے اور ہر حق کی حق تلفی کرنے کو خیانت شمار کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خائن شخص کی شدید مذمت کی ہے اور اس کام سے واضح طور پر منع کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۲۷﴾

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو اور اپنی امانتوں میں بھی خیانت نہ کرو در حالانکہ تم جانتے ہو۔[۱]

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

جو کوئی خیانت کرے تو قیامت کے دن خیانت سمیت پیش ہوگا۔[۲]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ:

''جو شخص دنیا میں کسی امانت میں خیانت کرے اور حقدار تک نہ پہنچائے اور اس حالت میں اسے موت آجائے تو وہ میرے دین پر نہیں مرے گا، اللہ اس پر غضبناک ہوگا اور جو شخص جان بوجھ کر چوری یا خیانت کا مال خریدے تو وہ بھی خائن کی طرح ہے''۔

یہ اتنا قبیح عمل ہے کہ اس کی مذمت میں ائمہ طاہرینؑ کی بے شمار احادیث موجود ہیں اور ان میں یہاں تک حکم دیا گیا ہے کہ جس نے تم سے خیانت کی ہو اس سے بھی خیانت نہ کرو کہ کہیں تم بھی اس جیسے نہ ہو جاؤ اور اس پر جو عقاب و عذاب ہوگا وہ تمہارا مقدر بھی نہ بن جائے۔

اسی طرح امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ اللہ سے ڈرو اور جن لوگوں نے تمہیں امین بنایا ہے ان تک امانت پہنچادو، اگر امام علیؑ کا قاتل بھی میرے پاس امانت رکھے تو میں اس کی امانت اسکو واپس کر دوں گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خائن شخص کو اپنی امت سے خارج شمار فرمایا ہے اور اسے جہنم کی وعید سنائی ہے۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

مسلمان مکر اور دھوکہ نہیں کرتا میں نے جبرائیل سے سنا انہوں نے کہا کہ مکر و دھوکہ دوزخ میں ہوں گے پھر فرمایا جو کسی مسلمان کو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں اور جو کسی مومن سے خیانت کرے وہ بھی ہم میں سے نہیں۔

وہ مقامات جو خیانت میں شمار ہوتے ہیں بہت زیادہ ہیں ان میں سے چند ایک قابل ذکر ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت اور اس کی معصیت کرنا اللہ تعالیٰ کے حق میں خیانت شمار ہوتی ہے۔

۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم اور ائمہ طاہرینؑ کے حق کو ادا نہ کرنا خیانت ہے۔

۳۔ کسی مومن کی امانت کو واپس نہ کرنا اور اس کا انکار کر دینا خیانت ہے۔

۴۔ کسی مومن کے راز کو افشاء کرنا بھی خیانت شمار ہوتا ہے۔

۵۔ روایت کے مطابق کسی مومن بھائی کی حاجت روائی میں کوتاہی کرنا خیانت میں شمار ہوتا ہے۔

۶۔ کسی خائن شخص کی امانت اپنے پاس رکھنا یا خیانت کے ذریعے حاصل کیے گئے مال کو خریدنا خیانت ہے۔

۷۔ گناہگار اور شر و فساد پھیلانے والا شخص بھی اپنے نفس کے حق کو ضائع کرنے کی وجہ سے خائن شمار ہوتا ہے۔

واقعہ

ایک شخص کے پاس ایک ہزار تومان کی ایک تھیلی تھی۔ وہ صبح سویرے نہانے کے ارادے سے عمومی حمام کی طرف چلا۔ راستے میں ایک دوست ملا وہ بھی اسی طرف جارہا تھا۔ جب ایک دوراہا آیا۔ تو دوست اس شخص سے کچھ کہے

بغیر الگ ہوگیا۔ اتفاق سے پیچھے ایک چور آرہا تھا وہ رقم سے بھری ہوئی اس تھیلی کو چوری کرنے کے چکر میں تھا۔ وہ شخص حمام پہنچا تو وہ چور بھی پیچھے پیچھے حمام پہنچ گیا، اس شخص نے رقم سے بھری ہوئی تھیلی حمام والے کے سپرد کی اور اندر نہانے چلا گیا اتفاق سے حمام والے کو خود بھی نہانے کا خیال آ گیا اس نے یہ سمجھ کر کہ یہ چور اس تھیلی والے کا دوست ہے وہ تھیلی چور کو دیدی اور کہا جب تک میں حمام سے باہر نہ آوں تم یہ امانت رکھو لو تو چور وہ تھیلی لیے وہیں بیٹھا رہا یہاں تک کہ حمام والا باہر آیا چور نے اسے تھیلی واپس کر دی جب معلوم ہوا کہ یہ شخص تھیلی والے کا دوست نہیں ہے۔ تو حمام والے نے اس سے پوچھا تم کون ہو؟'' اس نے جواب دیا: میں ایک چور ہوں۔

حمام والے نے پوچھا: پھر یہ تھیلی چوری کیوں نہ کی؟

چور نے جواب دیا: ٹھیک ہے میں ایک چور ہوں لیکن امانت میں خیانت کرنا جوانمردی کے خلاف ہے۔ مجھے امانت داری کی خاطر دو فائدے حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ میں ادھر بیٹھا رہا اور خیانت نہیں کی اور دوسرا یہ کہ ادھر بیٹھنے کی وجہ سے میں چوری سے بھی بچ گیا۔

تھیلی والا اس شخص سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے تھیلی کھول کر کچھ رقم اس کو دے دی۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ امانتداری نے اس وقت چور کو چوری سے بھی بچا لیا اور اسے تھیلی والے کے تحفے یعنی رزق حلال تک بھی پہنچا دیا اور اس طرح وہ دنیا میں بھی کامیاب اور آخرت میں بھی سعادت مند ٹھہرا۔

سبق 4

نخوت و تکبر

اسلام مساوات اور بھائی چارہ کا مذہب ہے اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اسلام نے ہر قسم کی ذات پات، رنگ و نسل، خاندان اور زبان کے اضافی تمام اسباب تفاخر و مباہات کو ختم کر دیا ہے اور واضح اعلان کیا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ان امور کی وجہ سے کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ ہاں! اگر کسی کے مرتبہ کو دیکھنا ہے تو اس کا معیار ذات الٰہی کی معرفت اور اس ذات سے خلوص کی وجہ سے کسی شخص کے تقوی کو قرار دیا گیا ہے اور اگر کوئی شخص اس کے علاوہ کسی اور وجہ سے بڑائی کرتا ہے تو اسلام کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ ایسے شخص کے لیے مختلف قسم کے دردناک عذابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تکبر بھی ایک ایسا ہی عمل ہے جس کو گناہ کبیرہ شمار کیا گیا ہے۔

تعریف: اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا تصور کرنا اور دوسروں پر اپنے آپ کو برتری دینے کا نام تکبر ہے۔ تکبر

خود پسندی اور عجب کا نتیجہ ہوتا ہے کہ پہلے انسان اپنے آپ کو اہمیت دیتا ہے اور پھر دوسروں کو اپنے مقابلے میں ہیچ و کم تر تصور کرنے لگتا ہے قرآن مجید اور روایات معصومینؑ میں اس گناہ کبیرہ کی شدید مذمت کی گئی ہے اور اس کے برے انجام کے بارے میں واضح الفاظ میں آگاہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْمُتَكَبِّرِينَ

کیا جہنم میں تکبر کرنے والوں کا ٹھکانہ نہیں ہے؟!

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ

دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ جہاں تم ہمیشہ رہو گے تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے۔[۲]

یہی وہ گناہ ہے جس کی وجہ سے شیطان کو کافر قرار دیا گیا اور وہ ہمیشہ کے لیے اللہ کی لعنت کا مستحق ٹھہرا۔

چنانچہ ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ

اس (شیطان) نے انکار اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔[۳]

اور اگر ہم روایات معصومینؑ کی طرف رجوع کریں تو بے شمار ایسی روایات ملتی ہیں جن میں اس فتیح عمل سے دور رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

''وہ شخص کبھی بھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر پایا جاتا ہو''۔

اسی سلسلے میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

''عزت و کبریائی اللہ تعالی کا لباس ہے جو اس میں سے کچھ بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا خدا اسے منہ کے بل دوزخ میں پھینک دے گا''۔

قیامت کے دن مغرور و متکبر لوگوں کی ذلت و خواری کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا فقط یہی فرمان ہی کافی ہے جس میں امامؑ سے مروی ہے کہ:

''قیامت کے دن متکبرین کو چیونٹیوں کی شکل میں محشور کیا جائے گا لوگ انہیں روندتے رہیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالی حساب سے فارغ ہو جائے گا''۔

اسباب تکبر

مختلف روایات اور احادیث مبارکہ میں تکبر کرنے کی مختلف وجوہات کو بیان کیا گیا ہے ہم یہاں پر چند اہم

وجوہات کومختصراً ذکر کریں گے۔تا کہ ان امور سے بچ کر اس مہلک گناہ میں مبتلا ہونے سے بچا جا سکے:

ا۔احساس کمتری: بعض اوقات انسان احساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے اور اپنے اس عیب کو چھپانے اور ذہنی طور پر پرسکون رہنے کے لیے تکبر کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

۲۔خود پسندی: جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ تکبر، خود پسندی اور عجب کے نتائج میں سے ہے۔

۳۔حسد: بعض اوقات انسان لوگوں سے حسد اور عناد کی وجہ سے ان کے سامنے خود کو بڑا اور قوی ظاہر کرتا ہے جس کے نتیجے میں وہ اس بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔

۴۔ریا: خلوص کی کمی اور لوگوں کے سامنے دکھاوے کی عادت بھی انسان کو مغرور بنا دیتی ہے۔

نقصانات

گذشتہ آیات و روایات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ تکبر کتنے بھیانک قسم کے نقصانات کا موجب بنتا ہے،ہم ان میں سے چند کو مختصر بیان کرتے ہیں:

ا۔متکبر شخص معاشرے میں اپنی قدر و منزلت کھو بیٹھتا ہے اور لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔

۲-لوگوں کی نفرت کی وجہ سے متکبر شخص تنہا رہ جاتا ہے اور اس کے دوست بہت کم ہوتے ہیں۔

۳۔تکبر لوگوں کے درمیان بغض و عناد کا موجب بنتا ہے۔

۴-تکبر کفران نعمت اور معصیت الٰہی کا موجب بنتا ہے۔

۵۔متکبر شخص اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

۶۔متکبر شخص چونکہ شیطان کی پیروی کرتا ہے لہٰذا وہ اس کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔

۷۔متکبر شخص کے دل پر اللہ تعالیٰ گمراہی کی مہر لگا دیتا ہے۔

معاشرے میں نخوت وتکبر

معاشرے میں عام طور پر کسی شخص کو اگر نوکری مل جاتی ہے، یا کسی طالب علم کو امتحان میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے یا کسی شخص کو ملک کی حکومت مل جاتی ہے، یا جب کوئی شخص اچھا کاریگر یا انجینئر بن جاتا ہے۔تو وہ اپنے اوپر زیادہ اعتماد کرنے لگتا ہے اور اپنے خدا پر بھروسہ نہیں کرتا۔

کبھی یہ اس کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے اور کبھی انسان خود سے کہتا ہے کہ مثلاً نوکری کا حاصل کرنا، یا طالب علم کا امتحان میں کامیاب ہونا یا اچھا کاریگر بننا وغیرہ یہ تمام کام میں نے خود اپنی محنت سے حاصل کئے ہیں۔اور خدا کی عنایت کو بھول جاتا ہے۔اگر کوئی غم آتا ہے یا کسی کاروبار میں نقصان ہوتا ہے یا انسان کو نوکری سے معطل کیا جاتا ہے۔ یا کوئی

حادثہ پیش آتا ہے تو فوراً انسان یہ کہتا ہے کہ یہ خدا کی مرضی تھی حالانکہ اگر کوئی شخص اچھا کام کرے تو اسے اس کی اچھائی اور کامیابی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دینی چاہیے یعنی یہ کہنا چاہیے کہ یہ کامیابی اللہ تعالی نے دی ہے اور جب کوئی نقصان ہو جائے تو انسان کو کہنا چاہیے کہ یہ نقصان میری کوتاہی کی وجہ سے ہوا ہے۔

نخوت اور تکبر کا ایک واقعہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ والی خراسان مطلب بن ابی صغرۃ ایک دن قیمتی لباس پہنے ہوئے تھا۔ اور لوگوں کے سامنے اکڑ اکڑ کر ساتھ چل رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ لوگوں کے سروں کو روندتے ہوئے جا رہا ہے۔ اسی اثنا میں ایک شخص اس کے سامنے آیا اور اس شخص نے مطلب بن ابی صغرہ کو کہا: اے عبداللہ! آپ کے اس طرح چلنے سے اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسولؐ ناراض ہوں گے۔ مطلب بن ابی صغرہ نے اس شخص کے جواب میں کہا: تجھ پر ویل ہو، کیا تو مجھے جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟ اس شخص نے کہا میں تجھے جانتا ہوں کہ تیری انتہا نجس مردار ہے اور ابتداء میں تو ہڈیوں اور گوشت سے بنا ہوا مجسمہ ہے۔ تیرا آغاز کمزور نطفے سے جبکہ تیرا خاتمہ بے قیمت ہے۔ اور تیری ساری زندگی اس خوراک کے سہارے ہے جو پاخانہ بن جاتی ہے۔ یہ رہا تیرا تعارف اب بتا تجھے کس پر تکبر ہے؟!

سبق 5

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

خالق کائنات نے انسان کو خلق کرنے کے بعد اس کو اسی طرح فضول اس دنیا میں نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کو اس دار ابتلاء میں زندگی گزارنے کے لیے بہترین نظام حیات بھی عطا کیا ہے۔ اور اس طریقہ حیات کو بتانے کے لیے اس نے تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو اس دنیا میں بھیجا تا کہ اس کے بتائے ہوئے راستہ کو احسن انداز سے اس کے بندوں تک پہنچایا جا سکے۔

اللہ تعالی نے انبیاء کے بعد یہ سلسلہ ان کے اوصیا کے ذریعہ جاری رکھا اور اس کے علاوہ امت محمدی کے ہر فرد پہ بھی یہ ضروری قرار دیا ہے کہ سب سے پہلے وہ خود اس طریقہ و روش کو سمجھے اور پھر اس کے بعد دوسروں کو بھی اسلامی طرز حیات کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کرے اسی عمل کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام سے جانا جاتا ہے۔

تعریف

''امر بالمعروف'' یعنی نیکیوں (اچھے کاموں) کا حکم دینا اور ان کی تلقین کرنا ''نہی عن المنکر'' یعنی برائیوں

(برے کاموں) سے روکنا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دین اسلام کے عظیم ترین واجبات میں سے ہیں جن کے ذریعے انسانی معاشرہ کی اصلاح ہوتی ہے۔فساد کی جڑیں اکھڑ جاتی ہیں۔اور معاشرہ تباہی سے محفوظ رہتا ہے۔جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ؕ

تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے خلق کیا گیا ہے کہ معروف (نیکیوں) کا حکم دیتے ہو اور منکر (برائیوں) سے روکتے ہو۔

اور پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت کے لیے فقط اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی سفارش کی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ یہ کام کرنے والے ہونے چاہئیں تا کہ تمہارا معاشرہ ایک الٰہی معاشرہ نظر آئے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝١٠٤

تم میں سے ایک ایسا گروہ ہونا چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دے اور نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

آیات مجیدہ کی طرح بہت سی احادیث مبارکہ بھی اس الٰہی فریضے کی اہمیت کو بیان کرتی ہیں اور کچھ روایات میں اس عمل کو انجام نہ دینے کی صورت میں معاشرے میں پیدا ہونے والے بگاڑ اور مصیبتوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے:

جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا پیغمبروں کی روش ہے اور صالحین کا راستہ ہے کہ جس کے ذریعے واجبات ادا ہوتے ہیں راستے پرامن ہوجاتے ہیں۔تجارتیں بحال ہوجاتی ہیں۔ظلم وستم ختم ہوجاتا ہے زمین آباد ہوجاتی ہے۔ظالموں سے انتقام لیا جاتا ہے اور امور منظم ہوجاتے ہیں۔

اسی طرح جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ

جس وقت میری امت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دے تو اسے خدا کے عذاب کا انتظار کرنا

چاہیے۔

ان آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ سے اس عظیم ترین واجبات کی وضاحت ہوتی ہے کہ جس کسی معاشرے میں برائیاں پھیل رہی ہو تو اس کا سبب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نہ ہونا ہے۔ اور یہ بھی واضح بات ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک خاص صنف (جیسے علماء) سے مخصوص نہیں ہے بلکہ امت کے ہر فرد پر لازم ہے کہ اس سلسلہ میں خدا کے واجب کیے ہوئے فریضہ کو پورا کریں۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوا ہے کہ نیکی کا حکم دینا یا برائی سے روکنا تب ممکن ہوگا کہ جب انسان خود نیکی اور برائی کی پہچان رکھتا ہو اسی وجہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دو مراحل ہیں:

ا۔ قلبی مرحلہ

یعنی ہر باایمان شخص کو چاہیے کہ وہ خود نیکیوں سے آشنا ہو اور ان سے مانوس ہو اور خود کو ان سے آراستہ کرے اور اس کے ساتھ ساتھ برائیوں کو بھی پہنچانے، ان سے نفرت کرے اور دل میں ان سے بیزاری اختیار کرے۔ برائیوں کا یہ قلبی انکار ہی نہی عن المنکر ہے جو کہ ہر انسان پر واجب ہے۔ لہٰذا جب کوئی نیک کام انجام دیتا ہے تو خوشحال ہوتا ہے اور کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو رنجیدہ اور شرمند ہوتا ہے خود کی سرزنش کرتا ہے۔

اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

''جو شخص نیک کام انجام دے کر خوش حال اور گناہ کا ارتکاب کر کے ناخوش ہو تو وہ مومن ہے''۔

ایسا شخص اگر دوسروں کو نیکی کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور اس سے مانوس ہوتا ہے اور اسے مبارک باد دیتا ہے اور جب دوسروں سے ناپسندیدہ کام دیکھتا ہے تو غمگین ہوتا ہے اور اس فعل اور اس فعل کے انجام دینے والے سے ناراض ہوتا ہے اور اپنے دل میں اس سے بیزاری اختیار کرتا ہے۔

۲۔ عملی مرحلہ

یعنی ان افراد کے ساتھ عملی اقدام کرنا جو معروف کو ترک کرتے ہیں اور برے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں تاکہ فرد اور معاشرے کی اصلاح کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے موثر قدم اٹھایا جائے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے واجب ہونے کا یہی مقصد ہے۔

مراتب

علماء نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے یہ تین مراحل ذکر کئے ہیں۔

ا۔ نیکی کو ترک اور برائی پر عمل کرنے والے شخص سے قلبی اظہار ناپسندیدگی کرنا۔

۲۔زبان سے اظہار ناپسندیدگی کرنا۔

۳۔ ہاتھ سے روکنا۔یعنی جسمانی سزا دینا تا کہ گناہگار گناہ سے بچ جائے مگر یہ مرتبہ فقط عادل مجتہد کی اجازت پر موقوف ہے۔

شرائط:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی چار شرطیں ہیں۔

ا۔ضروری ہے کہ نیکی کی دعوت دینے والا اور برائی سے روکنے والا یہ یقین رکھتا ہو کہ اس کا مخاطب جسے ترک کر رہا ہے وہ ضروریات دین میں سے ہے یعنی وہ ایسا کام ہے جسکے انجام دینے پر تمام مجتہدین متفق ہیں اور یا وہ عمل جسے بجالا رہا ہے اس کے ترک کرنے کا سب نے کہا ہے۔

۲۔نیکی کی دعوت دینے اور برائی سے روکنے کے اثر کا غالب گمان ہو اور اگر یقین ہو کہ مخاطب پر اس دعوت پر کوئی اثر نہیں ہو تو اس پر امر بالمعروف کرنا واجب نہیں ہے۔

۳۔نیکی کی دعوت اور برائی سے روکنے والے شخص یا کسی اور مسلمان کو اس عمل سے ضرر یا نقصان پہنچنے کا اور ضرر یا اندیشہ نہ ہو

۴۔نیکی کے ترک کرنے اور برائی کے انجام دینے پر وہ مصر ہو اور بار بار انجام دیتا ہو۔

اب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واضح ہو گئے اور اس کی اہمیت وضرورت بھی ہمارے لئے واضح ہو گئی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیسے انجام دیا جائے؟ تو جواب یقیناً یہ ہوگا کہ معصومین کی سیرت ہمارے لئے نمونہ عمل ہے۔جیسے کہ امام حسن اور امام حسین کا ایک واقعہ درج ذیل ہے۔

واقعہ:

ایک بوڑھا شخص وضو کرنے میں مصروف تھا لیکن وضو کو صحیح طور سے انجام نہیں دے رہا تھا۔امام حسنؑ اور امام حسینؑ (جو اس وقت بچے تھے) نے اس بوڑھے کے غلط وضو کو دیکھا اور اس بوڑھے کی رہنمائی کے لیے اسے اس طرح دعوت دی کہ ہم میں سے ہر ایک آپ کے سامنے وضو کر رہا ہے۔اور آپ منصف کے طور پر فیصلہ دیں کہ ہم میں سے کس کا وضو درست ہے؟ بوڑھے نے دونوں بچوں کے وضو کو دیکھنے کے بعد کہا کہ کا آپ دونوں کا وضو صحیح ہے اور میرا وضو باطل ہے۔

ان دو حضرات کی یہ نمائش ایک ماہرانہ اور غیر مستقیم تربیت تھی جس میں بوڑھے کی عزت و آبرو کے تحفظ کا پورا خیال رکھا گیا تھا اور یہ طریقہ امر بالمعروف کا بہترین طریقہ ہے۔

سبق6

ایک مفید ملاقات (غیبت)

سعید: السلام علیکم!

عامر: وعلیکم السلام

سعید: سناؤ، آج اسکول میں کیسا دن گزرا؟

عامر: عافیت رہی مگر آج کامران کو بہت ڈانٹ پڑی۔ اس کی عادتیں جو بہت بری ہیں اور وہ پورا دن شرارتوں اور گالی گلوچ میں ہی لگا رہتا ہے اور لڑائیاں بھی کرتا رہتا ہے۔

سعید: چھوڑو یار کسی کی غیبت کرنا اچھی بات نہیں ہوتی۔

عامر: لیکن میں تو اس کے بارے میں سچ ہی بتا رہا ہوں۔

سعید: یہی تو غیبت ہوتی ہے کہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کرنا جو اس میں پائی جاتی ہو۔ مگر وہ اپنے اس عیب کو سننا پسند نہ کرتا ہو اور اسے اس کے اظہار سے تکلیف ہوتی ہو۔ جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ: غیبت یہ ہے کہ تو اپنے دینی بھائی کا وہ عیب بیان کرے جسے خدا نے چھپا رکھا ہو''۔

عامر: اوہ! میں تو اس بات کی طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔

سعید: ہاں! اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ ہم لوگ اس گناہ کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے اور اس کو انجام دے کر نقصان اٹھاتے ہیں۔

عامر: یار غیبت کرنے کا کیا نقصان ہوتا ہے؟

سعید: قرآن مجید کی آیات اور روایات معصومینؑ میں غیبت کرنے کے بہت سے نقصانات بیان ہوئے ہیں۔

عامر: اچھا! قرآن مجید میں کیا کہا گیا ہے؟

سعید: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے غیبت کرنے کو اپنے مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ إِنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ.

ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا

گوشت کھائے؟ (حالانکہ) اس سے تم ضرور نفرت کروگے۔

اور یہی نہیں بلکہ اللہ تعالی نے غیبت کرنے والے کے لیے بہت سخت عذاب ہونے کی خبر دی ہے۔ جیسا کہ ارشادرب العزت ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

بے شک وہ لوگ جو یہ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان میں برائی کوفروغ ملے تو ان کے لیے دنیاو آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

عامر: اوراحادیث میں اس کے کیا نقصانات بیان ہوئے ہیں؟

سعید: غیبت کی مذمت اوراس کے نقصانات کو بیان کرنے کے لیے تو بہت سی روایات ملتی ہیں مگر جتنا مجھے یادآرہاہے میں فقط ان کا خلاصہ بیان کروں گا۔

عامر: چلوٹھیک ہے۔

سعید: روایات میں ہمیں ملتاہے:

ا۔غیبت کرنا کسی مردار کھانے سے بڑا گناہ ہے۔

۲۔روایات میں غیبت کو زنا سے بھی بڑا گناہ شمار کیا گیا ہے کیونکہ اگر زانی توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے مگر غیبت کرنے والے کی توبہ اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک وہ شخص اسے معاف نہ کرے کہ جس کی غیبت اس نے کی تھی۔ یعنی ایسے شخص کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی ہے۔

(عامر: اوہ اچھا!)

۳۔اورروایات میں غیبت کو جہنم کے کتوں کی غذا کہا گیا ہے تو یقینی بات ہے کہ غیبت کرنے والے کا ٹھکانہ بھی جہنم ہوگا۔

۴۔غیبت میں جب کوئی دوسروں کے رازوں کو فاش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کا پردہ چاک کردیتا ہے اور وہ دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہوتا ہے۔

۵۔اورغیبت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس عمل قبیح کو انجام دے کر انسان اللہ تعالیٰ اور معصومینؑ کو ناراض کرتا ہے اوران کی ناراضگی دنیاو آخرت میں خسارے کا باعث بنتی ہے۔

عامر: اچھا غیبت کرنا تو حرام ہے لیکن اگر کوئی شخص غیبت کررہا ہو تو کیا اس کو سن سکتے ہیں؟

سعید: جی نہیں، جس طرح غیبت کرنا حرام ہے اسی طرح غیبت سننا بھی حرام ہے۔ جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ غیبت سننے والا غیبت کرنے والے کے برابر ہے اور غیبت پر کان دھرنے والا غیبت کرنے والوں میں سے ہے''۔

عامر: کیا کوئی ایسا مقام بھی ہے جہاں غیبت کرنا جائز ہو؟

سعید: ہاں! چند ایک مقامات ہیں۔

۱۔ایسا شخص جو کھلم کھلا گناہ کرتا ہو اسکی غیبت جائز ہے۔

۲۔اسی طرح ظالم کے ظلم کو بیان کرنے کے لیے اس کی غیبت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر کوئی مشورہ طلب کرے اور کسی کے بارے میں رائے مانگے تو اس شخص کے عیوب کو بیان کیا جاسکتا ہے کہ جس کے بارے میں مشورہ مانگا گیا ہو۔

۴۔اور ایسے شخص کے عیبوں سے پردہ اٹھانا جو خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہو۔ اس کے علاوہ اگر معاشرے کی اصلاح کے لئے کسی کے عیوب بیان کرنا ضروری ہوں تو یہاں بھی درست ہے۔

عامر: بہت شکریہ سعید مگر ایک بات ہے اگر کسی میں کوئی برائی پائی جاتی ہو تو اس کو بیان کرنے کا اتنا عذاب ہے لیکن اگر کسی میں کوئی برائی نہ ہو اور اس کے باوجود اس کی طرف کسی برائی کی نسبت دی جائے تو؟

سعید: ہاں! یہ تہمت کہلاتی ہے۔ یہ غیبت سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور انسان کو ان مقامات سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ اصل بات یہ ہے کہ شریعت اسلام نے مومن کو بہت اہمیت دی ہے اور جب اسلام اس میں موجود عیوب کو فاش کرنے سے منع کرتا ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں کوئی ایسی بات برداشت کرے جو مومن میں اصلاً پائی ہی نہ جاتی ہو۔

عامر: ہاں یار! یہ تو ہے۔

سعید: ہاں! یاد رہے کہ انسان کو ایسے مقامات سے بھی گریز کرنا چاہیے جہاں اس پر تہمت لگ سکتی ہو۔

جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

''جو شخص تہمت کے مقام پر جائے تو پھر اس پر لگنے والے الزامات سے اس کو ملامت نہیں کرنا چاہیئے''۔

عامر: اچھا سعید! یہ چغل خوری کیا ہوتی ہے؟

سعید: ہاں! چغلی خوری یہ ہے کہ جب کوئی آپ سے کسی کے بارے میں کوئی بری بات کہتا ہے تو اگر آپ اس سے جا کر یہ کہیں کہ فلاں نے آپ کے بارے میں یہ کہا ہے تو یہ چغل خوری کہلائے گی۔

عامر: تو اس کا کیا نقصان ہوتا ہے؟

سعید: ویسے تو اس کے بہت سے نقصانات ہے مگر اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ دو مومن بھائیوں کے آپس میں تعلقات خراب ہو جاتے ہیں اور ان کی آپس میں دشمنی پیدا ہو جاتی ہے جس سے معاشرے میں فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے اور قرآن کریم میں فتنہ وفساد کو قتل سے زیادہ برا کہا گیا ہے لہٰذا ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ایسے اشخاص کے ساتھ کبھی دوستی نہ کریں۔

عامر: شکریہ دوست! آج آپ نے میری آنکھیں کھول دیں آئندہ میں کسی کی غیبت نہیں کروں گا۔ اور نہ ہی کسی پر تہمت لگاؤں گا اور ہمیشہ چغل خوری اور چغل خوروں سے بچوں گا۔

سعید: اللہ تعالیٰ ہمیں ان گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا کرے۔

عامر: آمین! خدا حافظ

سبق 7

غصہ اور گالی گلوچ

انسان کی بری عادتوں میں سے کچھ ایسی عادات بھی ہیں کہ جو انسان کی قدر و قیمت کسی دوسرے کے سامنے آشکار کر دیتی ہیں، ویسے تو ہر بری عادت انسان کو پست بنا دیتی ہے لیکن کچھ ایسی عادتیں ہیں کہ جن کا مرتکب ہونے کے باوجود بھی انسان دوسروں کے سامنے اعلیٰ کردار کا حامل شخص کہلاتا ہے جیسے کہ وہ افعال قبیحہ کہ جن کو چھپ کر انجام دیا جائے تو لوگ اس سے آگاہ نہیں ہوتے لیکن غصہ اور گالی گلوچ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتی ہیں۔

یہ فعل انسان کے فکری مقام کو واضح کر دیتا ہے۔ غصہ ایک آگ کے شعلے کی طرح ہے جو انسان کی حرارت و گرمی کو بڑھاتا ہے اور جس سے انسان کا خون کھولنے لگتا ہے اور اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے اس کے تمام امور غیر منظم ہو جاتے ہیں اور انسان فحش گوئی کرنے لگتا ہے اور اس کے ختم ہونے کے بعد انسان کو اکثر ندامت کا سامنا کرتا ہے۔ غصہ فقط کوئی وقتی بیماری نہیں ہے بلکہ آج کی میڈیکل سائنس نے اس کے دوررس مضر اثرات کو بھی بیان کیا ہے۔ اور اس سے انسانی دل پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ آج کل کی جدید سائنس کہتی ہے کہ زیادہ غصہ کرنیوالے افراد زیادہ تر ہارٹ اٹیک کا شکار ہوتے ہیں۔

غصہ بذات خود بہت بری چیز ہے بلکہ بعض اوقات اس کے نتائج اس سے بھی برے ہوتے ہیں اور انسان فحش گوئی کا اظہار کرتا ہے اور بہت سے غلط فیصلے کر بیٹھتا ہے تاہم غصہ کے انہیں برے نتائج کی وجہ سے معصومینؑ نے

اس کی پرزور مذمت کی ہے اور بے شمار روایات میں اس سے اجتناب کرنے اور اس کے عواقب سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔

چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ

''غصہ ایمان کو ایسے تباہ کر دیتا ہے جیسا کہ سرکہ شہد کو فاسد کر دیتا ہے''۔

اسی طرح منقول ہے کہ جب امام علی رضا علیہ السلام سے کسی نے دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل کرنے کے لیے مختصر ترین نصیحت چاہی تو آپؑ نے فرمایا کہ غصہ نہ کرو۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

''غصہ شیطانی آگ کا ایک انگارہ ہے جو آدمی کے دل میں سلگتا ہے جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اس کی آنتیں سرخ اور گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اس دوران شیطان اس کے اندر داخل ہو جاتا ہے لہٰذا تم سے جب کسی کو غصہ آنے لگے تو وہ زمین پر بیٹھ جائے کیونکہ اس صورت میں شیطانی وسوسہ دور ہو جاتا ہے''۔

نقصانات

غصہ بہت سے مضر اثرات رکھتا ہے کہ جس سے دنیا و آخرت میں غصہ کرنے والے کو سنگین نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۱۔ میڈیکل سائنس میں یہ بات مسلم ہے کہ غصہ بہت سی سنگین بیماریوں کا موجب بنتا ہے۔

۲۔ غصہ کے وقت چونکہ انسان کا دماغ کام نہیں کر رہا ہوتا ہے اس وجہ سے وہ کچھ ایسے کام سرانجام دے بیٹھتا ہے کہ جس پر بعد میں پچھتاوے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا ہے۔

۳۔ اس کی وجہ سے ایمان زائل ہو جاتا ہے۔

۴۔ غصہ کی وجہ سے بہت سے دیگر گناہان کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے جیسے گالی گلوچ یا بعض دفعہ انسان قتل تک کر بیٹھتا ہے اور اس سے دنیا و آخرت میں خسارہ اٹھاتا ہے۔

۵۔ غصہ کی وجہ سے انسان کو اکثر شرمندگی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

علاج

علماء اخلاق نے اس کے علاج کے لیے چند نکات ذکر کیے ہیں:

۱۔ جب غصہ آئے تو شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے اور کہے ''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم''۔

۲۔غصہ کرنیوالا جس حالت میں ہو اس حالت میں تبدیلی لائے، مثلا بیٹھا ہے تو کھڑا ہو جائے اور اگر کھڑا ہے تو چل پڑے اور جب غصہ آئے تو خاموش ہو جائے۔

۳۔جب غصہ آئے تو وضو کر لے یا پانی پی لے کیونکہ اس سے انسان کی گرمی کم ہوتی ہے۔ ۴۔انسان کو اس کے نقصانات اور اس سے بچنے کے فوائد کی طرف غور کرنا چاہیے کہ ایسے موارد سے بچنا چاہیے۔ جو اس کو غصہ دلاتے ہوں۔

ایسے موارد جہاں غصہ کرنا بہتر ہے

روایات میں چند ایسے مقامات کا ذکر ملتا ہے کہ جہاں پر غصہ کرنا اور غضب دکھانا مستحسن اور اچھا عمل شمار کیا جاتا ہے وہ موارد درج ذیل ہیں:

۱۔دین کی حمایت کے لیے غصہ کرنا خصوصاً جب دین کا مذاق اڑایا جا رہا ہو۔

۲۔خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہؑ کے دشمنوں سے جنگ و جدال میں غصہ کرنا۔

۳۔کمینے اور فاسق و فاجر کی اصلاح کے لیے غصہ کرنا۔

۴۔برے کاموں کے ارتکاب کرنے والے پر غصہ کرنا جب وہ تمہارے غصہ سے برے کاموں سے رک جائے۔

گالی گلوچ

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ گالی گلوچ اکثر طور پر غصہ کا نتیجہ ہوتا ہے اس قبیح عمل کے نتائج اس قدر برے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں اور ان کے معبودوں کو بھی گالیاں دینے سے منع فرمایا ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ

مشرکین کے خود ساختہ خداؤں کو گالیاں نہ دو، مبادا وہ نادانستگی میں تمہارے خدا کو گالی دیں۔

اسی طرح اگر ہم معصومینؑ کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ ہمیشہ انہوں نے دشمن کو گالی دینے سے منع فرمایا ہے اور اگر کوئی دشمن آکر ان حضرات کو گالی دیتا بھی تھا تو خاموش ہو جاتے اور خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ گالی گلوچ کی مذمت میں بہت سی روایات منقول ہیں کہ جن میں سے بعض کو ذکر کرتے ہیں:

۱۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

مومن کو گالیاں دینا ہلاکت اور بدبختی کا پیش خیمہ ہے۔

۲۔ایک اور مقام پر آپؐ نے فرمایا کہ:

خبردار لوگوں کو گالیاں نہ دو اس سے دشمنی جنم لیتی ہے۔

۳۔امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

جس نے گالی کی ابتداء کی وہ بڑا ظالم ہے۔

سبق 8

دعا

اللہ تعالیٰ نے انسان کو کمزور اور ناتوان خلق کیا ہے مگر یہ انسان ہے کہ جس کی خواہشات اور تمنائیں بہت زیادہ ہیں اور بعض اوقات اپنی ان خواہشات کی تکمیل کے لیے شریعت کی حد تک کو پھلانگ جاتا ہے اور کسی کی نہیں سنتا، بعض اوقات یہ دوسروں کے سامنے اپنی محرومی کا رونا روتا ہے اور ان سے مشکلات کے حل کے لیے التجا کرتا ہے اور کبھی کسی کے دروازے پر تو کبھی کسی کے دروازے پر سر رکھتا ہے اور اپنی محتاجی کا حل تلاش کرتا ہے۔انسان کی اس محتاجی کی حالت کے پیش نظر خداوند کریم یہ پسند کرتا ہے کہ انسان اپنی احتیاج اپنے مالک وخالق کے سامنے پیش کرے جس سے خدا تعالی کی ذات بہت خوش ہوتی ہے لہٰذا خداوند متعال کے سامنے اپنی حاجات کو پیش کرنے کا ایک ذریعہ دعا ہے۔دعا حقیقت میں خداوند متعال کے شکر وکرم کی انواع میں سے ہے۔یعنی شکر کی ایک قسم ہے اور ایک وسیلہ ہے کہ جو انسان کو خدا کے قریب کرتا ہے۔اور اس کی معرفت میں اضافہ کرتا ہے۔یہ وہ راستہ ہے کہ جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود دیا ہے کہ تم دوسروں کے سامنے اپنی ایڑیاں نہ رگڑو بلکہ اپنے رب سے مانگو کہ وہی تم پر سب سے زیادہ مہربان ہے اور رحم کرنے والا ہے۔چنانچہ ارشاد رب العزت ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝۶۰

اور تمہارا پروردگار فرماتا ہے: مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، جو لوگ از راہ تکبر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں یقیناً وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

اور اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ اگر تم دعا نہیں کرو گے اور اس کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاؤ گے تو اسے بھی تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہوگی اور وہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دے گا۔چنانچہ اسی سلسلے میں ارشاد رب العزت

ہے:

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا

کہہ دیجیے: اگر تمہاری دعائیں نہ ہوتی تو میرا رب تمہاری پرواہ ہی نہ کرتا، اب تم نے تکذیب کی ہے اس لیے (سزا) لازمی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن مجید میں یقین دلایا ہے کہ تم مانگو اور مطمئن ہو جاؤ کیونکہ اس نے دعا کو قبول کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ

اور جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق سوال کریں تو (کہہ دیں کہ) میں (ان سے) قریب ہوں دعا کرنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں، پس انہیں بھی چاہیے کہ وہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ راہ راست پر رہیں۔

اسی طرح اگر ہم سیرت وروایات معصومینؑ میں دیکھیں تو ان میں دعا کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور اس زمین پر سب سے محبوب ترین عمل دعا ہی کو قرار دیا گیا ہے اور اس کی تاثیر کے بارے میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ دعا موت کو ٹال دیتی ہے اس سلسلے میں ہم صرف چند روایات پر اکتفا کریں گے:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

''دعا مومن کا اسلحہ اور دین کا ستون ہے اور آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے''۔

اسی طرح پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہی مروی ہے کہ:

''دعا عبادت کا مغز (نچوڑ) ہے اور دعا کے ہوتے ہوئے کوئی شخص بھی ہلاکت میں نہیں پڑ سکتا''۔

اور حضرت علی علیہ السلام کی وصیت جو امام حسن علیہ السلام کے لیے تھی اس میں امامؑ نے دعا کے بارے میں بہت احسن انداز سے بتایا ہے کہ: ''یقین رکھو کہ جس کے قبضہ قدرت میں آسمان اور زمین کے خزانے ہیں اس نے تمہیں سوال کرنے کی اجازت دے رکھی ہے اور قبول کرنے کا ذمہ لیا ہے اور حکم دیا ہے کہ تم مانگو کہ وہ دے، رحم کی درخواست کرو تا کہ وہ رحم کرے، اور اس نے اپنے اور تمہارے درمیان کوئی دربان کھڑے نہیں کیے اور اس نے تمہارے ہاتھ میں اپنے خزانوں کو کھولنے والی کنجیاں دے رکھی ہیں اس طرح کہ تمہیں اپنی بارگاہ میں سوال کرنے کا طریقہ بتایا، اس طرح

کہ جب تم چاہو دعا کے ذریعہ اس کی نعمت کے دروازوں کو کھلوالو اور اس کی رحمت کے بادلوں کو برسالو‘‘۔

انسان کو اپنی ہر حاجت کے لیے خدا کو پکارنا چاہیئے حتی کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے خداوند عالم کے سامنے دست دراز کرنا اسے بہت پسند ہے۔

امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

اپنی چھوٹی حاجات کو حقیر مت سمجھو کیونکہ خدا کے پسندیدہ مؤمنین وہ ہیں جو ان کے بارے میں بھی خدا سے سوال کرتے ہیں۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جناب موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ

’’اے موسیٰ! مجھ سے ہر اس چیز کے بارے میں سوال کرو جس کی تمہیں احتیاج ہو یہاں تک کہ اپنی بھیڑ کے چارے اور اپنے آٹے (میں ڈالنے کے لئے) نمک کے بارے میں بھی احتیاج ہو تو مجھ سے مانگو‘‘۔

چونکہ دعا کرنا ایک عبادت الٰہی بھی ہے اور اس سے دنیا میں مسائل حل ہونے کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی درجات میں اضافہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ:

جنت میں دو شخص داخل ہوں گے جن کے اعمال بالکل ایک جیسے ہوں گے لیکن ایک کے درجات بلند ہوں گے تو دوسرا خداوند کریم سے سوال کرے گا کہ خدایا ہم دونوں کے ایک جیسے اعمال ہیں تو اس کا درجہ بلند کیوں ہے؟ تو جواب آئے گا یہ مجھ سے سوال (دعا) کرتا تھا جبکہ تو نہیں کرتا تھا۔

شرائط دعا

ہم اکثر لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ دعا کرتے ہیں مگر ان کی دعا قبول نہیں ہوتی تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتی ہیں اور ناامید اور مایوس ہو کر اس عبادت الٰہی سے منہ موڑ لیتے ہیں جب کہ معصومینؑ کے کلام سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دعا کی قبولیت کے لیے چند شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ چونکہ ہم لوگ ان کا خیال رکھے بغیر دعا کرتے ہیں تو درحقیقت وہ دعا ہی نہیں ہوتی ہے۔ ہم مختصراً دعا کی شرائط ذکر کرتے ہیں:

۱۔ اس کی معرفت ہونی چاہئے جس کو تم پکار رہے ہو۔

۲۔ دعا کے ساتھ عمل کا درست ہونا بھی ضروری ہے یعنی دعا کرنے والے کے لیے اطاعت گزار ہونا اور گناہوں سے پرہیز کرنے والا ہونا ضروری ہے۔

۳۔ قبولیت دعا کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ دعا کرنے والا رزق حلال کماتا ہو اور اسی سے اپنا پیٹ بھرتا ہو اور

مباح جگہ پر رہتا ہو اور اس نے کسی کا کوئی حق ضائع نہ کیا ہوا ہو۔

۴۔ دعا کرتے وقت حضور قلب کا ہونا ضروری ہے۔

۵۔ دعا کرتے وقت خدا سے قبولیت کی امید رکھنا اور مایوس نہ ہونا۔

۶۔ دعا کے وقت اپنے گناہوں کا اقرار کرے۔

۷۔ گریہ وزاری کے ساتھ دعا کرے۔

۸۔ دعا سے پہلے بسم اللہ پڑھے اور اللہ کی حمد وثنا بجالائے۔

۹۔ محمدؐ وآل محمدؐ پر دعا کے شروع میں اور آخر میں صلوات بھیجے اور دعا کے دوران ان ذوات مقدسہ کو خدا کے حضور وسیلہ قرار دے۔

۱۰۔ اللہ کے علاوہ باقی سب سے مایوس ہو کر تب تک دعا کرتا رہے جب تک دعا قبول نہیں ہو جاتی۔

۱۱۔ دعا اجتماعی صورت میں مانگی جائے۔

موانع اجابت

اگر تمام شرائط کے مطابق دعا مانگی جائے اور پھر وہ قبول نہ ہو تو اس کے لیے روایات میں چند موانع کا ذکر ہوا ہے کہ جن کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تا کہ دعا مرحلہ قبولیت تک پہنچ جائے۔ اور وہ موانع درج ذیل ہیں:

۱۔ بعض گناہوں کے بارے میں ملتا ہے کہ وہ دعا کے قبول ہونے میں مانع بنتے ہیں۔

۲۔ ظلم بھی موانع دعا میں شمار ہوتا ہے۔

۳۔ بعض اوقات حکمت الھیہ کی وجہ سے بھی تاخیر ہوتی ہے کیونکہ انسان بسا اوقات ایک چیز کو اپنے لیے فائدہ مند سمجھ رہا ہوتا ہے اور اس کی دعا کرتا ہے جب کہ خداوند کریم جانتا ہے کہ یہ اس کے لیے نقصان دہ ہے، لہٰذا اس کی استجابت میں تاخیر کرتا ہے یا پھر اگر قبول نہ بھی ہو تو اس کا اجر قیامت کے دن اس شخص کو ضرور ملے گا۔

۴۔ معاشرے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر دینا بھی دعا کو قبول ہونے سے روکتا ہے۔

۵۔ کسی حرام یا برے کام کے لیے کی گئی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔

سبق9

حسد

حسد ایک بدترین قلبی گناہ اور مہلک بیماری ہے اور دیگر گناہوں کی طرح اسے بھی مذموم قرار دیا گیا ہے کہ جسکی وجہ سے حضرت آدم کو جنت سے نکلنا پڑا کیونکہ شیطان نے ان سے حسد کیا تھا اور ان کو ورغلایا تھا اور پھر دنیا میں سب سے پہلا قتل یعنی، جناب ہابیل علیہ السلام کو بھی حسد کا نشانہ بننا پڑا۔ حسد دین و دنیا کی تباہی اور عذاب آخرت کا سبب ہے مجموعی طور پر اسلام کا فیصلہ یہی ہے کہ ہر حاسد فاسق ہے۔

تعریف

کوئی بھی شخص کسی دوسرے شخص کی نعمت کو دیکھ کر یا سن کر کہ مثلاً خدا نے کسی کو مال، اولاد، فضیلت، کمال، علم، شجاعت اور سخاوت عطا کی ہے تو وہ دکھ محسوس کرے اور اسے دوسرے کی نعمات اچھی نہ لگیں۔ اور اس شخص سے ان نعمات کے چھن جانے کی آرزو کرے تو اس حالت و کیفیت کو جو کسی کے دل میں پیدا ہوتی ہے حسد کا نام دیا گیا ہے۔

نوع انسان کے تمام افراد مرد وعورت امیر و غریب قوی اور کمزور سب میں حسد کی بیماری کا خطرہ موجود ہے۔ اس لیے ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حسد کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھے اور اس سے بچنے کی کوشش کرے۔ خداوند متعال نے اس کو بہت ناپسند فرمایا ہے اور جہاں سورہ فلق میں اللہ تعالیٰ نے چار قسم کی برائیوں کے شر سے بچنے کے لیے اپنی پناہ میں آنے کی تلقین کی ہے تو ان برائیوں میں سے ایک اسی حسد کو شمار کیا ہے۔ یعنی یہ اتنی مذموم اور مہلک برائی ہے کہ اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔

چنانچہ ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ

اور حاسد کے شر سے پناہ مانگتا ہوں) جب وہ حسد کرنے لگ جائے۔[1]

اور خداوند متعال نے قرآن مجید میں واضح طور پر یہ بیان کر دیا ہے کہ حسد کرنا کفار کا کام ہے۔

جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ

بہت سے اہل کتاب یہ جانتے ہیں کہ تمہیں بھی ایمان کے بعد کافر بنائیں وہ تم سے حسد رکھتے ہیں ورنہ حق ان پر واضح ہے۔

قران مجید کی طرح معصومینؑ کی ذوات مقدسہ (کہ جن کی پیروی کرنے کو ہم پر لازمی قرار دیا گیا ہے) نے بھی حسد کرنے کے بہت سے نقصانات کی طرف متوجہ کرایا ہے اور اس سے باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

''حسد ایمان کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑی کو کھا جاتی ہے''۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حاسد کا دل ہر وقت دوسرے شخص (محسود) کے حسد سے لبریز رہتا ہے۔ اور خدا و آخرت کی یاد سے غافل رہتا ہے۔ اس لیے وہ نور ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور اس کی دوسری خرابی یہ ہے کہ حسد کرنے والا شخص اپنے عیوب پر نظر نہیں کرتا ہے اور اپنے بے شمار گناہ یاد نہیں رکھتا اور وہ توبہ کی سعادت سے محروم رہتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

''کسی بھی شخص کے دل میں ایمان اور حسد دونوں ایک وقت میں جمع نہیں ہو سکتے''۔

حضرت معاذ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث منقول ہے:

نماز روزہ، جہاد، انسان کو آسمان تک لے جاتا ہے۔ اور جب ملائکہ یہ نیکیاں لے کر پانچویں آسمان پر پہنچتے ہیں۔ تو وہاں ایک فرشتہ بیٹھا ہوا ہے۔ جو حاسد کے عمل کو مسترد کر دیتا ہے اور عمل لانے والے فرشتوں سے کہتا ہے۔ اس عمل کو واپس کر دو یہ عمل مقبول نہیں ہے کیونکہ اس عمل کے بجالانے والا حاسد ہے۔

حسد اور اس کا اظہار دونوں حرام ہیں۔ فقہائے اسلام کا مشہور فتوی بھی ہے کہ حسد مطلق طور پر حرام ہے۔ یعنی حسد کا اظہار آنکھ، زبان یا کسی دوسرے اعضاء سے کیا جائے۔ اور اس سے اس شخص محسود (جس سے حسد کی جائے) کو اذیت پہنچائی جائے یا اس سے نعمت چھین لی جائے، دونوں کام حرام ہیں۔ آنکھ سے اظہار حسد اس طرح کیا جاتا ہے کہ کسی دوسرے کو تیز وتند اور غضبناک نگاہوں سے دیکھے اور زبان سے اس طرح ہوگا کہ مال کے چھن جانے پر اپنی خوشی کا اظہار کرے۔ یہ سب کام حسد کے دائرے میں شامل ہیں اور حرام ہیں۔

کیا یہ دنیا اس قابل ہے کہ اس سے حسد کیا جائے؟ اگر آپ دولت وحکومت کے حریص افراد کے حالات پر نظر کریں تو ان کی تمام داستان حیات آپ کو ایسے گھاس پھوس کی طرح دکھائی دے گی جو چند دن تک خوب سرسبز رہا پھر خشکی کی وجہ سے زرد ہوا اور آخر میں ریزہ ریزہ ہو گیا ہو۔ اسی طرح سے حکومت و دولت کے پجاریوں نے دنیا میں چند

دنوں تک خوب عیش وعشرت کی اور کئی دنوں تک خوب گھوڑے دوڑائے اور آخر کار مرکز پیوند خاک ہوگئے اور آج ان کی قبروں کے نشان تک باقی نہیں۔ جب دنیا کی حالت ایسی ہو کہ وہ صرف چندروزہ ہو اور اس کو چھوڑ کر آخرت کا سفر کرنا ہر ایک کے لیے یقینی ہو تو ان حالات میں یہ دنیا حسد کیے جانے کی قابل ہی نہیں ہے۔

نقصانات

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُخروی نقصانات اور گناہ کے علاوہ حاسد کو دنیا میں بھی نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں۔ہم یہاں پر صرف چند ایک کو بیان کریں گے:

ا۔ ہمیشہ کی تکلیف:

حاسد ہمیشہ اندرونی اذیت میں مبتلا رہتا ہے اور اسے ایک لمحہ کے لیے بھی آرام وسکون نصیب نہیں ہوتا ہے کیونکہ حاسد ہمیشہ دوسروں سے نعمت کے چھن جانے کا خواہشمند ہوتا ہے۔

۲۔حسد ابدی ناکامی ہے

حاسد کی ہمیشہ یہ آرزو رہتی ہے کہ لوگوں سے نعمتیں سلب ہوجائیں لیکن اس کی یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوتی کیوں کہ ہر شخص کے متعلق خدا نے جو کچھ اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ بہرصورت اسے مل کر ہی رہے گا۔ جب اس کو یہ نعمتیں ملیں گی تو حاسد کی آرزو اور زیادہ شدید ہوجائے گی۔ اور وہ اپنے اس کام میں ہمیشہ ناکام رہے گا اور اس سے وہ ہمیشہ مغموم رہتا ہے اور اندر ہی اندر کڑھتا رہتا ہے۔

۳۔جسمانی بیماری

ہر وقت کی اندرونی بے چینی حاسد کو کمزور اور نڈھال کر دیتی ہے۔ اور اس کا نظام انہضام خراب ہوجاتا ہے اور قوت مدافعت میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔ اور یوں وہ کئی مہلک جسمانی بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے۔

۴۔حاسد کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا ہے۔

۵۔حاسد شخص کے سابقہ اعمال بھی اس کے حسد کی وجہ سے زائل ہوجاتے ہیں۔

علاج

حسد کا علاج تقویت ایمان سے ممکن ہے اور تقویت ایمان کے لیے ضروری ہے کہ انسان یہ یقین رکھے کہ امارت وغربت، تندرستی اور بیماری اور موت اور حیات سب کچھ خدا کی طرف سے ہے اور ہر چیز خدا کی تدبیر و مصلحت کے تابع ہے جب انسان یہ عقیدہ رکھے گا تو اس کے ایمان کو تقویت ملے گی اور حسد کی بیماری بھی ختم ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ حسد کا عملی علاج یہ ہے کہ بدگمانی ترک کر کے ہمیشہ نیک گمانی کو اپنائے اور یہ کہ اگر کوئی شخص حسد کرنے والا ہو تو اس

کی محبت کوترک کرے کیونکہ حسد ایک متعدی بیماری ہے اور اگر کسی کے بارے میں حسد کا خیال شروع ہو جائے تو اپنے خیالات کا رخ حسد کی بجائے کائنات کے نظم ونسق اور موت وحیات کی طرف کرے یوں ایک شخص حسد کی بیماری سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

سبق 10

ضیاع وقت

اس دنیا میں ہر انسان عزت وکمال کا خواہاں ہے اور ہر ایک اس سعی وکوشش میں لگا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ کمال ورُتبہ حاصل کرے لیکن قانون قدرت کچھ ایسا ہے کہ جوجتنی محنت کرے گا وہ اس دنیا میں اتنا مقام پائے گا۔

جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے:

وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ

اور یہ کہ انسان کو صرف وہی ملتا ہے جس کی وہ سعی کرتا ہے۔

اسی لیے اگر ہم واقعی دنیا وآخرت میں عزت چاہتے ہیں تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت (وقت) کی قدر کرنی ہوگی اور اپنے وقت کا صحیح استعمال کرنا ہوگا اور اسے ضائع ہونے سے بچانا ہوگا کیونکہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور چپکے سے گزر جاتا ہے اور اس کے گزرنے کے بعد پچھتاوے کے علاوہ اور کوئی چیز ہاتھ نہیں آتی ہے۔

جیسے کہ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

اپنے فرصت کے اوقات سے فائدہ اٹھاؤ کیونکہ فرصت کے لمحے ایسے گزر جاتے ہیں جیسے بادل آتے اور گزر جاتے ہیں۔

لہٰذا اس مختصر سی زندگی میں جتنے بھی فارغ لمحات نصیب ہوں انہیں غنیمت جاننا چاہیے اور انہیں فضول اور لغو کاموں میں نہیں گزارنا چاہیے۔

اس لیے حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

مومن کی صفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے اوقات مشغول ہوتے ہیں۔

تعریف

غیر ضروری اور بے فائدہ کاموں میں وقت صرف کرنا ضیاع وقت کہلاتا ہے۔

ضیاع وقت دو طریقوں سے ممکن ہے

۱۔وہ کام جو شریعت میں ممنوع ہیں ان کو انجام دینا مثلاً گانا سننا یعنی حرام امور کا انجام دینا۔

۲۔وہ کام جن کی انسان کو ایک مخصوص حد تک ضرورت ہوتی ہے ان کو حد سے زیادہ انجام دینا۔مثلاً جسم کو تندرست رکھنے کے لیے ایک یا دو گھنٹے کی ورزش کی بجائے صبح و شام کھیل کود میں لگے رہنا۔اسی طرح جسم کے لیے چوبیس گھنٹوں میں سے پانچ سے چھ گھنٹوں کی نیند کافی ہوتی ہے تو اگر انسان پندرہ گھنٹے سوتا رہے تو یہ ضیاع وقت شمار ہوگا۔

یاد رہے کہ جو لوگ حرام کام کے ذریعے وقت کا ضیاع کرتے ہیں ان کو دو عذاب ملیں گے۔

۱۔حرام کام کے کرنے کا۔ ۲۔ضیاع وقت کا۔

وقت کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے ہمیں بہت سی ایسی روایات ملتی ہیں کہ جن میں ہمیں وقت کی قدر کرنے اور اس کے صحیح استعمال کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے جیسے حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ:

اے لوگو! تقوی اختیار کرو تمہیں فضول خلق نہیں کیا گیا ہے۔کہ تم وقت ضائع کرتے رہو اور نہ ہی تمہیں بے لگام چھوڑا گیا ہے کہ اپنی من مانی کرو۔

ایک اور مقام پہ حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

''ضیاع وقت حماقت اور بیوقوفی کی خوراک ہے''۔

اس روایت میں ضیاع وقت کو حماقت کی خوراک کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے نفس میں حماقت کا درخت لگا چکا ہے اور ضیاع وقت اس کی خوراک ہے۔جس کے ذریعے وہ درخت تناور ہو جاتا ہے۔اور نتیجہ میں وہ ضیاع وقت کی وجہ سے بیوقوف بن جاتا ہے۔

اسی طرح منقول ہے کہ:

''ضیاع وقت جہالت کا پھل ہے''۔

یعنی وقت کا ضائع کرنا انسان کے جاہل ہونے کی علامت ہے اور صرف وقت کی اہمیت سے جاہل شخص ہی اس کو فضول کاموں میں صرف کرتا ہے۔

اور ملتا ہے کہ ''سب سے بری زندگی وہ ہے جو فضول کاموں میں بسر ہو''۔

عام طور پر وقت کہاں ضائع ہوتا ہے؟

۱۔حد سے زیادہ سونا یا کھیل میں مشغول رہنا

۲۔بے فائدہ گپ شپ کرنا

۳۔ایسے امور میں مشغول رہنا کہ جن سے انسان کوکوئی دائمی فائدہ ملنے کی امید نہ ہو۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

''ہر دن ایک نئی زندگی ہے''۔

کیونکہ جودن گزر گیا وہ اب دوبارہ ہاتھ میں نہیں آئے گا اور مستقبل کا انسان کو بھروسہ نہیں ہے کہ آیا وہ آنے والا دن دیکھے گا یا نہیں دیکھے گا؟ پس ہر دن کو اہمیت دو اور اس کے ہر لمحہ سے جس قدر ممکن ہو فائدہ اٹھاؤ۔

امامؑ سے مروی ہے کہ:

جس نے ایک دن ضائع کر دیا وہ یقین رکھے کہ اس نے ایک زندگی ضائع کر دی، پس آنے والے دن کو اسی طرح اہمیت دو جیسے ایک زندگی کو اہمیت دیتے ہو۔جس نے وقت کی قدر ومنزلت کو جان لیا تو وہ ایک دن میں وہ کام بھی کرسکتا ہے جو اکثر لوگ ساری زندگی میں نہ کر سکے۔ پس اپنے وقت کو بچاؤ اور ہر ایک منٹ کو اتنی اہمیت دو جتنی تم ایک سال کو اہمیت دیتے ہو اور ایک منٹ کے گزر جانے پر اسی طرح فکر کرو جس طرح تم ایک سال کے گزرنے پر کرتے ہو۔ لہٰذا اپنی زندگی کا کوئی مختصر سا لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔

امام علی علیہ السلام سے ایک شعر منقول ہے کہ:

''ماضی ختم ہو چکا ہے اور مستقبل کس نے دیکھا؟ پس اٹھو اور کمر ہمت باندھ لو۔اور دو معدوم زمانوں (ماضی، واستقبال) کی درمیانی فرصت کو غنیمت سمجھو''۔

اس شعر میں امیر المومنین امام علی علیہ السلام گزرے وقت پر واویلا کرنے اور اسی کو سوچ سوچ کر وقت ضائع کرنے اور آئندہ زمانے پر امید رکھنے کو منع فرما رہے ہیں۔اور بتاتے ہیں کہ ماضی پر صرف پشیمانی کر کے مستقبل پر بھروسہ رکھ کر اپنے آپ کو برباد نہ کرو بلکہ زمانہ حال اور موجودہ لمحات کو غنیمت گردانتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھاو۔ پس صرف یہی سوچتے رہنا کہ ماضی میں کیا ہو چکا اور آئندہ کیا کرنا ہے درست نہیں بلکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ میں اس وقت کیا کر رہا ہوں۔البتہ گزشتہ سے عبرت لینا اور آئندہ کے لیے مقصد وہدف مقرر کرنا درست ہے اور اس سے منع نہیں فرمایا گیا ہے۔

سبق 11

توہین مؤمن

خداوند متعال نے جہاں انسان کو خلق کرنے کے بعد اسے دیگر نعمات سے نوازا ہے وہاں اس کو تشخص و عزت کی دولت بھی عطا کی ہے اسی وجہ سے اللہ تعالی کے نزدیک مومن کی بہت عزت و منزلت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں اپنی اور اپنے رسولؐ کی عزت کا تذکرہ کیا ہے وہیں پر مومن کا ذکر بھی کیا ہے:

وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ

عزت اللہ اور اس کے رسول اور مؤمنین کے لیے ہے۔

اور مومن کو یہ عزت کیوں نہ ملے جب اس کی سرپرستی اور سربراہی اللہ نے اپنے ذمے لی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا

اللہ مؤمنین کا سرپرست ہے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالی نے مومن کو تمام مخلوقات سے بہتر قرار دیا اور ارشاد فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے ہیں وہ تمام خلقت سے بہتر ہیں۔

اور یہ عزت و مقام کیوں نہ ہو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مومن کی خلقت کے بارے میں منقول ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے مومن کو اپنی جلالت اور قدرت کی عظمت سے پیدا کیا ہے''۔

اس کے علاوہ دیگر کئی ایسی روایات بھی موجود ہیں کہ جن میں مومن کے احترام وعزت کو خانہ کعبہ کے مقام و مرتبہ سے بلند قرار دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے کسی مومن کی توہین کرنے کو گناہ کبیرہ میں سے شمار کیا گیا ہے اور اس کی بہت کھلے لفظوں میں مذمت کی گئی ہے۔ روایات معصومین میں مومن کی توہین کو اللہ تعالی کی توہین شمار کیا گیا ہے۔

جیسا کہ رسول اکرم سے مروی ہے کہ:

جو کوئی اس (مؤمن) کی توہین کرے یا اس کی بات کو ٹھکرائے تو اس نے اللہ کی توہین کی اور اللہ کے فرمان کو ٹھکرایا ہے۔

شریعت محمدی میں بہت سے امور کو توہین مومن شمار کیا گیا ہے جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔مومن کی غیبت کرنا۔ ۲۔مومن کی عیب جوئی کرنا۔

۳-مومن کی سرزنش کرنا۔ ۴۔مومن کی آبروریزی کرنا۔

۵۔مومن کو حقیر سمجھنا۔ ۶۔مومن کی بات کو توجہ نہ دینا۔

۷۔مومن کو گالی دینا۔ ۸-مومن کو برے القاب سے پکارنا

۹۔مومن پر تہمت لگانا۔ ۱۰۔مومن کا مذاق اڑانا۔

۱۱۔یا ہر ایسا کام کرنا جس سے مومن کی توہین ہوتی ہو یا احترام میں کمی ہوتی ہو۔

یاد رہے ان تمام امور میں سے جو کام علیحدہ طور پر حرام شمار کیے جاتے ہیں ان امور کا گناہ کہیں زیادہ ہو جائے گا۔

معصومینؑ نے مومن کی عزت کے پیش نظر کسی مومن کو توہین سے بچانے کے لیے اس حرام عمل کے بہت بھیانک اثرات ذکر کیے ہیں۔جن میں سے ہم چند امور کو ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے:

۱۔مومن کی توہین، خداوند متعال کی توہین کا باعث بنتی ہے۔

۲۔اس حرام عمل کے نتیجے میں رشتہ ایمان ختم ہوجاتا ہے۔

۳۔اور اگر کوئی مومن سے دشمنی رکھے تو یہ اس کے کفر کا موجب بن سکتا ہے۔

۴۔توہین مومن اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔

۵۔اس عمل کی وجہ سے انسان کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا ہے۔

۶-اس برے عمل کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ہمیشہ توہین کرنے والے کی توہین کراتا رہتا ہے۔

۷۔توہین مومن کی وجہ سے خدا کے غضب کا شکار ہوتا ہے۔

۸ جو دنیا میں کسی مومن کی توہین کرتا ہے خداوند متعال قیامت کے دن اسے تمام مخلوقات کے سامنے ذلیل کرے گا۔

اور یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ یہ سب اثرات ونقصانات فقط ایک عام سے مومن بھائی کی توہین کرنے کے بیان ہوئے ہیں اسی طرح اگر وہ مومن کوئی زاہد، عابد یا پرہیزگار ہو تو اس کے گناہ اور عذاب میں بھی اضافہ ہوگا، اسی طرح اگر وہ مومن کوئی عالم یا دانشور ہو تو اس کی توہین کے نتیجے میں اس کے گناہ اور عقاب کی شدت اور بھی بڑھ جاتی ہے، کیونکہ مؤمنین میں سب سے افضل اور بہترین علماء کے طبقہ کو ہی شمار کیا گیا ہے۔اور آئمہ اہل بیتؑ کے فرامین میں بھی

اسی طرح ملتا ہے کہ نیک لوگوں میں سے بہترین لوگ نیک علماء ہیں۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ ''جس نے عالم کا احترام کیا اس نے میرا احترام کیا اور جس نے عالم کی توہین کی اس نے میری توہین کی۔''

مگر افسوس! کچھ ناسمجھ لوگ اپنے ذاتی مفادات کے لیے علماء کو برا بھلا کہتے ہیں اور علم دوست احباب سے بھی کنارہ کشی کرتے ہیں شاید رسول اکرم سے مروی یہ قول ہمارے ہی زمانے کے لیے ہے کہ عنقریب میری امت پر وہ وقت آئے گا جب وہ علماء سے یوں بھاگیں گے جیسے بکری بھیڑیے سے بھاگتی ہے''۔

پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقط اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کا نقصان بھی ذکر فرمایا کہ جب ایسا ہونے لگے کہ لوگ علماء کا احترام کھو بیٹھیں اور ان کی محفل سے دور رہنا شروع کر دیں گے تو خداوند کریم انہیں تین باتوں میں مبتلا کر دے گا۔

۱۔ان کے اموال سے برکت اٹھ جائے گی۔

۲۔ان پر ظالم حکمران مسلط ہو جائیں گے۔

۳۔اور جو ایسا کریں وہ بے دین ہو کر دنیا سے رخصت ہوں گے۔

پس اللہ تعالیٰ اور اس کے نمائندوں کے نزدیک مومن کا کتنا احترام ہے اور مومن کی توہین ہونے سے ان ہستیوں کو کتنی اذیت ہوتی ہے اس سب کو بیان کرنے کے لیے امام جعفر صادقؑ سے منقول صرف یہی ایک روایت ہی کافی ہے کہ:

جب کوئی مومن اپنے مومن بھائی کو ''اُف'' کہتا ہے تو ان کے درمیان ایمانی رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور اگر کوئی کسی مومن سے کہتا ہے کہ تو میرا دشمن ہے تو ان دونوں کے درمیان میں سے ایک کافر ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مومن بھائی کی آبرو برباد کرتا ہے اور اس کی توہین میں جلدی کرتا ہے تو خدا اس سے سخت نفرت کرتا ہے۔اور جو مومن بھائی کے لیے دل میں برائی کا ارادہ چھپائے ہوئے ہو تو اللہ تعالیٰ اس کا کوئی عمل قبول نہیں کرتا۔

پھر آپؑ سے مزید منقول ہے کہ:

اگر حجابات اٹھا دئے جائیں تو لوگوں کو خدا کے نزدیک مومن کا بہت بڑا مقام دکھائی دے گا جسے دیکھ کر ان کی گردنیں جھک جائیں گے اور لوگ مومن کی اطاعت کرنے لگ جائیں گے۔اور اگر لوگ مسترد شدہ اعمال کو دیکھ لیں تو یہ کہنے لگ جائیں کہ خدا سرے سے کسی عمل کو قبول ہی نہیں کرتا۔

واقعہ

علی ابن یقطین امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا ایک قابل اعتبار صحابی تھا اور امامؑ کی اجازت سے ہارون الرشید کا وزیر مقرر ہوا تھا۔ مگر ایک دفعہ ابراہیم جمال (جو کہ شیعہ تھا) دنیاوی تنگی کی وجہ سے علی سے ملنے گیا مگر علی نے اسے ملاقات کی اجازت نہ دی۔ اسی سال جب علی بن یقطین حج سے مشرف ہوا اور حج کے بعد مدینہ میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا تو حضرتؑ نے اسے ملاقات کے لیے وقت نہ دیا دوسرے دن علی نے گھر سے باہر امامؑ سے ملاقات کی اور اس بے اعتنائی کی وجہ پوچھی تو امامؑ نے اسے بتایا کہ کیونکہ تو نے اپنے بھائی ابراہیم جمال سے ملاقات نہیں کی اور اسے اپنے پاس نہیں آنے دیا اور خدا بھی انکار کرتا ہے کہ وہ تیری سعی کو قبول کرے مگر یہ کہ ابراہیم تجھے معاف کر دے۔

علی نے عرض کی کہ ابراہیم تو کوفہ میں ہے اور میں کیسے اس سے معذرت کروں تو امامؑ نے رات کے وقت اسے مختصر سے وقت میں کوفہ پہنچایا۔ علی نے ابراہیم کا دروازہ کھٹکھٹایا، ابراہیم نے پوچھا کون ہے؟

اس نے کہا: میں علی بن یقطین۔

ابراہیم پریشان ہوا مگر علی نے اسے ساری بات سمجھائی اور معافی کا طلب گار ہوا۔

ابراہیم نے کہا: کہ خدا آپ کو معاف کرے۔

پس علی نے اپنا چہرہ زمین پر رکھا اور ابراہیم کو قسم دی کہ اپنا پاؤں میرے چہرے پر رکھو اور میرے چہرے کو اپنے پاوں سے روندو۔ ابراہیم نے اپنا پاؤں علی کے چہرے پر رکھا اور اس کے چہرے کو اپنے پاؤں سے روندا تو علی نے کہا کہ اللھم اشھد یعنی خدایا! تو گواہ رہنا۔ پس علی مکان سے باہر آیا اور پھر مختصر وقت میں مدینہ آ گیا اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں جب اجازت چاہی تو اس وقت امامؑ نے اسے شرف ملاقات بخشا۔

لہٰذا ہمیں بھی کوشش کرنی چاہیے کہ ہم کسی مومن کی توہین کر کے اپنے وقت کے امام صاحب العصر والزمانؑ کی ناراضگی مول نہ لیں۔

سبق 12

ملاقات مومن (حصہ اوّل)

ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ و معصومینؑ کے نزدیک ایک مومن کی کیا اہمیت ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے مومن کو اتنی اہمیت وفضیلت وعطا کی ہے وہیں پر اس کے احترام واکرام کا بھی حکم دیا ہے اور چونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے اس لیے اسلام نے ہمیں مومن سے ملاقات کا سلیقہ بھی سکھایا ہے کہ کس طرح کسی مومن بھائی سے ملا جائے اور اس سے ملاقات کے وقت کن کن امور کو مدنظر رکھا جائے ہم اس سلسلے میں چند امور کو ذکر کریں گے۔

سلام

ہر قوم و معاشرہ کسی سے ملاقات کرتے وقت اپنے جذبات اور خوشی کا اظہار کرنے کے لیے گفتگو کے آغاز سے قبل کچھ خاص طریقے اپناتا ہے اور وہ لوگ مخصوص الفاظ استعمال کرتے ہیں اسلامی اخلاقیات، رسم ورواج میں بھی اس کام کے لیے بھی ایک دوسرے کو سلام کرنا، مصافحہ اور معانقہ (یعنی ایک دوسرے سے گلے ملنے کا حکم دیا گیا ہے)۔

قرآن مجید میں اس حکم کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ

اور جب تم کسی کے گھر میں داخل ہو تو اپنے آپ پر سلام کیا کرو اور اللہ کی طرف سے بابرکت اور پاکیزہ تحیت کے طور پر، اس طرح اللہ نشانیاں تمہارے لیے کھول کر بیان فرماتا ہے، شاید تم عقل سے کام لو۔!

اسی طرح کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ سلام کرنا اس کے منتخب انبیاء و مرسلین کا شیوہ ہے جیسے کہ جناب ابراہیمؑ کا اپنے چچا سے کلام کرنا ملتا ہے کہ:

قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ ۖ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا

ابراہیم نے کہا: آپ پر سلام ہو! میں آپ کے لیے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا یقیناً وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے۔

سلام کرنا خدا کو اتنا پسند ہے کہ اس کے مقرب فرشتوں نے بھی اس کو اپنایا ہے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ جب اللہ کے مقرب فرشتے جناب ابراہیم کی خدمت میں مہمان ہوئے تو:

وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ

اور جب ہمارے فرشتے بشارت لے کر ابراہیم کے پاس پہنچے تو کہنے لگے: سلام، ابراہیمؑ نے (جوابا) کہا: سلام۔

بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر خود اپنے بندوں پر سلام بھیجا ہے:

سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ

ابراہیم پر سلام ہو۔

سَلَامٌ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ

موسیٰ اور ہارون پر سلام ہو۔

سَلَامٌ عَلَىٰ إِلْ يَاسِينَ

آل یٰسین پر سلام ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

کیا تمہیں دنیا و آخرت کے بہترین اخلاق سے باخبر نہ کروں"؟ تو سب نے کہا کہ اے رسول اللہ! ضرور باخبر فرما دیجیے۔ تو آپؐ نے فرمایا: دنیا میں بلند آواز سے سلام کرنا۔

اسی طرح امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ:

"گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ ایک دوسرے کو سلام کرنا اور اچھی گفتگو کرنا بھی ہے"۔

اسی طرح ایک اور مقام پر مروی ہے کہ:

"سلام ہماری ملت کا تحفہ ہے اور ہماری طرف سے امان کی ضمانت ہے"۔

فوائد

اگر ہم سلام کے بارے میں وارد احادیث و روایات کا مطالعہ کریں تو اس مختصر اور آسان سے عمل کے بہت سے عظیم فوائد کا پتہ چلتا ہے۔ ہم یہاں چند فوائد کو مختصر ذکر کرتے ہیں:

۱۔ اگر کسی کو باہر راستہ میں سلام کیا جائے تو یہ نیکیوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

۲۔ اگر گھر میں داخل ہوتے وقت اہل خانہ کو سلام کیا جائے تو یہ گھر میں برکت کا موجب بنتا ہے۔

۳۔سلام موجب مغفرت ہے۔

۴۔سلام باعث حصول رضاء الٰہی ہے۔

۵۔سلام کرنے سے درجات میں اضافہ ہوتا ہے۔

۶۔سلام کرنا آپس میں تعلقات اور روابط کو تقویت دیتا ہے۔

۷۔سلام کی عادت سے انسان کے دوست اور غمخواروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔

آداب

روایات معصومینؑ میں سلام کرنے کے بہت سے آداب ذکر کئے گئے ہیں کہ جن کا خلاصہ کچھ اس طرح سے کیا جا سکتا ہے۔

ا۔چونکہ سلام کرنا ایک نیکی کا کام ہے اور نیکی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

فاستبقو الخیرات

تم نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت کرو،

لہٰذا مؤمنین کو سلام کرنے میں پہل کرنی چاہیے۔

۲۔سلام اور اس کا جواب دونوں اتنی بلند آواز میں ہوں تا کہ دونوں ایک دوسرے کی آواز کو سن سکیں۔

۳۔اپنی بات شروع کرنے سے پہلے سلام کرنا چاہیے کیونکہ رسول اکرم سے مروی ہے کہ جو سلام کے بغیر بات شروع کردے اس کی بات کا جواب نہ دو''۔

۴۔سلام کرنے کے لیے کسی عہدہ و عمر کی شرط نہیں ہے بلکہ جو بھی پہلے سلام کرے گا اسے زیادہ ثواب ملے گا اگرچہ روایات میں کچھ آداب ملتے ہیں کہ سوار پیدل کو، چھوٹا بڑے کو، کم تعداد والے اکثریت کو، کھڑا بیٹھے ہوئے کو، اور محفل میں آنے والا اہل محفل کو سلام کرے۔

۵۔سلام کا جواب سلام سے بہتر یا کم از کم اسی سلام کی طرح دیا جائے کہ جیسے سلام کیا گیا ہے۔

مصافحہ و معانقہ

مذہب اسلام میں سلام کے بعد مصافحہ و معانقہ (گلے ملنے) کی بہت اہمیت ہے۔اس سلسلے میں بہت سی روایات منقول ہے کہ ہم ان میں سے چند کے ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے:

رسول گرامی قدر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ: ایک دوسرے سے مصافحہ کرو کیونکہ مصافحہ آپس میں موجود کینہ و بغض کو ختم کر دیتا ہے۔

حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ: ''جب تم برادر ایمانی سے ملاقات کرو، تو مصافحہ کرو، نیز تقسیم اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملو اس کے بعد جب تم ایک دوسرے سے جدا ہو گے تو تمہارے ذمہ کوئی گناہ نہ رہ جائے گا''۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ: جب بھی تم آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کرو تو ایک دوسرے کو سلام کرو اور آپس میں مصافحہ کرو اور جب جدا ہونے لگو تو ایک دوسرے سے طلب مغفرت کرتے ہوئے جدا ہو جاؤ۔

اسی طرح امام صادق سے منقول ہے کہ: جب مؤمنین گلے ملتے ہیں تو رحمت الٰہی انہیں ڈھانپ لیتی ہے۔

اور مختلف روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ اگر کسی مسافر سے ملو تو اس سے معانقہ کرو اور اگر کسی مقیم شخص و ساتھی سے ملاقات ہو جائے تو اس کے ساتھ مصافحہ کرو۔

جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ: کسی مقیم شخص کے لئے کامل استقبال کرنا یہ ہے کہ اس سے مصافحہ کیا جائے اور کسی مسافر کے سلام کو مکمل کرنا ہو تو اس سے معانقہ کرو۔

اسی طرح کی بہت سی احادیث میں مصافحہ کرنے اور گلے ملنے کو ایک اچھا اور نیک عمل شمار کیا گیا ہے۔ اور ان کو مؤمنین کے آپس میں پیار و محبت کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ رضائے الٰہی کے حصول کا باعث بھی کہا ہے۔

سبق 13

ملاقات مومن (حصہ دوم)

عیادت

ایک مومن کا دوسرے مومن پر یہ بھی حق ہے کہ جب بھی اس کا کوئی مومن بھائی مریض ہو تو اس کی بیمار پرسی اور عیادت کے لیے ضرور جائے۔ ویسے تو مومن کی عیادت کے بارے میں بہت سی روایات ملتی ہیں کہ جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ

''ایک مسلمان کا دوسرے پر یہ حق ہے کہ جب اس سے ملاقات کرے تو اسے سلام کرے، اگر مریض ہو جائے تو اس کی عیادت کر دے، اور اگر دنیا سے رحلت کر جائے تو اس کی تشییع جنازہ میں شریک ہو''۔

اسی طرح حضرت علی علیہ السلام نے جہاں ایک مومن کے تیس حقوق کو بیان فرمایا ہے تو ان میں سے ایک یہ بھی بتایا ہے کہ ''جب وہ مریض ہو جائے تو اس کی عیادت کرے اور اس کی مزاج پرسی کرے''۔

فوائد

اس کے علاوہ کئی روایات میں مومن کی عیادت کرنے پر تاکید کی گئی ہے اور اس کے بہت سے فوائد ذکر کئے

گئے ہیں۔ جن کو ہم بعض کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ا۔عیادت کرنا اللہ تعالی کی رضا حاصل کرنے کے مترادف ہے چنانچہ رسول اکرمؐ سے مروی ہے کہ ''جب کوئی مسلمان اپنے مریض مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم پاک و پاکیزہ رہو اور تمہارا راستہ بھی صاف ستھرا ہے تم نے جنت میں اپنے لیے ایک گھر بنالیا ہے''۔

۲۔فرشتے اس شخص کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں۔ حدیث مبارک میں ہے کہ جب کوئی مردِ مومن کسی مریض کی عیادت کے لیے صبح کو جاتا ہے تو ستر ہزار فرشتے اس کے ساتھ چلتے ہیں اور جب وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہے تو رحمت الٰہی اسے گھیر لیتی ہے اور یہ فرشتے اس کے لیے شام تک استغفار کرتے رہتے ہیں اور اگر شام کے وقت وہ عیادت کرتا ہے تو صبح تک یہی صورت حال رہتی ہے۔

۳۔خداوند متعال قیامت کے دن اس شخص سے شکایت کرے گا کہ جو اپنے مومن بھائی کی عیادت نہ کرے اور فرمائے گا کہ ''میرے عزت وجلال کی قسم! اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے نزدیک ہی پاتا اور میں تیری حاجت کا ضامن ہوتا اور تیرے لیے ان کو پورا کرتا''۔

۴۔موت کے بعد سے قیامت تک کا عرصہ آسانی سے گزرتا ہے جب حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالی سے سوال کیا کہ ''پروردگار! مریض کی عیادت کرنے والے کا کیا ثواب ہے؟ تو پروردگار عالم نے جواب دیا: میں اس کے لیے ایک فرشتہ معین کرتا ہوں جو قبر سے محشر تک اس کی عیادت کرتا رہے گا۔

۵۔عیادت کی وجہ سے انسان کی اپنی حاجات قبول ہوتی ہیں جیسا کہ امام صادق سے منقول ہے کہ ''جو شخص خدا کی خوشنودی کے لیے کسی مریض کی عیادت کرتا ہے اور مریض اس کے لیے کوئی دعا کرتا ہے تو خداوند عالم اسے ضرور قبول کرتا ہے''۔

۶۔عیادت کرنے سے مؤمنوں کے درمیان رشتہ الفت مزید گہرا ہوتا ہے۔

۷۔عیادت کے سبب جنت میں جگہ ملتی ہے۔

شریعت مقدسہ میں ان فوائد وتشویق پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ عیادت کرنے کے آداب وطریقے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ کہ کس طرح کسی مومن مریض کی عیادت کی جائے؟ ان آداب میں سے اہم طور وطریقے یہ ہیں۔

ا۔عیادت کے لیے جاتے وقت مریض کے لیے کوئی ہدیہ لے جایا جائے تا کہ اس سے مریض کا دل خوش ہو۔

۲۔عیادت کا دوسرا ادب یہ ہے کہ مریض کے پاس زیادہ دیر تک نہ بیٹھے۔ کیونکہ مریض عام طور پر درد و

تکلیف سے دو چار ہوتا ہے اور اسے آرام کی سخت ضرورت ہوتی ہے اسی لیے اتنی زیادہ دیر نہ بیٹھا جائے کہ اسے تھکان ہونے لگے۔اسی وجہ سے رسول اکرم سے منقول ہے کہ ''بہترین عیادت وہ ہے جو بالکل مختصر ہو''۔

۳۔مریض کی مزاج پرسی کرے اور اس کی صحت وسلامتی کے لیے دعا کی جائے۔

۴۔مریض کو تسلی دینا اور اس کے ارادہ ونفسیات کو مضبوط کرنا بھی عیادت کا ایک رکن شمار کیا جاتا ہے۔

۵۔مریض کی عیادت کرتے وقت مریض سے یا اس کے اہل خانہ سے اپنی مہمانداری و پذیرائی کی امید نہ رکھے اور جہاں تک ممکن ہو انہیں اس کام سے منع کرے۔

۳۔ضیافت وزیارت

شریعت اسلام نے معاشرت اسلامی کے آداب میں سے ایک ادب یہ بھی بیان کیا ہے کہ مؤمنین باقاعدہ طور پر ایک دوسرے سے مربوط رہیں اور ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے رہیں تاکہ اس عمل کے ذریعے ان کے آپس میں پیار ومحبت کا رشتہ برقرار رہنے کے ساتھ ساتھ مزید پروان چڑھے اور اگر ان میں سے کوئی کسی مسئلہ و مصیبت کا شکار ہو تو ان ملاقاتوں کے ذریعے دوسرے مؤمنین اس کی پریشانی سے آگاہ ہو سکیں اور اس کے مسئلہ کو حد الامکان حل کرنے کی سعی وکوشش کریں۔

اس معاشرتی مسئلہ کی تشویق کے لیے معصومینؑ کی متعدد روایات موجود ہیں کہ جن میں اس سادہ اور آسان عمل کے بہت سے فوائد بیان ہوئے ہیں۔چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ

''جب کوئی مومن بغیر کسی کام کے اپنے مومن بھائی کے گھر جا کر اس کی زیارت کرتا ہے۔تو اس کا نام اللہ تعالی کے زائرین میں لکھ دیا جاتا ہے۔اور پھر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے''۔

اسی طرح آپؐ سے ایک اور مقام پر مروی ہے کہ جب کوئی اپنے مومن بھائی کے گھر جا کر اس کی زیارت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو میرا مہمان اور میرا زائر ہے پس اب تیری خاطرداری میرے ذمہ ہے اور تیری اپنے بھائی کے ساتھ اس محبت کی وجہ سے میں نے تیرے لیے جنت واجب قرار دے دی ہے۔

اسی ذیل میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

جو اللہ کے لیے کسی مومن بھائی کی زیارت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو نے میری زیارت کی اور اس کا ثواب دینا بھی میرے اوپر ہے اور میں تجھے جنت سے کم کوئی اور ثواب دینے پر راضی نہیں ہوں۔

اسی وجہ سے ہمارے معاشرے میں مہمان کو رحمت الٰہی کہا جاتا ہے اور اس کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں کہ جن کو مختصر یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔مؤمنین کے درمیان الفت ومحبت میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲۔گھر میں مہمان آنے سے ملائکہ الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔

۳۔گھر کی خیروبرکت میں اضافہ ہوتا ہے۔

۴۔رضاء وخوشنودی الٰہی میزبان ومہمان دونوں کا مقدر بنتی ہے۔

۵۔جب مہمان گھر میں آتا ہے تو اپنا رزق لے کر آتا ہے اور جب گھر سے جاتا ہے تو اہل خانہ کے گناہوں کو باہر پھینک جاتا ہے۔

شریعت مقدسہ اسلام نے جہاں اس عمل کو اتنی اہمیت دی ہے وہاں ضیافت کے آداب کا بھی ذکر کیا ہے۔ان میں سے کچھ آداب میزبان سے متعلق اور کچھ مہمان کے بارے میں ہیں۔جو کہ مختصراً اِس طرح ہیں:

۱۔ضیافت میں اسلامی اقدار وتہذیب کو ملحوظ رکھا جائے اور دعوت دیتے وقت خیال کیا جائے کہ باعمل اور باایمان افراد کو مدعو کیا جائے۔

۲۔دعوت کو قبول کرنے میں کسی کی امیری اور غریبی کو نہ دیکھا جائے اور اگر کوئی مومن بھائی دعوت دے تو اسے فوراً قبول کرلینا چاہیے۔

۳۔مہمان جس وقت دعوت میں پہنچے تو جس مقام پر بھی بیٹھنے کی جگہ ملے بیٹھ جائے اور لوگوں کو پھلانگ کر صدرمجلس تک جانے کی کوشش نہ کرے۔

۴۔میزبان کے لیے ضروری ہے کہ دسترخوان پر تمام ضروری سامان خود مہیا کرے تا کہ مہمان کو تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔

۵۔میزبان اس ضیافت کی وجہ سے اپنے اہل خانہ کو مشقت میں نہ ڈالے۔

۶۔ضیافت کی ابتدا میں سب سے پہلے میزبان خود کھانا شروع کرے اور سب سے آخر میں ختم کرے تا کہ اس کے ہاتھ کھینچ لینے کی وجہ سے کوئی مہمان حیا کر کے کھانے سے ہاتھ نہ اٹھالے۔

خلاصہ:

جہاں شریعت مقدسہ اسلام نے مومن کو اتنی اہمیت ومقام عطا کیا ہے وہیں اس دین نے اسے ملاقات کے آداب اور اس کو خوش رکھنے کے طور طریقے بھی بیان کیے ہیں۔اور ان آداب وطریقوں کو مومن کا ضروری حق قرار دیا ہے۔اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے مومن بھائیوں کے ان حقوق کو صحیح طرح ادا کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

آمین

سبق 14

صلہ رحمی

اسلام نے جن معاشرتی اور سماجی حقوق کی تاکید کی ہے اور مسلمانوں کو ان کی پابندی کا حکم دیا ہے ان میں سے ایک اپنے اعزاء واقرباء اور رشتہ داروں کے ساتھ ہمیشہ اچھے اور بہترین روابط قائم رکھنا ہے، اور اسی کو صلہ رحمی کہتے ہیں۔

لہٰذا ایک مسلمان ومومن کے لیے ضروری ہے کہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے ملاقات کرتا رہے اور ان کی مزاج پرسی کرے اور ہمیشہ ان سے اچھے تعلقات رکھے۔ اگر رشتہ دار غریب ہو یا کسی مشکل کا شکار ہوں تو ان کی مدد کرے۔ نیکی اور اچھے کاموں میں ان کے ساتھ تعاون کرے۔ اگر ان پہ کوئی مصیبت آپڑے تو اس مصیبت میں ان کا شریک ہوجائے۔ اور اگر کبھی ان کی طرف سے کوئی غلط رویہ یا ناروا سلوک دیکھے تو بہت احسن اور خوبصورت طریقے سے انہیں نصیحت کرے۔

چونکہ خاندان اور رشتہ دار ہر انسان کے پشت پناہ ہوتے ہیں یعنی اگر کبھی کوئی مصیبت یا افتاد انسان پر آپڑے تو اس کی نگاہیں اہل خاندان کی طرف ہی جاتی ہیں۔ اسی لیے ان کا حق بھی زیادہ اور بہت عظیم قرار دیا گیا۔

روایات میں صلہ رحمی کرنے کی زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ اور اس معاشرتی مسئلہ کی اہمیت کو روز روشن کی طرح عیاں کیا ہے نمونہ کے لیے چند روایات ملاحظہ ہوں کہ کس طرح اس فریضہ کو دین اسلام کا جز قرار لاینفک دیا گیا ہے۔ جناب رسول اکرمؐ سے مروی ہے کہ ''میں اپنی امت کے موجود اور غیر موجود حتیٰ کہ مردوں کے صلبوں اور عورتوں کے ارحام میں موجود اور قیامت تک آنے والے شخص کو وصیت کرتا ہوں کہ اپنے اعزاء واقرباء کے ساتھ صلہ رحمی کرے چاہے وہ ایک سال کی (پیدل مسافت) کے فاصلے پر کیوں نہ رہتے ہوں۔ کیونکہ یہ دین کا حصہ ہے۔ جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ''اپنے اعزاء واقرباء سے صلہ رحمی کرو چاہے وہ تم سے قطع تعلق کرلیں۔

اسلام چونکہ ایک سہل اور آسان ترین طریقہ حیات ہے اور اللہ تعالی نے انسان پر کوئی ایسا کام ضروری قرار نہیں دیا کہ جس کو انجام دینے کی طاقت اس میں نہ ہو اس لیے صلہ رحمی کے بھی بہت سے مرحلے بیان ہوئے ہیں کہ جو جس حد تک یہ فریضہ آسانی سے انجام نہ دے سکتا ہو اتنا انجام دے۔ چنانچہ رسول اکرمؐ سے منقول ہے کہ ''اپنے اعزاء و اقرباء سے صلہ رحمی کرو چاہے ایک گھونٹ پانی کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو اور صلہ رحمی کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ

اپنے رشتہ داروں کو اذیت نہ دی جائے''۔اور آپؐ سے ہی منقول ہے کہ ''اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرو چاہے (ان کو) سلام (کرنے) کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو''۔

مذکورہ احادیث سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ اچھے تعلقات اور روابط کے استحکام میں صلہ رحمی کا بہت اہم کردار ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کسی سے دوری کی بناء پر اس سے ملاقات نہ کرسکیں لیکن ٹیلفون یا موبائل پر اس سے رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ یا اس کے نام ایک خط ہی آپ کی طرف سے اظہار محبت اور صلہ رحمی کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔

صلہ رحمی کے فوائد

جہاں شریعت مقدسہ اسلام میں صلہ رحمی کی تاکید کی گئی ہے اور اس کو انجام دینے کے لیے اتنی زیادہ اخبار و احادیث وارد ہوئی ہیں وہیں اس ''صلہ رحمی کے بہت سے دنیاوی اور اخروی فوائد کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو فقط وہی کام انجام دینے کا حکم دیتا ہے کہ جس میں لوگوں کی بھلائی اور ان کے لیے فائدہ موجود ہو۔ مختلف روایات میں صلہ رحمی کے یہ فوائد ذکر کئے گئے ہیں۔

۱۔ صلہ رحمی کرنا اللہ تعالی کو بہت پسند ہے تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ صلہ رحمی کرنے سے جہاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوگی اور اس کا ثواب ملے گا وہیں پر اللہ تعالیٰ کی رضایت وخوشنودی بھی حاصل ہوگی۔

۲۔ بہت سی روایات سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ صلہ رحمی سے انسان کی عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ علماء اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مختلف قسم کی خاندانی پریشانیاں اور ناراحتی انسان کا جینا دشوار کردیتی ہے کہ جس کی وجہ سے انسان جلدی مختلف بیماریوں کا شکار ہوکر مرجاتا ہے مگر صلہ رحمی کی وجہ سے کیونکہ یہ اصل وجہ اور جڑ مضبوط ہوتی ہے لہٰذا انسان پرسکون اور لمبی عمر گزارتا ہے۔

۳۔ روایات معصومینؑ سے معلوم ہوتا ہے کہ صلہ رحمی کے نتیجہ میں انسان سکرات موت اور شدائد موت سے محفوظ ہوجاتا ہے اور موت کی سختی بہت کم ہوجاتی ہے۔

۴۔ صلہ رحمی فقر محتاجی سے مستغنی کردیتی ہے اور کیوں نہ ہو جب اتنے زیادہ چاہنے والے اور خیال رکھنے والے موجود ہوں تو کوئی کیسے محتاج وفقیر ہوسکتا ہے۔

۵۔ صلہ رحمی کی وجہ سے رزق میں اضافہ اور برکت ہوتی ہے۔ پس جو وافر رزق چاہتا ہو اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔

۶۔ صلہ رحمی کے نتیجے میں انسان کی جان و مال محفوظ رہتے ہیں اور خاندان کی پشت پناہی کی وجہ سے لوگ انسان سے جھگڑا کرنے اور اسے نقصان پہنچانے سے گریز کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے فوائد کتب اخلاق واحادیث میں ذکر ہوئے ہیں مگر ہم اختصار کی وجہ سے صرف انہیں پر اکتفا کرتے ہیں۔

قطع رحمی

ہمیں بخوبی معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے مذہب میں صلہ رحمی کی کیا اہمیت ہے لہٰذا یہ جاننا بھی مناسب ہوگا کہ اپنے عزیز ورشتہ داروں سے تعلقات توڑ لینے کے بعد انسان کو کتنے بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔قطع رحمی اپنے عزیز واقارب سے تعلقات ومراسم توڑ لینے کا نام ہے۔اور اس کی مذہب اسلام میں بہت مذمت کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد رب العزت ہے کہ:

اَلَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَسِرُونَ

جو خدا کے ساتھ مضبوط عہد کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں اور جسے خدا نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹ دیتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقتاً خسارہ والے ہیں۔

اس آیت مجیدہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قطع رحمی کرنے والا اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے والا اور زمین پر فساد پھیلانے والے کے برابر ومساوی ہیں اور آپس میں تعلقات کو توڑنے کے بعد اللہ تعالی سے کسی قسم کی سعادت اور نجات کی امید فضول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیشہ بھائی چارے اور پیار ومحبت کا حکم دیا ہے۔

قطع رحمی کے نقصانات

مختلف روایات میں جہاں صلہ رحمی کے فوائد کا ذکر ہوا ہے وہیں قطع رحمی کی مذمت اور اس کے بہت سے نقصانات کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔جن کا خلاصہ کچھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔جو قوم قطع رحمی کو رواج دیتی ہے یا ان میں سے کوئی ایک فرد بھی قطع رحمی کرتا ہے تو ان سب پر رحمت الٰہی نازل نہیں ہوسکتی۔

۲۔قطع رحمی کرنے والا جنت کی خوشبو (کہ جو ہزار سال کی مسافت سے سونگھی جاسکے گی) تک نہیں سونگھ سکے گا۔

۳۔قطع رحمی کے نتیجے میں انسان کی عمر گھٹ جاتی ہے۔

۴۔اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس قوم پر نازل نہیں ہوتے کہ جن میں سے کوئی ایک قطع رحمی کرنے والا ہو۔

۵۔اللہ تعالیٰ قاطع رحم کو اس دنیا میں بھی دے گا اور آخرت میں بھی۔

۶۔قاطع رحم کا ٹھکانہ جہنم ہے اور بے شک یہ بہت برا مسکن ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں صلہ رحمی اختیار کرنے اور قطع رحمی اور اس کے مہلک نتائج سے بچنے کی توفیق عنایت فرمائے۔(آمین)

سبق 15

بخل و اسراف

شریعت مقدسہ اسلام انسان کی ہر قدم پر ہدایت و راہنمائی کرتی ہے اور اسے ہر شعبہ حیات میں ایسی روش دیتی ہے کہ جس کو اپنانے سے اس کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رزق اپنے ذمہ لیا ہے اور انسان کے ذمے اس کے لیے سعی و کوشش کرنا رکھا ہے اور اس رزق کو صحیح استعمال کرنے کا طریقہ و سلیقہ بھی بتایا ہے کہ جو مال تمہیں عطا کیا جائے اسے کیسے اور کہاں استعمال کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نہ تو مال کو خرچ کرنے سے منع فرماتا ہے اور نہ ہی اسے بے دریغ ضائع کرنے پر راضی ہوتا ہے۔ بلکہ احکام شریعت کے مطابق مال خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے کہ جتنا ضرورت ہو اس کو خرچ کرو اور اس میانہ روی کی بہت زیادہ تاکید اور فضیلت بیان کی گئی ہے۔اگر چہ ہر کام میں میانہ روی اچھا عمل ہے مگر خصوصا مال کو خرچ کرنے کے سلسلے میں اس کی بہت تاکید کی گئی ہے۔جیسا کہ امام صادق فرماتے ہیں کہ

''جو میانہ روی اختیار کرے میں اس کے فقیر نہ ہونے کی ضمانت دیتا ہوں''۔

جو میانہ روی اختیار نہ کرے اور افراط و تفریط کا شکار ہو جائے تو اسلام میں ایسے شخص کی بہت مذمت کی گئی ہے اور اس کے لیے آخرت کے ساتھ دنیا کی بھی بہت سی مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے۔

بخل

بخل کنجوسی کو کہتے ہیں یعنی ایسی جگہ جہاں مال خرچ کرنا چاہیے وہاں پر مال خرچ نہ کرنا بخل کہلاتا ہے۔قرآن مجید اور فرامین معصومین میں بخل کو امور قبیحہ میں سے شمار کیا گیا ہے اور بخیل شخص کی بہت کھلے الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔

ارشاد رب العزت ہے:

وَمَنۡ يَبۡخَلُ فَإِنَّمَا يَبۡخَلُ عَنۡ نَفۡسِهِ

جو شخص بخل کرتا ہے تو خود اپنے آپ سے بخل کرتا ہے۔

اسی طرح بہت سی روایات میں بھی بخل کی مذمت ہوئی ہے کہ انسان اپنی مرضی سے مال کو خرچ نہیں کرتا ہے اور اس میں وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

رسول اکرمؐ سے مروی ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے نزدیک بخیل عبادت گزار سے ایک سخی جاہل شخص زیادہ محبوب ہے۔

امام علی نقی علیہ السلام سے منقول ہے کہ: سب سے مذموم اخلاق بخل کرنا ہے۔ اسی طرح امام صادقؑ سے مروی روایت میں سب سے زیادہ بدکردار بخیل کو قرار دیا گیا ہے۔ تم میں سب سے زیادہ بدکردار وہ ہے جو بخیل ہے۔

روایات معصومینؑ میں بخیل شخص کا ٹھکانا جہنم بیان ہوا ہے اور اس کو رحمت خدا سے دور رہنے والوں میں شمار کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت منقول ہے کہ: بخیل شخص اللہ تعالیٰ اور لوگوں سے دور ہوتا ہے۔ اور جنت سے بھی دور ہوتا ہے جبکہ جہنم کے قریب ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ شریعت اسلام نے ہر عمل میں میانہ روی کا حکم دیا ہے اسی وجہ سے بخل فقط مال خرچ کرنے اور نہ کرنے کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ روایات میں اور بھی کئی امور کو بخل میں سے شمار کیا گیا ہے۔

۱۔ سلام میں بخل کرنا

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

''بخیل وہ ہے جو سلام کرنے میں بخل سے کام لے''۔

۲۔ صلوات میں بخل

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

''بلاشبہ بخیل وہ شخص ہے کہ جس کے سامنے میرا تذکرہ کیا جائے اور وہ مجھ پر صلوات نہ بھیجے''۔

۳۔ ادائیگی فرائض میں بخل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ سب سے زیادہ بخیل وہ شخص ہے جو ان امور میں بخل کرے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اس پر فرض قرار دیا ہے۔ جب ہم اس سلسلے میں روایات معصومین کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بخل کے بہت زیادہ نقصانات کا علم ہوتا ہے۔ کہ جن کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ بخل اللہ تعالیٰ سے دوری اور جہنم سے قریب کرنے کا موجب بنتا ہے۔

۲۔بخیل شخص چونکہ اپنی ذات پر بھی خرچ کرنے سے کتراتا ہے اسی وجہ سے دوسروں پر خرچ کرنے کا تو سوچتا بھی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ بخیل شخص کو ہمیشہ دوستوں اور ساتھیوں کی قلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اور بہت کم لوگ اس سے دوستی کرتے ہیں۔جبکہ اس کے دشمنوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔

۳۔اللہ تعالیٰ نے بخیل شخص کے لیے جنت کوحرام قرار دیا ہے۔

۴۔بخل انسان کو دوسرے کئی گناہ انجام دینے پر آمادہ کرتا ہے، جیسے مال حرام کا کسب کرنا۔

۵۔بخل کے نتیجے میں اگر چہ شخص فقر و ناداری سے بچنا چاہتا ہے مگر وہ جلدی فقیر ہو جاتا ہے دنیا میں فقیروں جیسی زندگی گزارتا ہے مگر قیامت کے دن اس سے امیر لوگوں جیسا سخت حساب لیا جائے گا۔

۶۔بخل انسان کی ذلت ورسوائی کا موجب بنتا ہے۔

۷۔بخیل شخص کے رشتہ دار بھی اس کی اس حرکت سے نالاں ہوتے ہیں اور یہ عمل اس کے قطع رحمی کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔

۸۔بخیل شخص کو کبھی سکون وراحت نصیب نہیں ہوتی۔

۹۔بخل انسان کو اموال شرعیہ (خمس، زکوٰۃ) ادا کرنے سے روکتا ہے۔جس کے نتیجے میں وہ دردناک عذاب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

اسراف

اسراف فضول خرچی کو کہتے ہیں اور یہ بخل کی ضد ہے یعنی جہاں پر جتنا ضرورت ہو اس سے زیادہ خرچ کرنا اور مال کا بے دریغ خرچ، اسراف وتبذیر کہلاتا ہے۔

جس طرح اسلام نے بخل کی مذمت کی اسی طرح اسراف کرنے سے بھی روکا ہے اور نعمات الٰہی کو ضائع کرنے اوران کے نامناسب استعمال سے منع فرماتا ہے۔

چنانچہ ارشاد قدرت ہے:

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا

اور فضول خرچی نہ کرو۔[1]

بلکہ بعض مقامات پر اسراف کرنے والے کو شیطان کا ہم نشین قرار دیا ہے اور فرمایا کہ:

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ

فضول خرچی کرنے والے یقیناً شیطان کے بھائی ہیں۔[1]

اوراس گناہ کبیرہ کی ناپسندیدگی کواللہ تعالی نے بہت واضح الفاظ میں بیان فرمادیا ہے:

انه لا یحب المسرفین

یقیناً اللہ تعالی فضول خرچی کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا۔[2]

جیسا کہ بخل کی بحث میں بیان ہو چکا ہے کہ بخل صرف مال کے خرچ نہ کرنے میں نہیں ہوتا ہے اسی طرح ''اسراف'' بھی فقط مال کے بے دریغ استعمال کرنے کو نہیں کہا جاتا ہے بلکہ ہر وہ عمل کہ جو حد اعتدال سے بڑھ کرانجام دیا جائے اسراف کہلاتا ہے۔ جیسے اگر وضو کے لیے ایک لوٹا پانی کافی ہوتو اس سے زیادہ پانی کا استعمال بھی اسراف شمار ہوگا۔ بلکہ اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے: نیکی کے کاموں کے علاوہ ہر شئ میں اسراف مذموم ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک کام جتنے زیادہ انجام دیے جائیں ان میں اسراف کا عنوان نہیں آتا اور نہ ہی اس سلسلے میں مذمت وارد ہوئی ہے بلکہ بہت سی آیات وروایات کثرت سے افعال خیر انجام دینے کی تاکید کرتی ہیں۔

پس ہمیں چاہیے کہ ہم اسلام کے بتائے ہوئے اصول پر عمل کرتے ہوئے میانہ روی اختیار کریں اور بخل و اسراف جیسے افعال کہ جن سے خدا کی ناراضگی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو بچائے رکھیں اور خداوند کریم سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں اپنی رضا پر راضی رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

سبق 16

دوستی

انسان ایک معاشرتی جانور ہے جس کے لیے معاشرے کے دوسرے افراد سے میل جول رکھنا اور تعلقات پیدا کرنا ضروری ہے، تاکہ اس کی معاشرتی زندگی یا اس کی اجتماعی زندگی اس کے مقتضائے فطرت کے مطابق چل سکے۔ اس لیے انسان کو اپنے خاندان اور عزیز و اقارب کے علاوہ کچھ ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی زندگی میں اثر انداز ہو سکیں اور انہیں افراد کو دوست کہا جاتا ہے۔ دوستی انسان کے لیے ایک ایسا اہم رشتہ ہے جس کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ دوست کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر روایات معصومینؑ میں بھی دوستی کرنے اور دوست بنانے کی بہت تعریف و تاکید کی گئی ہے۔

چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ: جو شخص دوست نہیں رکھتا گویا اس کے پاس کوئی ذخیرہ موجود نہیں

ہے۔

یعنی انسان کا اصل سرمایہ اس کا دوست ہوتا ہے کہ جس کا وہ انتخاب کرتا ہے ۔ کیونکہ عزیز و رشتہ دار اور خاندان تو اسے ان میں پیدا ہونے کی وجہ سے مل جاتا ہے۔ ہاں دوست وہ ذات ہے کہ جس کا وہ خود انتخاب کرتا ہے اس لئے دوست کو انسان کا سرمایہ شمار کیا گیا ہے۔

دوست چونکہ انسان خود چنتا ہے اور وہ ان میں سے اپنے ہم خیال لوگوں کا ہی انتخاب کرتا ہے اسی وجہ سے ان کی سوچ وفکر اور قابلیت بھی ایک جیسی ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت علی سے منقول ہے کہ:

''دوست ایسے ہوتے ہیں جیسے مختلف جسموں میں ایک روح ہوتی ہے''۔

اسلام میں جہاں دوستی کو اتنی اہمیت دی گئی ہے تو وہاں اس بات کی طرف بھی متوجہ کیا ہے کہ ہر کس و ناکس سے دوستی کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ جب ایک دوست انسان کے تمام رشتہ داروں کے مقابلے میں زیادہ قریب ہوتا ہے تو یقیناً انسان اس سے زیادہ متاثر ہوتا ہے چنانچہ اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

''انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے لہٰذا تم دیکھو کہ کس کے دوست ہو''۔

اسی طرح ایک اور مقام پر آپ سے مروی ہے کہ ''لوگوں کو ان کے دوستوں کے ذریعے پہچانو اس لیے کہ ہر انسان اس سے دوستی کرتا ہے جو اسے اچھا لگتا ہے''۔

اسی سے ملتے جلتے الفاظ میں امیر المومنین علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ:

ہر انسان اپنے جیسے کی طرف میلان رکھتا ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوست کے انتخاب میں بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر ہم قرآن مجید اور فرامین معصومینؑ میں دقت کریں تو ہمیں چند صفات ملتی ہیں کہ دوست کا انتخاب کرنے کے لیے جن کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری سمجھا گیا ہے۔

۱۔ قرآن مجید میں ایسے افراد سے دوستی کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ جو دن رات یاد الٰہی میں بسر کرتے ہیں اور جو رضائے الٰہی کے خواہاں ہوتے ہیں۔

چنانچہ ارشاد رب العزت ہے کہ:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ

جو لوگ صبح و شام اپنے خدا کو پکارتے ہیں اور خدائی کو اپنا مقصود بنائے ہوئے ہیں ان کو اپنی بزم سے علیحدہ نہ

کیجیے گا۔

اسی طرح ایک اور مقام پر حکم دیا کہ:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَه

اور اپنے نفس کو ان لوگوں کے ساتھ صبر پر آمادہ کرو جو صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اس کی مرضی کے طلبگار رہیں۔

۲۔احادیث مبارکہ میں شریف النفس اور اعلیٰ صفات کے حامل افراد سے دوستی کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ ’’سب سے زیادہ خوش نصیب انسان وہ ہے جو کریم افراد سے رابطہ رکھے‘‘۔

۳۔کسی سے دوستی کرتے وقت اس کے تقویٰ و پرہیز گاری کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے جیسا کہ رسول گرامی قدر سے جب کسی نے پوچھا کہ بہترین ہمنشین کون ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ ’’جس کو دیکھ کر تمہیں خدا یاد آجائے، جس کی گفتگو تمہارے علم میں اضافہ کرے اور جس کا عمل تمہیں آخرت کی یاد دلائے‘‘۔

۴۔بہت سی روایات میں علماء، حکماء اور فقراء کی ہم نشینی اختیار کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ ’’علماء سے سوال کرو، حکماء سے رابطہ رکھو اور فقراء کی ہم نشینی اختیار کرو‘‘۔

۵۔روایات معصومین میں عقل مند، دانا اور ایسے افراد کی دوستی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو ہر انسان کے لیے باعث عزت و زینت ہوں۔ جیسا کہ امام حسن مجتبی علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس شخص کی ہم نشینی اختیار کرو کہ جس کی دوستی تمہارے لیے سربلندی اور زینت کا باعث ہو، اگر تم اس کی خدمت کرو تو وہ تمہارا احترام کرے، اگر کسی کار خیر کے لیے اس کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ تو تمہاری حمایت کرے اگر تمہارے اندر کوئی عیب دیکھے تو اسے چھپائے اور اسے ظاہر نہ کرے اگر تمہارے اندر کوئی اچھی صفت دیکھے تو اس کی قدر کرے، تم اس سے کچھ طلب کرو تو عطا کرے، اگر تمہاری کوئی ضرورت ہو تو وہ خود اسے پوری کرنے کی کوشش کرے۔

۶۔روایات میں دوستی کا معیار خلوص و صداقت کو قرار دیا گیا ہے جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ ’’اس شخص کی پیروی کرو کہ تمہیں رلاتا ہو مگر تمہارا خیر خواہ بھی ہو۔ اور س شخص کی اتباع نہ کرو جو تمہیں ہنساتا تو ہو مگر وہ تمہیں دھوکہ دینا چاہتا ہو‘‘۔

سبق 17

احترام والدین (حصہ اول)

خداوندمتعال نے انسان کو بے تحاشا نعمتوں سے نوازا ہے اور اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ان نعمتوں کا شکر بجالائیں۔انہی نعمات خداوندی میں سے ایک بڑی نعمت ''والدین'' ہیں۔خداوندمتعال اپنے بندوں پر حددرجہ مہربان ہے اوراس کے دنیامیں آنے سے پہلے ہی اس کی دیکھ بھال اورنگہداشت کا انتظام کرتا ہے اور ماں باپ کی صورت میں دومہربان وشفیق ہستیاں عطا کرتا ہے کہ جواس کا ہرلحاظ سے خیال رکھتی ہیں۔اور وہ دکھ ومصیبت کوجھیل کر اسے ہرخوشی بہم پہنچانے کی سعی وکوشش کرتے ہیں۔ان کی انہیں کوششوں اور محنت کے عوض میں اللہ تعالی نے اولاد پر اپنے ماں باپ کے احترام کوواجب قرار دیا ہے جیسا کہ ارشادرب العزت ہوتا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ط

تمہارے رب نے فیصلہ کردیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرواوروالدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

اس آیت مجیدہ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت وعبادت کا فیصلہ سنایا ہے تواس کے فوراًبعدوالدین کی اطاعت وفرمانبرداری کاحکم بھی دیا ہے یعنی اللہ تعالی کے ہاں جس قدراس بات کواہمیت حاصل ہے کہ اس کا کوئی شریک نہ ٹھہرایاجائے اس قدراس بات کی بھی پرواہ ہے کہ کوئی بھی اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرے۔

شریعت مقدسہ اسلام نے حقوق والدین کے سلسلے میں بہت سختی کی ہے اور اولاد کے لیے والدین کے بارے میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔اس طرح حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ پر سب سے پہلے دو چیزیں لکھیں:

ا۔اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں ہے(لا الہ الا اللہ)

۲۔جس شخص سے اس کے والدین راضی ہوں میں بھی اس سے خوش اور جس سے اس کے والدین ناراض ہوں گے تومیں بھی ان سے ناراض ہوں۔

اسی آیت مجیدہ میں والدین کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے مزید فرمایا ہے کہ:

اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا

قَوۡلًا كَرِيۡمًا﴿۲۳﴾

اگر تمہارے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں ''اف'' تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو۔ ان کے ساتھ احترام کے ساتھ بات کرو۔ نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ پروردگارا! ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے مجھے رحمت و شفقت کے ساتھ بچپن میں پالا تھا۔

اس آیت سے ہمیں یہ نتیجہ ملتا ہے کہ جس طرح والدین بڑھاپے میں اولاد کے احسان کے محتاج ہوتے ہیں اسی طرح اولاد کو بھی زندگی کے ہر موڑ پر والدین کی توجہ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

پس اللہ نے اس ضرورت کو فطرت کے ذریعے پورا کیا اور والدین کے دل میں اولاد کی محبت اس طرح ودیعت فرمائی کہ وہ اولاد کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے ہیں، جبکہ خدا نے والدین سے اچھائی کرنے کو اپنی وحدانیت کے فوراً بعد قرآن کی متعدد جگہوں پر اہم فریضہ قرار دیا کیونکہ انسان فطرتاً آنے والی نسل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنے والدین کو اولاد فراموش کر دیتی ہے، تو خدا نے اس آیت مجیدہ کی رو سے انسان کو یہ بتایا کہ تم ہمیشہ اپنے والدین کے ساتھ انکساری سے پیش آو، ان سے غصہ نہ کرو اور انکے احسانات کو ہمیشہ یاد رکھو، کیونکہ انہوں نے بچپن میں تمہیں بہت مشقت سے پالا ہے تو آج انکے بڑھاپے میں انکا بھی ویسے ہی خیال رکھو، انکو کوئی اذیت والی بات نہ کہو اگرچہ اف ہی کیوں نہ ہو۔

پس ایک مومن کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے والدین کی عزت و تکریم اور ان کے احترام کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کرے اور ان کی خدمت گزاری میں کوئی کسر روا نہ رکھے اور جس قدر ہو سکے ان کی حاجت روائی کرئے اور اپنی پوری توجہ اس بات پر رکھے کہ ان کو جن چیزوں کی احتیاج ہو وہ ان تک پہنچا دے تاکہ انہیں ان چیزوں کے بارے میں اس سے سوال نہ کرنا پڑے۔ ان کے سامنے کبھی بھی اونچی آواز سے بات نہ کرئے۔ انہیں اذیت و دکھ دینے سے گریز کرئے اور اگر کبھی وہ کچھ برا بھلا کہ بھی دیں تو ان کو اف تک نہ کہے۔ اس کلمہ ''اُف'' کے متعلق امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ''اُف'' کہنا یہ سب سے کم درجہ کی نافرمانی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسی چیز کے بارے میں جانتا کہ جو ''اُف'' سے بھی کم درجہ کی ہو تو وہ اس سے بھی منع فرماتا''۔

یہ بات مسلم ہے کہ ماں باپ سے نیکی کرنا ایک انسانی فریضہ ہے اور والدین کی اطاعت کرنا انسانیت کا تقاضا بھی ہے اور ماں باپ سے نیکی کا حکم صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے ہے، ہر نیکی انسان پر لازم ہے کہ والدین کا حق شناس ہو اور زندگی بھر اپنے والدین کا احترام اور ان سے اچھا سلوک کرنا ہرگز فراموش نہ کرے، اور جو انسان دیندار ہو گا وہ والدین سے اچھا سلوک کرے گا، اور جو دین سے ناآشنا اور نابلد ہو گا وہ ماں باپ کو

اپنے لئے بوجھ سمجھے گا، والدین سے محبت اور حسن سلوک کرنا تمام انسانوں پر فرض ہے، اگر چہ والدین مشرک اور غیر مسلم ہوں۔

چنانچہ امام علی رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

والدین سے احسان وبھلائی کرنا واجب ہے چاہے وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ الگ بات ہے کہ اسلام نے ان کی اطاعت کے حکم کے ساتھ ساتھ ان کی کفر وشرک میں اتباع کرنے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا

اگر والدین تمہیں شرک پر اصرار کرے تو انکی بات نہ مانو لیکن ہمیشہ انکے ساتھ نیکی اور احترام سے پیش آو۔

پس مشرک والدین کی اطاعت کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کی خدمت کی جائے اگر ان کی کوئی ضرورت ہو تو ان کو پورا کیا جائے اور اگر وہ مریض ہو جائیں تو ان کی تیمارداری کی جائے۔ پس ہر انسان پر واجب ہے کہ ہمیشہ اپنے والدین کے ساتھ انکساری سے پیش آئے اگر چہ والدین کافر ہی کیوں نہ ہوں ممکن ہے کہ اولاد کی نیکی اور خدمت سے متاثر ہو کر غیر مسلم والدین مسلمان ہو جائیں۔

امام صادق علیہ السلام سے مروی ایک داستان میں ہے، کہ ایک عیسائی امامؑ کی خدمت میں آیا اور آپ کی ہدایت و نصیحت کی وجہ سے اسلام قبول کیا، پھر اس نے عرض کیا مولا میری ماں ابھی تک عیسائی مذہب پر باقی ہے میں اسکے ساتھ کیسا سلوک کروں؟ تو امامؑ نے فرمایا جب تم عیسائی تھے اس وقت جس طرح ماں کی خدمت کرتے تھے اب اس سے بھی زیادہ ماں سے بہتر سلوک کرو کیونکہ اسلام میں ماں کی عظمت بہت بلند ہے، تو وہ امامؑ کی خدمت سے رخصت ہوا اور آپؑ کی ہدایت پر عمل کرنے لگا، اور پہلے سے بھی زیادہ ماں کی خدمت کرنے لگا ایک دن اسکی ماں نے پوچھا بیٹا کیا وجہ ہے جب سے تم مسلمان ہوئے ہو۔ تب سے تم میری زیادہ خدمت کررہے ہو جبکہ ہمارا دین اب مختلف ہے؟

تو بیٹے نے عرض کی: اماں جان! اصل بات یہ ہے کہ میرے دین کے پیشواء نے مجھے اس عمل کی تلقین کی ہے، تو ماں نے پوچھا کیا وہ پیغمبر ہیں؟

بیٹے نے جواب دیا نہیں، فرزند پیغمبر ہیں۔

تو ماں نے کہا یہ تو انبیاءؑ کے اخلاق میں سے ہے۔ بیٹا! مجھے بھی اپنے دین کے متعلق بتاؤ۔

تو اس نے اپنی ماں کے سامنے دین اسلام کے احکامات بیان کئے اور اسکی ماں بھی اسی وقت دائرہ اسلام

میں داخل ہوگئی۔

تو اس واقعہ سے ہم یہ نتیجہ لے سکتے ہیں کہ اگر کوئی اولاد اپنی محبت اور احساسات کو اپنے کافر یا گناہ گار والدین پر مرکوز کردے تو اپنے اس عمل کے ذریعے ان کی فکر اور رجانات کو تبدیل کر کے انہیں صراط مستقیم پر لا سکتی ہے۔

سبق18

حقوق والدین (حصہ دوم)

والدین اولاد کیلئے خدا کی طرف سے ایک عظیم نعمت اور سایہ شفقت ورحمت ہیں، اولاد جب تک والدین کی اطاعت، فرمانبرداری اور اُن سے نیکی کا عمل جاری رکھتی ہے وہ دنیوی اور اخروی تمام مشکلات سے محفوظ رہتی ہے۔لیکن افسوس کہ اس تحفظ اور سایہ شفقت کا احساس روز بروز کم ہوتا جارہا ہے۔اور زمانہ جس تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہا ہے وہاں اس مادی دور میں اتنی ہی تیزی سے انسانی معاشرے سے روحانی اور اخلاقی قدریں ختم ہوتی جارہی ہیں آج ترقی کے نام پر ہمارے معاشرے پر مغربی تہذیب وتمدن کو مسلط کیا جارہا ہے۔

ہمارے معاشرے میں والدین کی عزت واحترام کا تصور تقریباً ختم ہوتا جارہا ہے جبکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں والدین کا احترام نہ صرف ان کی زندگی میں واجب ہے بلکہ اسکے مرنے کے بعد بھی انکی خدمت اور احترام کو واجب قرار دیا ہے۔شریعت اسلام نے اس امر کو اتنی اہمیت دی ہے کہ شاید ہی کسی اور اخلاقی واجب عمل کو اتنی اہمیت دی گئی ہو۔

چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ قیامت کے دن نیکوکاروں کا سردار وہ شخص ہوگا جو اپنے والدین کے مرنے کے بعد بھی ان سے نیک سلوک کرتا رہا ہو۔

اگر آج کوئی انسان بلند مقام پر فائز ہوا ہے تو یقیناً والدین کی دعاؤں کی وجہ سے ہے، اگر کوئی عالم، ڈاکٹر، انجینئر یا کسی اور عظیم منصب پر ہے تو یہ والدین کی اچھی تربیت، محبت اور شفقت کا نتیجہ ہے۔اولاد کو دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے لئے والدین کی نیک دعاؤں کی سخت ضرورت ہوتی ہے، اور ماں باپ یقیناً اپنی اُس اولاد کو دعائیں دیں گے جو اطاعت گزار ہے، لہٰذا نوجوان نسلوں کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ اسلام نے والدین کو بہت بلند مقام ومرتبہ عطا کیا ہے اور وہی عظیم انسان بنے گا جو والدین کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔لیکن اگر اولاد والدین کی نافرمانی کرے تو یہ گناہ کبیرہ میں سے ہوگا جس کی بخشش نہیں ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

ہر گناہ اگر خدا چاہے تو معاف کر دیتا ہے مگر والدین کی نافرمانی والا گناہ معاف نہ ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ والدین کا احترام کس طرح کیا جائے تو اس کے متعلق مختلف آیات و روایات میں چند اصول بیان کیے گیے ہیں کہ جن کا خلاصہ یہ ہے:

ا۔ بہت اہتمام سے ان کی عزت وتکریم کا خیال رکھا جائے۔

۲۔ ان سے کوئی ایسی بات نہ کہی جائے کہ جو ان کو ناگوار گزرے۔

۳۔ ان سے بات کرتے وقت آواز دھیمی رکھی جائے۔

۴۔ ان کو تند و تیز نگاہوں سے نہ گھورا جائے۔

۵۔ راستہ چلتے وقت ان کے پیچھے چلا جائے۔

۶۔ معصیت الٰہی کے علاوہ ان کے ہر حکم کو عزت واحترام سے قبول کیا جائے۔

۷۔ ان کی طرف پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھا جائے۔ اس طرح ہر اس کام سے اجتناب کرنا ضروری ہے کہ جس سے ان کے دل کو ٹھیس پہنچے اور وہ غمزدہ ہوں۔

جہاں پر والدین کے ساتھ احسان و نیک سلوک کرنے سے انسان کی اپنی زندگی پر سکون گزرتی ہے اور ذہنی سکون و آسودگی محسوس کرتا ہے وہاں اس کے اور بھی بہت سے دنیاوی اور اخروی فوائد کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ جن میں سے چند ایک کو مختصراً بیان کریں گے:

ا۔ اللہ تعالیٰ اور معصومینؑ کی رضا و خوشنودی کا باعث ہے۔

۲۔ ایسے شخص کے تمام اعمال قبول ہوتے ہیں۔

۳۔ اگر کوئی آج اپنے والدین کی عزت کر رہا ہے تو عدل الٰہی کا تقاضا یہی ہے کہ کل کو اس کو بھی یہی عزت اپنی اولاد سے نصیب ہو۔

۴۔ والدین کی ایک رات خدمت کرنا جہاد فی سبیل اللہ کرنے سے بہتر ہے۔

۵۔ جنت کہ جس کو ماں کے قدموں میں قرار دیا گیا ہے ایسے شخص کی مشتاق رہتی ہے۔

۶۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک بہت سے گناہوں کی بخشش کا سبب بنتا ہے۔

۷۔ میدان محشر میں عرش الٰہی کا سایہ نصیب ہوگا۔

جہاں والدین کی اطاعت اتنے زیادہ فوائد و درجات کا باعث بنتی ہے وہاں پر ان کی نافرمانی دنیا و آخرت میں مختلف قسم کے نقصانات کا موجب بنتی ہے اس بات کو سمجھنے کے لیے اس واقعہ سے عبرت حاصل کی جا سکتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک قبر کے قریب سے گزرے تو قبر سے آواز آنے لگی۔ یا رسول اللہ مجھے بچائیں میں عذاب کی لپیٹ میں ہوں۔ نبی نے اس سے عذاب کی وجہ پوچھی تو قبر سے آواز آئی کیونکہ دنیا میں، میں نے اپنی والدہ کو تنگ کیا تھا اور وہ مجھ پر ناراض ہیں لہٰذا مجھے عذاب دیا جا رہا ہے"۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلالؓ سے کہا جاؤ سب لوگوں سے کہو، کہ اس قبر کے پاس آجائیں۔ تھوڑی دیر میں اس قبر کے اردگرد ایک جم غفیر ہو گیا اور انہیں میں ایک بوڑھی خاتون عصا پر سہارا لیے آنحضرت کے قریب آن کھڑی ہوئی اور سلام کے بعد عرض کرنے لگی: یا رسول اللہ یہاں کیا ہوا ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ تیرے فرزند کی قبر ہے اور اس پر اللہ کا سخت عذاب ہو رہا ہے۔ نہیں تو اسے معاف کر اور راضی ہو جا۔ تو وہ بڑھیا بولی! میں اسے معاف نہ کروں گی۔ کیونکہ میں نے اسے دودھ پلایا اسکی پرورش کی خاطر تکلیفیں برداشت کیں خود گیلے بستر پر سوئی اور اسے سوکھے پر سلایا۔ لیکن جب وہ نوجوان ہوا اور اس کے کمزور اعضاء میری پرورش کے نتیجہ میں طاقتور ہو گئے۔ تو اس نے بطور بدلہ مجھے اذیتیں دیں اور مجھے تکلیفیں دے کر خوش ہوتا تھا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی "اے اللہ اس ماں کو اپنے فرزند کی آواز سنا، تاکہ اس کا دل نرم ہو"

اب جب بڑھیا قبر پر کان دھرنے لگی تو اس نے سنا کہ اسکا بیٹا مجھے بچالو، مجھے بچالو، مجھے بچالو، کہہ کر چیختا ہے۔ اور کہتا ہے میرے اوپر نیچے دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف آگ ہی آگ ہے۔ خدارا مجھے بچالو ماں! مجھے بچالو۔ یہ سن کر ماں نے معاف کر دیا تو تھوڑی دیر بعد قبر سے آواز آئی اے میری مہربان ماں! جونہی تو نے مجھے معاف کیا اللہ نے بھی مجھے معاف کر دیا۔ اور اللہ کا عذاب ختم ہو گیا۔

لمحہ فکریہ

حقوق والدین ان مسائل میں سے ہیں جن کو ادا کرنے کی قرآن مجید میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے، قرآن کی نظر میں ان حقوق کی اتنی اہمیت ہے کہ چار مقامات (سورہ بقرہ آیت ۸۳، بنی اسرائیل آیت ۲۳، انعام آیت ۱۵۱، النساء آیت ۳۶) پر مسئلہ توحید کے فوراً بعد ان کی ادائیگی کی تاکید کی ہے، ان تعبیرات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ توحید اور حقوق والدین کا چولی دامن کا ساتھ ہے قرآن تو کہتا ہے والدین کو 'اُف' بھی نہ کہو، جھڑکنا تو دور کی بات ہے۔

لیکن افسوس مسلمانوں نے قرآن کو صرف تلاوت اور حفظ کرنے تک محدود کر رکھا ہوا ہے اور حکم قرآن پر عمل نہیں کرتے۔ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو والدین کو مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بعض لوگوں کا مزاج شادی کرنے کے بعد تبدیل ہو جاتا ہے اور ماں باپ کو اپنے بیوی بچوں کا نوکر بنا کر رکھتے ہیں اور سب کے سامنے

والدین کی تذلیل کر کے انکو خود سے الگ کر دیتے ہیں۔اسی طرح والدین کی بزرگی و بڑھاپے میں انکو بے یارومددگار چھوڑ دیتے ہیں،کیاایسے لوگوں سے خدا راضی ہوگا؟

سبق19

بری صحبت

گذشتہ سبق سے ہمیں معلوم ہوا کہ دوست کے انتخاب میں ہمیں احتیاط اور توجہ کرنی چاہیے۔اس لیے دوست ایک جانب تو انسان پر اثر انداز ہوتا ہے،دوسری طرف اس کے ذریعے ہماری شخصیت اور کردار کا پتہ چلتا ہے، ہمیں ایسے لوگوں کو اپنا دوست بنانا چاہیے کہ جو ہمارے اوپر نیک اثر ڈالیں اور سماج میں ہماری سربلندی وکمال کا باعث بنیں۔

تاریخ بشریت میں مختلف آسمانی شریعتوں کے وجود سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خداوند متعال نے انسان کو خلق کرنے کے بعد اسے اس کی صوابدید پرنہیں چھوڑا کہ ہم جو کرنا چاہیں کریں،اور جس کے ساتھ چاہیں نشست و برخاست رکھیں اور جو چاہیں کہیں یا سنیں۔بلکہ آیات و روایات میں بہت سی ہدایات موجود ہیں کہ جس میں انسان کو اعلی درجات حاصل کرنے کی رہنمائی کی گئی ہے اور ایسا ضابطہ حیات دیا گیا ہے کہ جس پر عمل پیرا ہوکر انسان دنیاوآخرت میں سعادت کو حاصل کرسکتا ہے۔

جہاں اسلام نے یہ معیار بتایا ہے کہ فلاں صفات وکمالات کے حامل شخص سے دوستی کرو وہاں آیات و روایات میں بہت سے افراد کے ساتھ دوستی اور ہم نشینی سے منع کیا گیا ہے کیونکہ برے لوگوں کی صحبت بہت برے نتائج اور نقصانات کا موجب بنتی ہے۔جن میں سے چند نقصانات یہ ذکر ہوئے ہیں:

۱۔بری صحبت کے نتیجے میں انسان سنگ دل ہوجاتا ہے۔

۲۔بری صحبت انسان کو کئی دیگر حرام کاموں کی طرف کھینچ لیتی ہے۔

۳۔بری صحبت کے نتیجے میں انسان قہروغضب الٰہی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

۴۔بری صحبت کی وجہ سے اگر انسان خود برا نہ بھی ہو۔تو برا شمار کیا جاتا ہے اور بدنام ہوتا ہے۔

۵۔برے شخص سے برائی کے علاوہ کسی چیز کی امید نہیں رکھی جاسکتی ہے۔پس ایسی صحبت اور دوست وقت پڑنے پر انسان کا ساتھ نہیں دیتے ہیں۔اور انسان معاشرہ میں تنہا رہ جاتا ہے۔

ان نکات کے پیش نظر اگر ہم قرآن مجید اور آئمہ معصومینؑ کی احادیث پر نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ کس قسم

کے لوگ دوستی اور ہم نشینی کے قابل نہیں ہوتے ہیں۔تو ہمیں یہ چند گروہ ملیں گے کہ جن سے دوستی کرنے سے صریح الفاظ میں منع کیا گیا ہے۔

ا۔سب سے پہلے وہ گروہ ہے جو آیات اللہ کو جھٹلاتا ہے اور دین خدا کا مذاق اڑاتا ہے۔ایسے افراد کی صحبت اوران سے دوستی کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ایسے افراد کے بارے میں قرآن مجید میں بیان ہوا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ

اے ایمان والو!خبردار اہل کتاب میں جن لوگوں نے تمہارے دین کا مذاق اور تماشا بنالیا ہے اور دیگر کفار کو اپنا دوست اور سرپرست نہ بناؤ۔

۲۔دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں کہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین کی توہین کرتے ہیں ایسے افراد سے بھی دوستی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ:''اگر تم کبھی ان لوگوں کے درمیان جو اہل بیت علیہم السلام کی عظمت اوران کے حق کے منکر ہیں اوران کو برا بھلا کہتے ہیں پھنس جاؤ تو اس طرح ہو جاؤ گویا جلتے ہوئے پتھر پر بیٹھے ہوتا کہ فوراً اٹھ جاؤ۔(یعنی اس جگہ سے جلد دور ہو جاؤ) اس لیے کہ خداوند عالم ان پر لعنت کرتا ہے۔اور اگر دیکھو کہ وہ آئمہ میں سے کسی کو برا بھلا کہہ رہے ہیں تو وہاں سے اٹھ جاؤ اس لیے کہ خدا کا عذاب ان پر وہیں نازل ہوگا''۔

۳۔تیسرا گروہ وہ لوگ ہیں:

جن سے دوستی کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، وہ ہیں جو دین میں بدعت اور اصول دین میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں۔

ایسے افراد کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ''میرے بعد جب بھی ایسے لوگوں کو دیکھنا جو دین میں شک وشبہ اور بدعتیں پیدا کرنے والے ہوں تو ان سے کھلم کھلا بیزاری کرتے رہنا اور جس قدر ممکن ہو ان پر لعن طعن کرنا اوران کے بارے میں گفتگو کرتے رہنا اور انہیں اس طرح خاموش کر دینا کہ پھر ان کے اندر اسلام میں فساد برپا کرنے کی ہمت نہ ہو اور لوگوں کو ان سے دور کر دو تا کہ وہ ان سے ان کی بدعتیں نہ سیکھیں۔اس کے بدلے خدا تمہارے لیے بہترین نیکیاں لکھے گا اور آخرت میں تمہارے درجات کو بلند کرئے گا''۔

۴۔چوتھا گروہ ان لوگوں کا ہے جو شرارت پسند، فاسق، گناہ گار، اور خدا کی نافرمانی کرنے والے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے ایسے افراد سے دوستی کرنے کی مذمت کچھ اس طرح منقول ہے کہ''ایک مسلمان کو کسی

فاسق وفاجر سے رابطہ نہیں رکھنا چاہیے اس لیے کہ وہ اس مسلمان کے سامنے اپنے عمل کو اچھا بنا کر ظاہر کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ مسلمان بھی اس جیسا ہو جائے اور اس کی دنیا وآخرت کے بارے میں اس کی مدد نہیں کرتا اور اس کے ساتھ آمد و رفت رکھنے میں مسلمان کی ذلت ہے''۔

۵۔ پانچویں وہ لوگ ہیں جن کا دین، اخلاق وکردار اور فہم وشعور زیادہ نہ ہو اگر چہ وہ فاسق شخص نہ بھی ہوں پھر بھی ان سے ہم نشینی سے منع کیا گیا ہے۔ جیسے احمق، جھوٹا، وغیرہ سب اس میں شامل ہیں۔

واقعہ

عقبہ ابن ابی معیط اسلام کے ابتدائی ایام میں کفار مکہ میں اپنی مہمان نوازی کی وجہ سے مشہور تھا۔ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس کی طرف سے گزر ہوا تو اس نے آپ گو اپنے ساتھ کھانا کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی تو آپؐ نے فرمایا کہ ''جب تک تم مسلمان نہیں ہو گے میں تمہارے دستر خوان پر نہیں بیٹھوں گا''۔ وہ اپنی مہمان نوازی سے مجبور تھا اس لیے اس نے کلمہ شہادتین زبان پر جاری کر دیا اور مسلمان ہو گیا۔

اسی وقت عقبہ کا ایک دوست ''ابی'' کو جب یہ معلوم ہوا کہ عقبہ مسلمان ہو گیا ہے تو وہ اس سے ناراض ہوا اور اس کے پاس آ کر اسے برا بھلا کہا کہ تم اپنے دین سے خارج ہو گئے ہو۔ عقبہ نے جواب دیا کہ میرے مہمان نے شرط کر دی تھی کہ جب تک میں مسلمان نہ ہو جاؤں وہ میرے دستر خوان پر نہیں بیٹھے گا۔ اُبی نے اس سے کہا کہ تم اپنے دین پر پلٹ آؤ اور پیغمبر کی توہین کرو۔ یا آج سے میری اور تمہاری دوستی بالکل ختم ہے۔ آبی کے بہت اصرار پر عقبہ نے ایسا ہی کیا اور اسلام سے خارج ہو گیا۔ آخر کار جنگ بدر میں سپاہ اسلام کے ہاتھوں واصل جہنم ہوا۔

قرآن مجید میں اس واقعہ کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے کہ:

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا - يَا وَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا - لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنسَانِ خَذُولًا

اس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا اور کہے گا کاش میں نے رسول کے ساتھ ہی راستہ اختیار کیا ہوتا۔ ہائے افسوس! کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے تو ذکر (ہدایت) پانے کے بعد بھی مجھے گمراہ کر دیا اور شیطان تو انسان کو رسوا کرنے والا ہی ہے۔[1]

خداوند متعال سے ہماری دعا ہے کہ ہمیں ایسے دوستوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے کہ جو دنیا وآخرت میں ہمارے نقصان کا باعث بن سکتے ہوں۔ (آمین)

سبق 20

موسیقی

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرامؑ کے توسط سے انسانوں کو جو تعلیم دی ہے وہ دنیا و آخرت دونوں میں ان کی سلامتی کی ضامن ہے انبیاءؑ انسانوں کے حقیقی رہنما تھے انہوں نے انسانوں کی خیر خواہی کی اور ان کو نقصان دہ چیزوں سے منع فرمایا۔ لیکن انسانوں کی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ انہوں نے انبیاءؑ کی باتوں پر عمل نہ کیا اور ان کو انسانی آزادی میں رکاوٹ کہہ کر اس سے منہ موڑ لیا۔ اس کی واضح مثال موسیقی کی صورت ہمارے معاشرے میں موجود عفریت سے دی جا سکتی ہے۔

غنا اور موسیقی

غنا اور موسیقی ہر اس آواز کو کہا جاتا ہے جو لہو و لعب کی محفل کے لیے مخصوص ہو۔

اسلام نے اس کی حرمت اور گناہ کبیرہ ہونے کا کھلے لفظوں میں اظہار کیا ہے۔ پھر بھی ہمارے معاشرے میں کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جو اس کو روح کی غذا کا نام دیتے ہیں۔ یہ عصر حاضر میں نوجوانوں میں موجود اخلاقی بیماریوں میں سے یہ ایک مہلک ترین مرض ہے۔ اور یہ اس قدر عام ہو چکی ہے کہ لوگ اس کو سرے سے گناہ ہی تصور نہیں کرتے اگر کوئی گناہ کہتا بھی ہے تو ایک معمولی درجہ کا گناہ شمار کرتا ہے۔

لیکن جب ہم قرآن مجید اور روایات معصومینؑ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے گناہ کبیرہ ہونے کا علم حاصل ہوتا ہے۔

چنانچہ ارشاد رب العزت ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ

بتوں کی ناپاکی اور لغو باتوں سے بچو۔

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ اپنے مقرب بندوں کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ

(رحمن کے بندے) محفل زور میں شرکت نہیں کرتے۔

اس آیت کی تفسیر میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

''قول زور اور محفل زور سے مراد غنا اور موسیقی کی محفل ہے اور غنا منافقت کا سرچشمہ ہے''۔

اس برے کام کی مذمت میں آیات مبارکہ کی طرح بہت زیادہ احادیث بھی نقل ہوئی ہے جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

امام علی رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ ''لہویات میں مشغول رہنا بھی گناہ کبیرہ ہے''۔

روایات میں صرف گانا گانے کی ممانعت نہیں کی گئی بلکہ گانا سننے اس کے سازوں کو بنانے اور انہیں بجانے اور ان کی خرید وفروخت تک کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ

جو کسی بولنے والے کی آواز پر کان دھرتا ہے تو گویا وہ اس کی عبادت کرتا ہے اور اگر بولنے والا خدا کا پیغام پہنچا رہا ہے اور سننے والا اس پر دھیان دے رہا ہے اور اگر بولنے والا شیطان کا پیغام پہنچا رہا ہے اور سننے والا اس کی طرف کان لگاتا ہے تو گویا وہ شیطان کی عبادت کر رہا ہے۔

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

قیامت کے دن سارنگی بجانے والے کا منہ کالا ہوگا اس دن اس کے ہاتھ میں دوزخ کی آتشیں سارنگی ہوں گی اور ستر ہزار فرشتے فولادی گرز سے اس کے سر اور منہ پر ضربیں لگا رہے ہوں گے اور سارنگی بجانے والا جب قبر سے نکلے گا تو اندھا، بہرا اور گونگا ہوگا۔

ماضی میں انسان نے اپنی جہالت اور سرکشی کی وجہ سے آسمانی تعلیمات پر عمل نہیں کیا اور آج بھی آسمانی تعلیمات اس کی رگ وپے میں نہیں سما رہی ہیں۔ مگر میڈیکل سائنس نے بتادیا ہے کہ آسمانی تعلیم جن چیزوں سے روکتی ہے وہ بلاشبہ انسانی صحت کے لیے مضر اور نقصان دہ ہیں۔

کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ''ولف ایڈلر'' نے ثابت کیا ہے کہ موسیقی انسانی حافظے اور اعصابی نظام کو انتہائی کمزور کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر ایڈلر نے موسیقی کے نقصانات پر ایک مفصل رسالہ شائع کیا جس کی وجہ سے امریکہ میں بہت سے لوگوں نے موسیقی اپنے اوپر ممنوع قرار دی تھی۔

نقصانات

روایات معصومین علیہم اسلام میں موسیقی کے بے تحاشا نقصانات بیان ہوئے ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔جس گھر میں موسیقی کی محفلیں ہوتی ہوں وہ رسوائی سے محفوظ نہیں رہتا۔

۲۔ایسے افراد پر رحمت کے فرشتے نازل نہیں ہوتے۔

۳۔ایسے افراد کی کوئی دعا قبول نہیں ہوتی۔

۴۔ایسے افراد کا ایمان ختم ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ نفاق لے لیتا ہے۔

۵۔ایسے افراد کی حیا ختم ہوتی ہے اور اگر لوگ ان کی عورتوں سے بدکاری کریں تب بھی ان کو کوئی پروا نہیں رہتی ہے۔

۶۔ایسے افراد پر ایک شیطان مسلط ہوجاتا ہے اور وہی ان کو قابو کرتا ہے اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے۔

امام زمانہ عجل اللہ تعالی فرجہ کے ظہور کی علامات بیان کرتے ہوئے امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس زمانے میں موسیقی کے ساز عام ہوں گے اور موسیقی عروج پر ہوگی اور کوئی کسی کو اس سے منع نہیں کرے گا اور اس پر آشوب دور میں کسی کو اس سے منع کرنے کی جرات نہیں ہوگی۔

معلوم ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام کی یہ پیشین گوئی ہمارے زمانے میں پوری ہوچکی ہے کیونکہ آج کل لوگ بے باکی کے ساتھ یہ گناہ کررہے ہیں اور کوئی روکنے کے لیے تیار نہیں اور اگر کوئی یہ فرض ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو لوگوں کی سب وشتم اور مذاق کا نشانہ بنتا ہے۔اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس پرآشوب دور کے فتنوں سے ہمیں اپنی حفظ وامان میں رکھے۔(آمین)

تاریخ اسلام اور سیرت معصومینؑ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کورس کا تعارف واہداف

تعارف

تاریخ اسلام رسالت مآبؐ کے مکہ مکرمہ میں اعلان رسالت سے شروع ہوئی اور مدینہ منورہ میں باقاعدہ اسلامی معاشرے کے قیام کے ساتھ اپنے عروج کو چھونے لگا۔ رسالت مآبؐ کا سایہ رحمت ۱۰ سال تک مدینہ منورہ کے اسلامی معاشرے پر سایہ فگن رہا۔ آپؐ نے الٰہی ضابطہ حیات کے مطابق انفرادی واجتماعی زندگی گزارنے کی رہنمائی بھی فرمائی اور عملاً اپنی سیرت طیبہ جسے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لیے نمونہ عمل قرار دیا، چھوڑ گئے۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی زندگی میں ہی قولاً اور فعلاً قیامت تک کے لیے اسلامی قیادت کی نشاندہی بھی فرمائی۔ چناچہ اپنے بارہ جانشینوں کے نام لے کر نشاندہی فرمائی۔ جس میں سے پہلا حضرت امام علی علیہ السلام اور آخری حضرت امام مہدی علیہ السلام ہیں۔ تمام تر نصوص اور واضح احکامات کے باوجود امت مسلمہ نے آپؐ کے احکامات کی پیروی نہیں کی اور امت مسلمہ کی رہبری اور قیادت کے حوالے سے اختلاف کرگئی۔ امت مسلمہ نے آپؐ کے بعد خاندان نبوتؐ پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیئے۔ تاریخ اسلام سے ان کے تذکرے کو بھی حذف کر دیا گیا، چناچہ جب تاریخِ اسلام کی بات ہوتی ہے۔ تو بنوامیہ اور بنوعباس کے ظالم وجابر اور فاسق وفاجر حکمرانوں کا تذکرہ تو ملتا ہے۔ لیکن دینِ اِسلام کے حقیقی محافظ اور مروج آئمہ اہل بیتؑ کے تذکرے تاریخِ اسلام کے صفحات سے حذف کر دیے گئے ہیں۔ امت مسلمہ جب تک اہل بیتؑ کی قیادت ورہبری کو قبول نہ کرے۔ وہ دنیا وآخرت میں سعادت وسر بلندی حاصل نہیں کر سکے گی۔ یہاں تک کہ رسولؐ اسلام کے آخری جانشین حضرت امام مہدی علیہ السلام کی رہبری میں عالمگیر الٰہی عادلانہ اسلامی حکومت قائم ہوگی اور ظلم وجور کا خاتمہ آپؐ کے ہاتھوں ہوگا۔ اس نصاب میں سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت سیدہ فاطمہ زہراء اور بارہ ائمہ اہل بیتؑ کی سیرت اور تاریخ کو شامل کیا گیا ہے۔

اہداف

اس کورس کو پڑھنے کے بعد طلبا اس قابل ہوجائیں کہ:

۱۔ سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختلف پہلوؤں سے روشناس ہوجائیں۔

۲۔ سیرت سیدہ فاطمہ زہرا السلام اللہ علیہا اور ائمہ اہل بیتؑ کے مختلف انفرادی، اجتماعی، سیاسی، اور معاشرتی اور دینی پہلوؤں سے آگاہی حاصل کریں۔

سبق ۱

خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

(ابتدائی زندگی)

مختصر تعارف

اسم مبارک: محمد

مشہور القاب: امین، صادق

کنیت: ابوالقاسم

تاریخ ولادت: ۱۷، ربیع الاول ۱ عام الفیل

تاریخ وفات: ۲۸، صفر المظفر ۱۱ھ

مقام ولادت: مکہ مکرمہ

مدفن: مدینہ منورہ

والد بزرگوار: حضرت عبداللہ علیہ السلام

عمر مبارک: ۶۳، سال

والدہ ماجدہ: حضرت آمنہ سلام اللہ علیہا

اولاد: حضرت زہراؑ، حضرت قاسمؑ، حضرت ابراہیمؑ

بچپن

جس سال ابرہہ ساٹھ ہزار کی فوج کے ساتھ خانہ کعبہ کی عمارت کو منہدم کرنے آیا تھا اسی سال اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسولؐ کو دنیا میں بھیجا اس سال کو ''عام الفیل'' (ہاتھیوں والا سال) کہا جاتا ہے کیونکہ ابرہہ کے لشکر میں نو یا تیرہ بڑے بڑے ہاتھی بھی موجود تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے ابابیلوں کا لشکر بھیج کر مغرور ابرہہ کے لشکر کا قلع قمع کر دیا۔ آنحضرتؐ کے والد گرامی جناب عبداللہؑ آپؐ کی ولادت سے تھوڑا عرصہ پہلے ہی انتقال فرما گئے تھے۔ ولادت کے بعد رضاعت کے لیے آپؐ کو حلیمہ سعدیہؓ کے سپرد کر دیا گیا جہاں آپؐ دو برس تک رہے۔ اس عرصہ میں حلیمہ سعدیہؓ نے آپؐ کے توسط سے بے شمار فیوض و برکات کا مشاہدہ کیا۔ جب آنحضرتؐ کی والدہ جناب آمنہ سلام اللہ

علیہا کا انتقال ہوگیا تو آپؐ کے دادا جناب عبدالمطلبؑ آپؐ کی پرورش فرمانے لگے۔لیکن دو سال کے بعد وہ بھی داعی اجل ہو گئے۔لیکن اپنی خداداد فہم وفراست کی بناء پر آپؐ کی کفالت وحفاظت کا سارا کام جناب ابوطالبؑ کے حوالے فرما گئے۔ جو اپنی وفات تک اس فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔اس طرح سے کفالت وحفاظت کی کہ ان کے انتقال کے بعد خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے احسانات کو یاد کر کے ان کا مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔

لڑکپن اور جوانی

آپؐ نے دس سال کی عمر سے گلہ بانی کا کام شروع کیا اور اعلیٰ وفراست کی بناء پر بارہ برس کی عمر میں شام کی طرف پہلا تجارتی سفر بھی کیا۔ جب آپؐ اپنے چچا حضرت ابوطالبؑ کے ہمراہ شام جارہے تھے تو راستے میں ایک عیسائی راہب ''بحیرا'' سے ملاقات ہوئی جس نے آپؐ کے سر پر ابر رحمت کو سایہ فگن دیکھ کر جناب ابوطالبؑ کو نصیحت کی کہ اس بچے کی اچھی حفاظت فرمائیں کیونکہ میں اس میں نبیؐ کی صفات دیکھ رہا ہوں اور اگر یہودیوں کو اس بات کی اطلاع ہوگئی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔اس کے بعد جناب ابوطالبؑ اپنے بھتیجے کی حفاظت میں بہت ہی محتاط ہو گئے۔ ۲۵ سال کی عمر میں آپؐ نے دوسرا سفر تجارت کیا اس دفعہ آپ ملیکۃ العرب جناب خدیجہؑ کے مال تجارت کو بیچنے کے لیے لے گئے۔اس سفر میں جناب خدیجہؑ کا غلام میسرہ بھی آپؐ کے ہمراہ تھا۔اس سفر میں حضرت خدیجہؑ کو بہت زیادہ منفعت حاصل ہوئی۔ ادھر میسرہ نے دوران سفر پیش آنے والے حالات اور واقعات اور آپؐ کے فضائل وکمالات کا تذکرہ جب جناب خدیجہؑ کے سامنے کیا تو آپؐ کی ایمانداری اور صداقت نے حضرت خدیجہ (س) کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ انہوں نے کچھ عرصہ بعد آنحضرتؐ کو شادی کا پیغام بھیجا جسے آپؐ نے قبول فرمالیا۔اس طرح آپؐ کا عقد جناب خدیجہؑ سے طے پایا۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عقد جناب ابوطالبؑ نے پڑھا۔عقد کے موقع پر جناب ابوطالبؑ نے ایک تاریخی خطبہ بھی پڑھا جو مطالب کے اعتبار سے بھی بے نظیر ہے اور اخلاص عمل کے اعتبار سے بھی اسلام میں عقد کا ایک حصہ قرار پا گیا۔

اخلاق واوصاف

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بنی نوع انسان کے لیے رحمت وبرکت بنا کر بھیجا۔قرآن مجید میں ارشاد قدرت ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ﴿۱۰۷﴾

اور ہم نے تمہیں تمام عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ (سورۃ الانبیاء)

جہاں آپؐ کا وجود پرنور بنی نوع انسان کے لیے رحمت وبرکت ہے وہاں آپؐ کے اسوہ حسنہ اور سیرت کی

پیروی تمام انسانوں کے لیے دنیا و آخرت میں کامیابی اور نجات کی ضامن ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد قدرت ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

بتحقیق تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں بہترین نمونہ ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راست گوئی اور امانت داری میں اس قدر معروف تھے کہ کفار مکہ بھی آپؐ کو صادق و امین کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ آپؐ تمام لوگوں سے زیادہ دانا، شجاع، عادل اور مہربان تھے۔ ہمیشہ غور فکر میں رہتے بغیر ضرورت کے بات نہیں کرتے تھے۔ راستہ چلتے ہوئے آپؐ کی آنکھیں نیچی ہوتیں اور نہایت وقار کے ساتھ چلتے تھے۔ سختی اور بے رحمی آپؐ کے خلق کریم میں نہیں تھی۔ آپؐ کسی کو حقیر نہیں سمجھتے تھے، تھوڑی نعمت کو زیادہ سمجھتے اور کسی نعمت کی مذمت نہیں فرماتے تھے۔ قہقہہ لگانے کی بجائے تبسم فرماتے تھے۔ آپؐ ہر شخص کو اس کے علم اور دینی فضیلت کی بناء پر ترجیح دیتے تھے۔ آپؐ کے نزدیک زیادہ فضیلت والا وہ شخص تھا جو مسلمانوں کا زیادہ خیر خواہ ہوتا اور آپؐ کے نزدیک زیادہ عظمت اس شخص کی تھی جو لوگوں سے مواسات (ایثار)، اعانت، اور مدد کرتا تھا۔ اگر آنحضرتؐ کے آداب مجلس پر نگاہ ڈالی جائے۔ تو آپؐ یا خدا کے بغیر کسی مجلس میں اٹھتے بیٹھتے نہیں تھے، مجلس میں اپنے لیے کوئی مخصوص جگہ مقرر نہیں کی گئی تھی بلکہ اس سے منع فرمایا کرتے تھے۔ جب کسی مجلس میں تشریف لاتے تو سب سے آخر میں خالی جگہ پر بیٹھ جاتے۔

آپؐ کی حسن معاشرت اس طرح کی تھی کہ ہر کوئی یہی گمان کرتا تھا کہ میں آپؐ کے نزدیک زیادہ عزت دار ہوں۔ لوگوں کی غلطیوں پہ پردہ پوشی فرماتے تھے۔ ہر کسی سے تواضع، انکساری سے پیش آیا کرتے تھے۔ بڑوں کی عزت و توقیر کرتے اور چھوٹوں پر رحم و شفقت فرماتے تھے۔ اہل مجلس کے ساتھ آپؐ کا برتاو یہ تھا کہ ہمیشہ کشادہ روئی اور نرم خوئی سے پیش آیا کرتے۔ آپؐ کی ہم نشینی سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ آپؐ نہ کسی کو نازیبا الفاظ القاب دیتے۔ نہ تو لوگوں کی زیادہ خوشامد اور تعریف کرتے تھے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسولؐ خاک پر بیٹھتے، خاک پر بیٹھ کر کھانا کھاتے، گوسفند اپنے ہاتھ سے باندھتے اور اگر کوئی غلام آپؐ کو جو کی روٹی کے ساتھ بھی اپنے گھر بلاتا۔ تو آپؐ اس کی دعوت کو قبول فرماتے تھے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص بھی تکبر کرتا ہے خدا اسے محروم کرتا تھا اور جو موت کو زیادہ یاد کرے خدا اسے دوست رکھتا ہے۔ الغرض آنحضرتؐ کی ولادت با سعادت تمام آداب حسنہ، اخلاق حسنہ اور اطوار حسنہ کے ساتھ ہوئی۔ آپؐ کی شخصیت علم و حلم، کرم و سخاوت، عفت اور اخلاص سے مزین تھی۔

سبق2

بعثت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آنحضرتؐ کا معمول تھا کہ آپؐ اکثر غار حرا میں چلے جاتے اور وہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے۔اس روز بھی آپؐ غار حرا میں مصروف عبادت تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سید الملائکہ حضرت جبرائیل کو وحی دے کر آپؐ پر نازل فرمایا۔امام حسن عسکری علیہ السلام کی روایت ہے کہ جب آنحضرتؐ کی عمر ۴۰ سال کو پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے دل کو زیادہ خشوع کرنے والا، زیادہ مطیع اور تمام دلوں سے زیادہ بزرگ پایا۔پس آپؐ کی آنکھوں کو مزید نور بخشا اور حکم دیا کہ آسمان کے دروازے کھول دیے جائیں اور ملائکہ فوج درفوج زمین کی طرف آنے لگے اور آنحضرتؐ انہیں دیکھتے تھے پس حضرت جبرائیلؑ نازل ہوئے اور انہوں نے اطراف زمین وآسمان کو گھیر لیا اور آنحضرتؐ کا بازو ہلا کر عرض کیا: پڑھیے ،آپؐ نے فرمایا: کیا پڑھوں؟ تو حضرت جبرائیلؑ فرمانے لگے:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ ۚ‏ ﴿۱﴾

(اے رسول) پڑھیے! اپنے پروردگار کے نام سے جس نے خلق کیا۔ (سورۃ العلق)

پس خدا کی وحی آپؐ تک پہنچائی اور یوں نبوت کا تاج آپؐ کے سر پر رکھ دیا گیا۔جب آپؐ گھر پہنچے تو جناب خدیجہؓ نے عرض کیا: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ کیا نور ہے کہ جو میں آپؐ کے وجود میں دیکھ رہی ہوں؟ فرمایا یہ نور نبوت ہے تم کہو :

لا الہ الا اللہ، محمدؐ رسول اللہ

جناب خدیجہؓ عرض کرنے لگیں کہ مجھے تو کئی سال سے آپؐ کی نبوت کا علم ویقین ہے پھر انہوں نے آپؐ کی نبوت کی گواہی دی اور آنحضرتؐ پر ایمان لے آئیں۔آپؐ نے فرمایا: اے خدیجہؓ مجھے کچھ سردی محسوس ہو رہی ہے مجھ پر کوئی چادر ڈال دیں جب آپؐ سو گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا:

يٰۤاَيُّهَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ‏ ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۙ‏ ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ﴿۳﴾

اے چادر اوڑھنے والے! اٹھو اور لوگوں کو عذاب خدا سے ڈراؤ اور اپنے پروردگار کی بزرگی بیان کرو۔

پس آنحضرتؐ کھڑے ہوئے اور نعرہ تکبیر ''اللہ اکبر'' بلند کیا تو آپؐ کی آواز ہر موجود تک پہنچ گئی۔اور تمام موجودات آپؐ کے ہم آواز ہو گئے۔

بعثت سے ہجرت مدینہ تک

آنحضرتؐ مبعوث بہ رسالت ہونے کے بعد ۳ سال تک مخفیانہ طور پر لوگوں کو دین کی طرف دعوت دیتے رہے۔ تین سال کے بعد آپؐ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ اب اعلانیہ طور پر لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیں۔ پس آپؐ کوہ صفاء تشریف لے گئے اور لوگوں کو دین مبین کی دعوت دی اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا۔ لوگوں کی ایک قلیل جماعت آپؐ پر ایمان لے آئی اور آپؐ کا ساتھ دینے لگی۔ آپؐ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور عبادت کی طرف دعوت دینے لگے اور ان کو بتوں کی پوجا سے منع فرمانے لگے۔

چنانچہ مکہ کے کفار و مشرکین طرح طرح سے آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو اذیتیں دینے لگے اور جس شخص کو جسمانی اذیت نہیں پہنچا سکتے تھے اسے زبانی تکلیف پہنچاتے اور جس کا کوئی قوم و قبیلہ نہ تھا اس کو عذاب و عتاب کا شکار بناتے یا مکہ کی گرمی میں اسے بھوکا اور پیاسا کھڑا کر دیتے تھے۔ بعض اوقات اسے لوہے کی ذِرہ پہنا کر سورج کے سامنے کھڑا کرتے تا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے دین سے دستبردار ہو جائے۔ ادھر دو برس کی عمر میں آپؐ کے فرزند حضرت قاسمؑ کا انتقال ہو گیا۔ تو دشمن نے آپؐ کو روحانی اذیت پہنچانی شروع کر دی۔ وہ آپؐ کو ابتر کہہ کر پکارنے لگے گویا آپؐ کی نسل کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے اور جس کی نسل ہی باقی نہ رہے تو اس کا دین مذہب کیا باقی رہے گا۔

قدرت نے اس طعنہ ابتر کے جواب میں ۲۰ جمادی الثانی ۵ بعثت کو سرچشمہ کوثر حضرت فاطمہ علیہا السلام جیسی مقدس ہستی کا تحفہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عنایت فرمایا اور آپؐ کے دشمن کے ابتر ہونے کا اعلان کر دیا۔ جب کفار قریش کے ظلم وستم بہت زیادہ بڑھ گئے اور مسلمانوں کے لیے مزید صبر و برداشت مشکل ہو گیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت چاہی کہ وہ کسی اور شہر چلے جائیں چنانچہ آنحضرتؐ نے انہیں اجازت دی کہ وہ حبشہ کے ملک کی طرف ہجرت کو جائیں کیونکہ حبشہ کے لوگ عیسائی ہیں اور ان کا بادشاہ نجاشی ایک رحم دل انسان ہے۔ چنانچہ ۸۰ کے قریب خواتین اور مردوں پر مشتمل ایک وفد نجاشی بادشاہ کی پناہ میں حبشہ پہنچ گیا اور وہاں امن و امان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔ جب مشرکین مکہ نے دیکھا کہ مسلمان ہجرت کر کے بادشاہ حبشہ کے پاس جا پہنچے ہیں اور مکہ کے باقی ماندہ مسلمان جناب ابو طالبؑ کی پناہ میں ہیں تو انھوں نے ایک جلسہ کیا اور تمام قریش نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل پر اتفاق کر لیا۔

جب حضرت ابو طالبؑ کو خبر ملی تو انہوں نے اولاد ہاشم و عبد المطلب کو جمع کیا۔ اور ان کے اہل و عیال سمیت اس درّہ میں سکونت اختیار کر لی۔ جسے ''شعب ابو طالب'' کہتے ہیں اور اس درّے کے دونوں اطراف میں نگہبان مقرر کر دیے۔ رات کے وقت اپنے بیٹے حضرت علی علیہ السلام کو بستر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلاتے اور رسول اکرمؐ کو علیؑ کے بستر پر

سلا دیتے تا کہ دشمن کے حملہ کی صورت میں آپ ؐمحفوظ رہیں۔ حضرت حمزہ ؓ ساری رات تلوار لے کر آنحضرت ؐ کے گرد گھومتے رہتے۔ جب کفار نے دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کسی بھی طرح رسائی ممکن نہیں ہے تو ان کے سرداروں میں سے ۴۰ افراد دارالندوہ میں جمع ہو گئے اور عہد کیا کہ اولاد عبدالمطلب اور بنو ہاشم کے ساتھ معاشی و معاشرتی بائیکاٹ کر دیا جائے اور ہر قسم کا تعلق ان کے ساتھ ختم کر دیا جائے جب تک کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے قبضہ میں نہ دے دیں تا کہ انہیں قتل کر دیں۔

اس معاہدے کے بعد اہل مکہ میں سے کسی بھی شخص کو ان کے ساتھ خرید و فروخت کی جرأت نہ رہی۔ خلاصہ یہ ہے کہ ۳ سال تک کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک یہ سلسلہ جاری رہا اور یہ عرصہ اولاد ہاشم و عبدالمطلب نے انتہائی بھوک، افلاس اور کسمپرسی کی حالت میں گزارا۔ یہاں تک کہ بعض مشرکین اس عہد و پیمان پر نادم و پشیمان ہوئے اور بالآخر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس عہد نامے کی تحریر کے بارے میں کی گئی درست پیشین گوئی کے بعد بائیکاٹ ختم کر دیا گیا۔ بعثت کے دسویں سال جناب ابوطالب ؑ اور جناب خدیجہ (س) کی وفات ہوگئی، اُن ہستیوں کی وفات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہت گراں گزری اسی لیے آپ ؐ نے اس کو ''عام الحزن'' یعنی غم اور دکھ کا سال قرار دیا۔

سبق 3

ہجرت مدینہ سے فتح مکہ تک

حضرت ابوطالب ؑ کی وفات کے بعد اسلام اور مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ چنانچہ جب مکہ میں مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم دے دیا۔ چنانچہ آپ ؐ ۲ ربیع الاول ۱۳ بعثت کو رات کے وقت مکہ سے مدینہ کی طرف نکل پڑے۔ یہ وہ رات تھی جب کفار مکہ آپ ؐ کے قتل کی سازش کے تحت آپ ؐ کے گھر کا محاصرہ کر چکے تھے۔ مگر آپ ؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے بستر پر لٹایا اور خود معجزانہ طور پر کفار کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر مکہ سے نکل گئے۔ آپ ؐ نے مدینہ کے قریب مقام قباء میں چار روز تک قیام فرمایا۔ تین روز بعد حضرت علی علیہ السلام بھی چند خواتین بنی ہاشم کے ہمراہ آن پہنچے۔

آپ ؐ نے قباء کے مقام پر پہلی مسجد کی بنیاد رکھی اور ۲۲ ربیع الاول کو مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ آپ ؐ ایک ناقہ پر سوار تھے مدینہ کے لوگ چھتوں پر چڑھ کر آپ ؐ کا استقبال کر رہے تھے۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے گھر قیام فرمائیں مگر آپ ؐ کا اعلان تھا کہ جہاں یہ ناقہ بیٹھ جائے گی وہی میری قیام گاہ ہوگی۔ چنانچہ ناقہ حضرت ابوایوب انصاری ؓ کے گھر کے سامنے رک گئی اور آنحضرت ؐ نے ان کے گھر میں قیام فرمایا اور وہیں سے تبلیغ اسلام کا سلسلہ شروع ہوا۔ مدینہ کا اصل نام ''یثرب'' تھا۔ جہاں یہودیوں کا کاروبار تھا، اوس و خزرج کے قبائل زراعت کا کام کرتے تھے۔ کل ۲۷ قبائل آباد تھے آپ ؐ ۷ ماہ مدینہ میں قیام کرنے کے بعد اسعد بن زرارہ کے دو یتیم بچے سہل اور سہیل کی زمین دس دینار میں خریدی تا کہ اس پر مسجد تعمیر کی جائے، اس طرح آپ ؐ نے مدینہ میں ''مسجد نبوی ؐ'' کی تعمیر

فرمائی۔ آپؐ نے مدینہ پہنچ کر مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کے درمیان مؤاخات قائم کیا۔ مدینہ میں انصار نے مواخات کا حق ادا کیا اور اپنے جملہ اموال میں مہاجرین کو شریک بنالیا۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد مہاجرین نے اپنے کاروبار شروع کر دیئے، چونکہ مدینہ میں مختلف قبائل اور قومیں آباد تھیں لہٰذا ان کو اختلافات سے دور رکھنے کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک عہد نامہ تیار کیا جس میں مسلمان، یہود اور مدینہ کے تمام قبائل شامل تھے۔ مشہور روایات کی بنا پر اس معاہدے میں ۴۷ دفعات تھیں جو ایک عام اجتماعی زندگی کے لیے مکمل دستور العمل کی حیثیت رکھتی تھیں۔

جنگ بدر

آنحضرتؐ نے فتح مکہ سے قبل ۱۰ سال مدینہ میں گزارے۔ اس دوران کفار مکہ کی طرف سے مزاحمتوں کا سلسلہ جاری رہا، چناچہ ہجرت کے دوسرے سال رمضان المبارک کے مہینے میں بدر کے مقام پر کفار سے جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کا کل سامانِ جنگ ۳۰ گھوڑے، ۷۰ اونٹ، ۸ تلواریں اور ۲ زرہیں تھیں اور افراد کی تعداد ۳۱۳ تھی۔ ادھر دشمن کی فوج جنگی سامان سے مسلح اور ۹۵۰ افراد پر مشتمل تھی۔ بدر کا معرکہ اگرچہ پہلا معرکہ تھا اور لشکر اسلام انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں تھا لیکن نصرت خداوندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفار کے اکثر سردار مارے گئے اور ان کے حوصلے پست ہوگئے اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہوگئے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کے ۱۴ افراد شہید ہوئے جبکہ کفار کے ۷۰ افراد مارے گئے اور ۷۰ افراد اسیر ہوگئے۔

جنگ اُحد

جنگ بدر کی شکست کے بعد کفار مکہ کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ چنانچہ ایک سال جنگ کی تیاری کرانے کے بعد ۳ھ میں احد کے مقام پر دوبارہ مسلمانوں کے مدمقابل آگئے۔ اس میں کفار کے لشکر کی تعداد ۳۰۰۰ تھی اور مسلمانوں کی تعداد ۱۰۰۰ تھی۔ جن میں سے ۳۰۰ افراد عبداللہ ابن ابی منافق کے ہمراہ تھے۔ جو راستے سے ہی واپس لوٹ گئے۔ بہر حال جنگی حکمت عملی کے تحت آنحضرتؐ نے ۵۰ تیراندازوں کا دستہ درّے پر نصب فرمایا اور انہوں نے مسلمانوں کی ابتدائی فتح میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن جوں ہی مال غنیمت جمع کرنے کا وقت آیا تو بعض اصحاب مال غنیمت کی لالچ میں نیچے اتر آئے جس کے نتیجے میں کفار مکہ نے دوبارہ حملہ کر دیا اور مسلمانوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ آنحضرتؐ کے چچا سید الشہیدا حضرت حمزہؓ بھی اسی معرکہ میں شہید ہوئے اور خود آنحضرتؐ بھی زخمی ہوگئے۔

جنگ خندق

بدر اور اُحد کے بڑے معرکوں کے بعد کفار مکہ نے اس بات کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا کہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں لہٰذا یہ طے کیا کہ مدینہ کے یہودیوں سے ساز باز کر کے مشترکہ حملہ کیا جائے۔ اس طرح مدینہ پر ایک بڑے حملے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ ادھر یہ خبر پاتے ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام اصحاب کو اکٹھا کیا اور بالآخر

جناب سلیمان فارسیؓ کے مشورے سے مدینہ کے اردگرد خندق کھودنے کا پرگرام مرتب کرلیا گیا۔ ماہ رمضان ۵ھ میں کھودی گئی، شوال کے مہینے میں کفار مکہ نے مدینہ پر چڑھائی کردی مگر ۲۰ دن تک کوئی بھی شخص خندق پار نہ کرسکا۔ دشمن کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی ادھر خداوند عالم نے ان کی طرف آندھی بھیجی، جس نے کفار کے لشکر میں تہلکہ مچادیا اوران کے خیمے اکھڑ گئے اس طرح کفار کو فرار اور بھاگنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔

صلح حدیبیہ

۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرہ کے لیے ماہ ذی القعدہ میں مکہ جانے کا ارادہ کیا۔ آپؐ کے ہمراہ اس سفر میں تقریباً ۱۰۰۰ سے زائد مسلمان تھے۔ جب یہ خبر مشرکین کو ملی تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور طے کیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خانہ خدا کی زیارت سے باز رکھا جائے۔ حدیبیہ کے مقام پر آپؐ کو کفار مکہ کے اس ارادے کی خبر موصول ہوئی تو آپؐ نے ان کو پیغام بھیجا کہ ہم جنگ کرنے نہیں آئے بلکہ عمرہ کرنا چاہتے ہیں یہ پیغام حضرت عثمان اور دیگر دس مہاجرین لے کر مکہ گئے۔ اچانک لشکر اسلام میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمان اوران کے دس افراد کو قتل کردیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک درخت کے نیچے آنحضرتؐ نے اپنے اصحاب سے بیت لی کہ اگر جنگ ہوگئی تو وہ جنگ سے دست بردار نہیں ہوں گے اس کو ''بیعت رضوان'' کہتے ہیں اس بیعت سے قریش کے دلوں میں خوف وہراس پیدا ہوگیا۔

چنانچہ انہوں نے سہیل بن عمرو اور حفص بن احنف کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا تاکہ قریش اور آنحضرتؐ کے درمیان صلح ہوجائے، چنانچہ قریش اور آنحضرتؐ کے درمیان مصالحت ہوگئی اور صلح نامہ لکھا گیا کہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دس سال تک مسلمانوں اور قریش کے درمیان جنگ نہیں ہوگی اور طرفین ایک دوسرے کے مال وجان کو نقصان نہیں پہنچائیں گئے۔ ایک دوسرے کے شہروں کی طرف بغیر کسی روک ٹوک کے سفر کریں گے اور کفار میں سے جو مسلمان ہوجائے تو قریش اس کو کچھ نہیں کہیں گے اور آئندہ سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج وعمرہ ادا کریں گے لیکن مسلمان تین دن سے زیادہ مکہ میں قیام نہیں کریں گے۔

اس معاہدے کے بعد مسلمان مدینہ کی طرف لوٹ گئے۔

جنگ خیبر

حدیبیہ سے واپس آنے کے بعد تقریباً ۲۰ دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں رہے اور پھر ایک ہزار چار سو ۱۴۰۰ افراد لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔ خیبر کے سات مضبوط قلعے تھے۔ مسلمانوں کا لشکر دیکھ کر یہودی اپنے اپنے قلعوں میں بند ہوگئے، بہرحال مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور کچھ قلعے مسلمانوں نے فتح کر

لیے اور قلعہ قموص کا محاصرہ کرلیا۔ یہ قلعہ سخت اور مضبوط تھا حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دردشقیقہ میں مبتلا تھے۔

جس کی وجہ سے میدان میں نہ آسکے ادھر روز ایک صحابی علم لے کر جاتا جنگ کرتا مگر لشکر کے ہمراہ شکست کھا کر واپس جاتا، یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں کل یہ علم ایسے شخص کو دوں گا جو کرار ہوگا اور غیر فرار ہوگا جو خدا اور رسول کو دوست رکھتا ہے اور اس کو خدا اور اس کا رسول دوست رکھتے ہیں اور خداوند عالم اس کے ہاتھ پہ خیبر فتح کرے گا۔ دوسرے دن تمام صحابہ جمع ہوئے ہر ایک کی خواہش تھی کہ یہ سعادت مجھے نصیب ہو مگر آپؐ نے فرمایا: علی کہاں ہے؟ اصحاب نے بتایا کہ وہ آشوب چشم میں مبتلا ہیں اور اٹھ نہیں سکتے۔

آپؐ نے فرمایا انہیں لے آئیں۔ سلمہ بن اکوع گیا اور حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے آیا۔ آنحضرتؐ نے آپؑ کا سر اپنے زانو پر رکھا اور لعاب دہن آپؑ کی آنکھوں پر لگایا، اسی وقت علیؑ کی آنکھیں شفایاب ہوگئیں۔ حضرت علیؑ کو لشکر کا علم عطا فرمایا اور آپؑ نے قلعہ قموص کے بہت بڑے جری اور جنگجو مرحب کا ذوالفقار کی ایک ہی ضربت سے کام تمام کردیا۔ اپنے سردار کو قتل ہوتا دیکھ کر یہودی قلعے کی طرف بھاگے اور بڑی مضبوطی سے دروازہ بند کرلیا۔ مگر حیدر کرارؑ نے قوت ربانی سے اس کو اکھاڑا اور قلعہ کے گرد کھودی گئی خندق پر پل بنادیا۔ جس سے مسلمانوں کا سارا لشکر قلعے میں پہنچ گیا اور یوں امیر المومنین علیؑ کے ہاتھوں پر مسلمانوں کو خیبر کی فتح نصیب ہوگئی۔

فتح مکہ

رسول خداؐ اور قریش کے درمیان حدیبیہ کے مقام پر جو صلح ہوئی۔ اس کی شرائط میں یہ بات بھی داخل تھی کہ دونوں طرف کے ہم خیال اور پڑوسیوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ قبیلہ بنی بکر قریش مکہ کے خلیف اور ہم خیال تھے، جبکہ بنوخزاعہ اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم خیال اور حریف تھے۔ بنوخزاعہ اور بنوبکر کے درمیان سخت دشمنی تھی۔ ایک دفعہ بنوبکر کا ایک شاعر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو (ہتکِ حرمت) میں اشعار پڑھ رہا تھا تو بنی خزاعہ کے ایک غلام نے اسے منع کیا لیکن وہ نہ مانا تو اس غلام نے اس کی زبردست پٹائی کردی۔

جس پر بنوبکر بنوخزاعہ سے جنگ کرنے کے لیے اکٹھے ہوگئے اور قریش سے مدد مانگی۔ کفار قریش نے حدیبیہ کے مقام پر آنحضرتؐ سے جو معاہدہ کیا تھا وہ توڑ دیا اور بنوبکر کی مدد کی۔ اس لڑائی میں بنوخزاعہ کے ۲۰ آدمی مارے گئے۔ آنحضرتؐ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپؐ نے تمام مسلمانوں کو مسلح ہو کر مکہ کی طرف پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ چنانچہ ۲ یا ۱۰ رمضان المبارک ۸ھ کو آپؐ مدینہ سے دس ہزار جانثاروں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ راستے میں آنحضرتؐ کے چچا جناب عباس بن المطلبؓ بھی آپؐ سے آملے جو مکہ سے اہل وعیال کے ہمراہ مدینہ کی طرف آرہے تھے۔

ابھی لشکر اسلام مکہ سے باہر تھا کہ ابوسفیان وہاں آن پہنچا جناب عباسؓ نے اسے پناہ دی۔ اور اسے اسلام لانے کا مشورہ دیا تاکہ اس کو امان مل جائے چنانچہ مجبوراً وہ اظہار اسلام پر آمادہ ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے امان دے دی اور ساتھ ہی اعلان فرمایا کہ جو شخص بھی ابوسفیان، خانہ کعبہ یا بیت النبیؐ میں پناہ لے گا تو اس کو امان حاصل ہو گی۔ اس کے بعد مسلمانوں کا لشکر مکہ میں داخل ہو گیا خانہ کعبہ میں نماز ادا کی گئی اس کے بعد آپؐ نے مشرکین کو ان کے جرائم اور مظالم یاد دلائے اور ان سے سوال کیا کہ تم لوگ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو تو سہیل بن عمر نے کہا آپؐ خود کریم ہیں اور ایک کریم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا جاؤ میں نے تم سب کو آزاد کر دیا اس کے بعد عرب کے اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا اور لشکر اسلام ۱۰، ۱۵ یا ۱۸ دن قیام کرنے کے بعد واپس مدینہ چلا گیا۔

فتح مکہ کے بعد ۹ ھ میں ۲۴ ذی القعدہ کو نصاریٰ نجران سے مباہلہ ہوا جو حضرت عیسیٰؑ کو خدا مانتے تھے اور قرآنی آیات پر ایمان نہ لائے بلکہ آپؐ کو مباہلہ کے لیے دعوت دی تو آپؐ نے حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کو ساتھ لیا اور مباہلہ کے لیے میدان میں آ گئے۔ مگر ان عظیم الشان ہستیوں کی بددعا کے لیے ہاتھ بلند کرنے سے پہلے عیسائی گھبرا گئے اور شکست تسلیم کر لی اور جزیہ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

الغرض ہجرت مدینہ کے بعد کفار کی طرف سے مسلسل مزاحمتوں اور جنگوں کا سلسلہ جاری رہا بعض معرکوں میں آپؐ نے خود شرکت فرمائی جسے غزوہ کہتے ہیں اور غزوات کی تعداد ۲۶ یا ۲۸ ہے۔ اور بعض معرکوں میں دوسرے مسلمانوں کو سردار بنا کر بھیجا جنہیں ''سریہ'' کہا جاتا ہے۔ جنکی تعداد تقریباً ۲۶ ہے۔ بہر حال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دس سالہ مدنی زندگی کے دوران تمام ذمہ داریوں کے علاوہ ان معرکوں کو بھی برداشت کرنا پڑا جو آپؐ کے عظیم کردار اور اعلیٰ قیادت کی دلیل ہے۔

حجۃ الوداع

ہجرت کے دسویں سال اللہ تعالیٰ کے حکم سے آنحضرتؐ نے لوگوں میں حج بیت اللہ کا اعلان فرمایا یہ آپؐ کی زندگی کا پہلا اور آخری حج تھا، آپؐ کا قافلہ حج ۲۵ ذی القعد کو مدینہ سے روانہ ہوا۔ آپؐ کے قافلہ میں لاکھوں مسلمان آپؐ کے ہمراہ تھے۔ حضرت علیؑ بھی یمن سے قربانی کے جانور لے کر مکہ آ گئے تمام مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے اعمال حج بجالائے، اعمال حج سے فارغ ہوئے تو ایک لاکھ چوبیس ہزار اصحاب کے ہمراہ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔

اعلانِ غدیر

جب آپؐ غدیرخم کے مقام پر پہنچے تو حضرت جبرائیلؑ وحی لے کر نازل ہوئے اور اللہ کا حکم پہنچایا۔ یہ حکم پاتے ہی نبی کریم ﷺ نے سخت گرمی کے باوجود اس بے آب وگیاہ زمین پر تمام قافلوں کو اترانے کا حکم دے دیا۔ پھر ایک خطبہ ارشاد فرمایا جو حمد ثناء الٰہی پر مشتمل تھا اور لوگوں کو وعظ ونصیحت فرمائی پھر آپؐ نے ان کے درمیان بلند آواز میں پکار کر فرمایا: کیا تمہاری جانوں اور مالوں پر تم سے زیادہ میں حق نہیں رکھتا ہوں؟ تو سب نے کہا بے شک۔ پھر آپؐ نے حضرت علیؑ کے دونوں بازو پکڑ کر انہیں بلند کیا اور فرمایا:

من کنت مولاہ فعلی مولاہ

''جس جس کا میں مولا ہوں اُس اُس کے علیؑ مولا ہیں۔''

پھر فرمایا: خدایا! اس کو دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اس کا دشمن ہو جائے جو علیؑ سے دشمنی کرے۔ اور اس کی مدد کر جو علیؑ کی مدد کرے اور اس کو چھوڑ دے جو علیؑ کو چھوڑ دے۔ یوں رسول اکرم ﷺ نے اپنی جانشینی وخلافت اور امامت کا عہدہ حضرت علیؑ کے کندھوں پر ڈال دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ امیر المؤمنین علیؑ کو مبارکباد پیش کریں۔

وفات

حج سے واپس آ کر آپؐ اکثر علیل رہنے لگے آپؐ نے اسی دوران اسامہ بن زید کی سرکردگی میں ایک لشکر روم کی جانب روانہ کر دیا جس سے بعض اصحاب نے روگردانی کی اور واپس آ گئے۔ لشکر کی روانگی کے بعد آپؐ کی مرض میں شدت سے اضافہ ہونے لگا۔ آخری وقت آپؐ نے حضرت علیؑ کو وصیتیں فرمائیں۔ اس کے بعد امیر المومنین علیؑ نے تجہیز و تکفین کی اور اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کیا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

سبق 4

حضرت امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام

مختصر تعارف

اسم مبارک: علی

مشہور القاب: امیر المومنین، ابوتراب

تاریخ ولادت: ۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل

تاریخ شہادت: ۲۱ رمضان المبارک ۴۰ ھ

مقام ولادت: خانہ کعبہ (مکہ مکرمہ)

مدفن: نجف اشرف (عراق)

والد بزرگوار: حضرت ابوطالب علیہ السلام

عمر مبارک: ۶۳ سال

والدہ ماجدہ: حضرت فاطمہ بنت اسد سلام اللہ علیہا

مدت امامت: ۴ سال ۹ ماہ

کنیت: ابوالحسن

اولاد: ۲۴ اولادیں

اخلاق واوصاف

امیر امئومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنی بیشتر زندگی رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر سایہ گزاری۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ علیہ السلام سے بے حد محبت کیا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ولادت کے بعد سے ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا اور امیر المؤمنین علیہ السلام نے بھی اپنی زندگی کو مکمل طور پر آنحضرتؐ کے کردار اور سیرت کے ڈھانچے میں ڈال دیا۔

چناچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ کو شہر علم وحکمت کا دروازہ اور امت کا بہترین قاضی قرار دیا اور اسلام میں جتنی عظیم شخصیتیں فقہی، ادبی، اخلاقی یا روحانی قسم کی پائی جاتی ہیں سب کا سلسلہ شاگردی آپؑ ہی کی ذات اقدس پر منتہی

ہوتا ہے۔امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی شخصیت علم،حکمت و دانائی،عبادت،سخاوت،شجاعت اور صبر و تحمل جیسی صفات سے مزین تھی۔امیر المؤمنین علی علیہ السلام کھانے میں سادہ غذا استعمال کیا کرتے تھے ہمیشہ جَو کی روٹی نوش فرماتے۔آپؑ نے کبھی گندم استعمال نہ کی۔اگر آپؑ کا لباس دیکھا جائے تو باوجود اس کے کہ خلیفہ المسلمین تھے مگر پھر بھی پیوندار لباس پہنتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اس میں اتنے پیوند لگا چکے ہیں کہ اب تو رفو کرنے والے سے بھی شرم آتی ہے۔آپؑ محنت مزدوری کے ذریعہ اپنے گھر کے اخراجات پورے کیا کرتے تھے۔

عبادت خدا کا یہ عالم تھا کہ آپؑ دن رات میں ایک ہزار اکیاون رکعت نماز پڑھتے تھے۔اور جب رات کی تاریکی میں محراب مسجد میں کھڑے ہوتے تو خوف خدا سے جسم کانپ رہا ہوتا تھا اور داڑھی آنسوؤں سے بھیگ جایا کرتی تھی۔پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے بڑے عابد اور متقی انسان تھے۔دن روزے میں اور رات اللہ کی عبادت میں گزارتے تھے۔

چنانچہ امام علی زین العابدین علیہ السلام فرماتے تھے کہ کسی شخص میں اس قدر استعداد اور طاقت کہاں ہے کہ وہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام جیسی عبادت کر سکے۔اللہ تعالیٰ کے حضور خوف خدا سے کانپنے والے علی ابن ابی طالب علیہ السلام جب راہ خدا میں جہاد کے لیے نکلتے تھے تو کفار مکہ اور خیبر کے بڑے بڑے سورما بھی آپؑ کا نام سن کر لرز جاتے تھے لیکن حلیم الطبع اتنے تھے کہ دشمن پر بھی غلبہ پا لینے کے بعد معاف فرما دیتے تھے۔آپؑ ہمیشہ غرباء،مساکین اور غلاموں کے ساتھ احسان فرمایا کرتے تھے۔حتیٰ کہ رات کی تاریکی میں اپنی پشت پر ضرورت کا سامان رکھ کر غرباء و مساکین کے گھروں میں پہنچا آتے تھے اور ان لوگوں کو خبر تک بھی نہیں ہوتی تھی۔

آپؑ جود و سخا میں اس درجہ پر فائز تھے کہ آپؑ کے ایک حریف نے آپؑ کی سخاوت کی گواہی دیتے ہوئے کہا:"اگر علی علیہ السلام کے پاس ایک گھر سونے سے بھرا اور دوسرا گھاس سے بھرا ہو۔تو وہ پہلے سونے سے بھرے گھر کا صدقہ کریں گے۔یہاں تک کہ اُس میں سے کچھ بھی باقی نہ بچے۔امیر المؤمنین علیہ السلام کی بہت بڑی خصوصیات آپؑ کا عدل تھا۔

ایک مرتبہ آپؑ کے بھائی جناب عقیلؑ نے بیت المال سے اپنے حق سے کچھ زائد حصہ طلب فرمایا۔تو آپؑ نے آگ میں گرم کی ہوئی ایک سلاخ ان کے ہاتھ پر لگائی تو وہ چیخ پڑے۔پھر آپؑ نے فرمایا:اے عقیلؑ!تو دنیا کی اس آگ سے ڈرتا ہے تو کیا میں جہنم کی آگ کے عذاب سے نہ ڈروں!؟آپؑ نے اپنی عدالت کے باعث ہی امیر شام اور دوسرے ظالم حکمرانوں کی حکمتوں کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔لبنان کے مشہور عیسائی مصنف جورج جورداق کے الفاظ ہیں کہ امام علی علیہ السلام اپنی شدت عدالت کی وجہ سے قتل ہوئے۔مختصر یہ کہ آپؑ کی پوری زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت اور دین

اسلام کی ترویج واشاعت میں گزری۔

احوال وواقعات

امام علیؑ کی زندگی کو مجموعی طور پر دوحصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔امیر المؤمنین علیہ السلام زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں

۲۔امیر المؤمنین علیہ السلام وفات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امام علیہ السلام کے ان دوادوار کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔امیر المؤمنینؑ زمانہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں

امیر المؤمنینؑ حضرت علی علیہ السلام کو یہ افتخار حاصل ہے کہ آپؑ نے اپنے بچپنے ہی سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں پرورش پائی۔حضرت زید بن علی بن حسینؑ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گوشت اور کھجور کو پنے منہ سے نرم کر کے حضرت امام علی علیہ السلام کے دہن مبارک میں رکھتے تھے تاکہ آپؑ کو کھانے میں آسانی رہے اسی قرابت کی وجہ سے حضرت علی علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے پہلے شخص تھے۔

آپؑ خود فرماتے تھے کہ ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کسی اور نے مجھ سے پہلے نماز نہیں پڑھی''۔کم سنی میں ہی اسلام کی طرف آپؑ کی رغبت اور رسول خداؐ پر ایمان آپ کی فکری بلوغت کی نشاندہی کرتا ہے۔اسلام کی راہ میں بے شمار قربانیوں کی وجہ سے آپؑ کے فضائل میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بکثرت احادیث ارشاد فرمائی ہیں۔

احمد ابن حنبل کہتے ہیں جتنے صحیح اور قابل قبول فضائل حضرت علی علیہ السلام کے بارے بیان ہوئے ہیں اتنے کسی اور صحابی رسولؐ کے بارے میں بیان نہیں ہوئے۔چنانچہ کسی کا بھی علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو اپنے ساتھ موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر موقع پر امیر المؤمنین علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔حتیٰ کہ ہجرت مدینہ کے بعد جب مواخات کا عمل پیش آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بھائی کے طور پر حضرت علی علیہ السلام کو انتخاب کیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ''اے علیؑ! تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ سے تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا''۔

خود امیر المؤمنین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے ''میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک درخت سے نکلی ہوئی دوشاخوں اور بازو سے جڑے ہوئے ہاتھ کی مانند ہیں''۔

امیر المؤمنین علیہ السلام نے تقریباً تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمرکاب ہوکر شرکت فرمائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنان اسلام سے حفاظت کرتے رہے۔اگر علم ودانش کے میدان میں دیکھا جائے تو اصحاب رسولؐ میں کوئی بھی حضرت علی علیہ السلام کا ہمسر نہ تھا۔اور یہ وہ حقیقت ہے کہ جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین اور اصحاب رسولؐ کے

کلمات میں بیان ہوئی ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان کہ: ''انا مدینه العلم وعلی بابها'' میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔

اس حقیقت پر بہترین گواہ ہے اور خود امام علیؑ کا منبر پر بیٹھ کر یہ اعلان ''سلونی سلونی قبل ان تفقدونی'' (مجھ سے پوچھ لو! اس سے پہلے کہ میں تمہارے درمیان نہ رہوں) آپؑ کے عظیم علم و دانش کا مظہر ہے اور سعید ابن مسیبؓ کے بقول یہ دعویٰ امام علی علیہ السلام کے علاوہ کسی بھی صحابی نے نہیں کیا۔ عالم اسلام میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے بڑھ کر فقیہ ترین، زاہد ترین اور امت کی رہبری کے لائق کوئی اور شخص نظر نہیں آتا۔

۲۔ امیر المؤمنین علیہ السلام وفات رسولؐ کے بعد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے ہی اصحاب رسولؐ کے ایک طبقے نے اس بات کی کوشش شروع کر دی تھی کہ آپؐ کی رحلت کے بعد یہ حکومت آپؐ کے اہل بیتؑ کے ہاتھوں میں نہ آنے پائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب حضرت علی علیہ السلام اور اہل بیتؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے تو سقیفہ بنی ساعدہ میں مسلمانوں نے گٹھ جوڑ کر کے حضرت ابوبکر کو خلیفہ رسولؐ بنا دیا۔ اور مسند رسولؐ کے حقیقی وارث اور جانشین امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کو حق خلافت سے محروم کر دیا گیا۔

اگر آپؐ چاہتے تو بزور شمشیر اپنا حق واپس لے سکتے تھے مگر اس داخلی جنگ کا فائدہ ان غیر مسلم نما طاقتوں کو ہوتا۔ جو ایک عرصے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کا انتظام کر رہی تھیں۔ اور مسلمانوں کی کمزوری کا مشاہدہ کرتے ہی اسلام پر کاری ضرب لگانے کی تاک میں تھے۔

چنانچہ امام علی علیہ السلام نے اسلام کے وسیع تر مفاد میں مصائب اور مشکلات کو برداشت کرتے ہوئے گوشہ نشینی اختیار کر لی مگر کسی قسم کے انتہائی اقدام سے گریز کیا۔ چنانچہ آپؐ نے کئی مواقع پر ضرورت اور مسلمانوں کے اتحاد کی حفاظت کو انتہائی اقدام نہ اٹھانے کی بنیاد قرار دیا۔ آپؐ نے اپنی خاموشی کے لیے وہی توجیہ پیش کی جو جناب ہارونؑ نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے پیش کی تھی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنِّیۡ خَشِیۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَیۡنَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ

مجھے تو یہ خوف تھا کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔

حضرت امام علی علیہ السلام نے قریش پر نفرین کرتے ہوئے فرمایا:

بارالہا! میں تجھ سے قریش اور قریش کی مدد کرنے والوں کے خلاف نصرت چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے

قطع رحمی کی، میرے بلند مرتبے کو پست سمجھا اور خلافت میرا حق تھا۔اس میں مجھ سے جھگڑا کیا۔

البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ۲۵ سال تک کی گوشہ نشینی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ امام علی علیہ السلام نے مناسب موقعوں پر اپنے حق کی بازیابی کے لیے کوشش نہ کی ہو۔ بلکہ آپؑ نے مختلف موقع پر اپنے حق کا مطالبہ بھی کیا۔

ایک موقع پر جب ایک شخص نے آپؑ سے گستاخی کرتے ہوئے کہا کہ اے ابوطالب کے بیٹے! تمہیں اس خلافت کی بڑی حرص ہے؟

تو آپؑ نے جواب دیا: نہیں خدا کی قسم! تم زیادہ حریص ہو تم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے) دُور اور میں ان کا خاص اور قریبی ہوں میں نے اپنا حق مانگا ہے لیکن تم نہیں چھوڑتے اور مجھے میرے حق تک پہنچنے سے روکتے ہو''۔

حضرت عمر کی وفات کے بعد شوریٰ کے موقع پر آپؑ کا شیخین کی سیرت پر چلنے کی شرط کو رد کر کے خلافت کو ٹھکرا دینا بھی اس بات پر شاہد ہے کہ امام علی علیہ السلام ان خلفاء کے طرزِ عمل سے راضی نہ تھے گویا امامؑ کی نظر میں شیخین کی سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے برخلاف اور غلط اجتہاد کی بنیاد پر تھی۔ حضرت عمر کی وفات کے بعد حضرت عثمان خلیفہ بنے لیکن ان کی غلط حکومتی پالیسیوں اور بیت المال کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے حجاز اور عراق کی عوام ان کے خلاف ہوگئی۔ اس دوران حکومت اور عوام میں ثالثی کا کردار امام علی علیہ السلام نے انجام دیا۔

آپؑ حضرت عثمان تک لوگوں کے اعتراضات کو پہنچایا کرتے تھے اگرچہ آپؑ خود بھی حضرت عثمان کے بعض نامناسب اعمال پر تنقید کیا کرتے تھے، لیکن ثالث کی حیثیت سے آپؑ نے حضرت عثمان کے حقوق کا بھی خیال رکھا۔

البتہ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جب حضرت عثمان کے قتل کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی خلافت ظاہری قائم ہوئی تو بنوامیہ اور قریش کے ایک گروہ نے قتل عثمان کا الزام حضرت علی علیہ السلام پر لگا دیا حالانکہ اس اصرار اور اس شرط پر خلافت کو قبول کرلیا کہ لوگ وعدہ کریں کہ وہ مکمل میرا ساتھ دیں گے۔ پس چند لوگوں کے علاوہ تمام انصار نے امامؑ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

سبق5

دورِ خلافت

جب امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو آپؑ کے سامنے مشکلات اور دشواریوں کا ایک پہاڑ کھڑا تھا اور رہی سہی کسر آپؑ کو مختلف جنگوں میں الجھا کر پوری کردی گئی۔ اس کی ایک وجہ آپؑ کی اصولی سیاست اور نظام عدل وانصاف کو رائج کرنا تھا۔

اس سلسلے میں آپؑ نے جو پہلا قدم اٹھایا وہ وظائف اور بیت المال کی برابری اور مساوات کی بنیاد پر تقسیم کا عمل تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ خلفاء کے دور میں معاشرے کے اندر مالدار اور غریب طبقات کے درمیان جو فاصلے بڑھ گئے تھے اب کم ہو رہے تھے اپنے اس عمل پر امامؑ کی دلیل یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا ہی کیا کرتے تھے، چنانچہ بعض لوگوں نے امامؑ سے مخالف کی وجہ یہی بیان کی تھی کہ حضرت علی علیہ السلام نے تقسیم اموال کے موقع پر ان کا خیال نہیں رکھا ہے۔یعنی گذشتہ خلفاء کے دور کی نسبت انہیں کم مال عطا کیا گیا ہے۔امام علیہ السلام کے سامنے ایک اہم اور زیادہ مشکل مسئلہ دینی انحرافات (بدعات) اور لوگوں کی دین سے عدم آگاہی کا تھا۔

کیونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد لوگوں کے سامنے صحیح دینی معارف پیش کرنے کے سلسلے میں کوئی جامع قدم نہیں اٹھایا گیا تھا اور حکمران ''مصلحت پسندی'' کی بنیاد پر احکام وضع کرلیا کرتے تھے۔

گذشتہ خلفاء میں پیدا ہونے والی خرافات کا ازالہ اور اصلاح امامؑ کی بنیادی ذمہ داری تھی اور یہ ایک انتہائی دشوار کام تھا، اس اصلاحی کام نے آپؑ کو بہت سے عمائدین اور صاحبان اثر ورسوخ کے مقابل لا کھڑا کیا اور اس سلسلے میں سرکشی پر اترانے والوں کے خلاف امیر المؤمنینؑ کو جہاد بھی کرنا پڑا۔

چنانچہ آپؑ کا تقریباً پانچ سالہ دور خلافت ان سرکش عناصر کے خلاف جنگوں میں گزر گیا۔ہم مختصر طور پر ان جنگوں کے احوال پر نظر ڈالتے ہیں۔

ا۔جنگ جمل

معاشرے میں موجود اخلاقی مشکلات میں سے ایک مشکل جس کی اصلاح کے لیے امام علی علیہ السلام مشغول رہے۔وہ فاتحین عرب کی دنیا پرستی، عیش طلبی اور مال و دولت کی طرف ان کا بڑھتا ہوا رجحان تھا۔اور جنگ جمل اسی کا نتیجہ تھی کیونکہ امیر المؤمنین علیہ السلام نے طلحہ اور زبیر کی خواہشات کو رد کردیا تھا۔جو حضرت عثمان کے بعد خلافت کی امید لگائے بیٹھے تھے۔جب خلافت حضرت علی علیہ السلام کے پاس چلی گئی۔تو یہ مایوس ہو کر مکہ مکرمہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ کے پاس چلے گئے اور خون عثمان کے انتقام کا نعرہ بلند کردیا۔

انہوں نے حضرت علیؑ کو مورد الزام ٹھہرا کر جنگ کی تیاریاں شروع کردیں۔جنگ جمل ماہ جمادی الثانی ۳۶ھ میں واقع ہوئی۔امیر المؤمنین علیہ السلام نے متعدد ذرائع سے حضرت عائشہ کو سمجھایا اور طلحہ وزبیر کو بھی نصیحت کی کہ حرم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح سر میدان لے آنا اسلامی غیرت وحمیت کے منافی عمل ہے۔

آپؑ کی آخری حد تک یہ کوشش رہی کہ مسلمانوں کی آپس میں خون ریزی نہ ہو۔مگر ان کے دلوں پر کسی نصیحت کا اثر نہ ہوا اور بالآخر ۱۳۰۰۰ حضرت عائشہ کے سپاہی اور ۵۰۰۰ امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے مجاہدین کام آئے۔اور بعض مجاہدین نے حضرت عائشہ کی ناقہ کے پاؤں کاٹ دیے اور ہودج زمین پر آگرا۔امامؑ نے اعزاز واکرام کے

ساتھ حضرت عائشہ کو اپنے بھائی محمد ابن ابی بکرؓ کے ہمراہ واپس مدینہ پہنچا دیا۔

۲۔ جنگ صفین

جنگ جمل کے بعد امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے کوفہ کو اپنا دار الحکومت بنا لیا، اس زمانہ میں اہل شام پر معاویہ ابن ابوسفیان حکومت کر رہا تھا۔ شام کے علاوہ باقی تمام علاقے امامؑ کی بیعت کر چکے تھے۔ امیر المؤمنین علیہ السلام کوفہ سے معاویہ کے نام خط لکھ کر اسے مسلمانوں کے امامؑ کی اطاعت پر قائل کرنے کی کوشش کی جس کے جواب میں معاویہ نے لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور خود کو خون عثمان کا ولی قرار دیا۔ اور حضرت علی علیہ السلام کو مورد الزام قرار دیا۔ اور اہل شام کو امیر المؤمنین علیہ السلام کے خلاف بغاوت پر ابھارا گیا۔

جب امامؑ کے متعدد فہمائش کے خطوط کا معاویہ پر اثر نہ ہوا تو آپؑ معاویہ کی سرکوبی کے لیے شوال ۳۶ھ میں ۹۰ ہزار کا لشکر لے کر مقام ''رقہ'' پر پہنچ گئے۔ ادھر معاویہ کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر تھا۔ معاویہ کے لشکر نے صفین میں دریا پر قبضہ کر کے لشکر امامؑ کے لیے پانی بند کر دیا۔

جب حضرت علی علیہ السلام نے جوابی کاروائی کا حکم دیا اور لشکر نے دریا کو واپس لیا تو مجاہدین سے فرمایا خبردار! دشمن پر تم پانی بند نہ کرنا۔ جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ محرم الحرام ۳۷ھ آ گیا تو جنگ موقوف ہوگئی اس کے بعد صفر شروع ہوتے ہی لشکر شام نے پھر حملہ کر دیا۔ ایک ہفتہ تک گھمسان کی جنگ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ لشکر شام کے ۴۵۰۰۰ ہزار افراد اور لشکر حضرت علی علیہ السلام کے قریباً اس سے آدھے افراد کام آ گئے۔

اس دوران وہ قیامت خیز رات بھی آئی جسے ''لیلۃ الھریر'' کہتے ہیں، وہ جس میں تمام رات جنگ جاری رہی اور طرفین کے ۳۶۰۰۰ ہزار افراد مارے گئے۔ خود امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے دست مبارک سے ۹۰۰ افراد کا کام تمام کر دیا۔ امامؑ کی فوج کے کمانڈر حضرت مالک اشترؓ معاویہ کے خیمے تک جا پہنچے اور قریب تھا کہ معاویہ کا خاتمہ ہو جائے کہ عمرابن عاص نے ۵۰۰ قرآن نیزوں پر بلند کرا کے یہ اعلان کر دیا کہ ہم قرآن سے فیصلہ چاہتے ہیں اور اس طرح لشکر امیر المومنین میں پھوٹ پڑ گئی، لوگ عمرابن عاص کی چال میں پھنس گئے۔

بالآخر آپؑ کو تحکیم پر مجبور کر دیا گیا۔ دونوں حکم ماہ رمضان المبارک میں ایک جگہ جمع ہوئے اور ابوموسیٰ اشعری نے عمرو عاص کے چکر میں آ کر منبر پر اعلان کر دیا کہ حضرت علی علیہ السلام کو معزول کرتا ہوں لہٰذا قوم اپنا حاکم خود مقرر کر لے۔ جب کہ دوسری طرف عمرو بن عاص نے اعلان کر دیا کہ جب حضرت علی علیہ السلام کو ان کے نمائندوں نے معزول کر دیا ہے تو میں معاویہ ابن ابوسفیان کو برقرار رکھتا ہوں۔

یہاں سے ہی ایک گروہ ''خوارج'' الگ ہو گیا۔ اور یوں اس بھیانک انجام پر اس جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

۳۔ جنگ نہروان

صفین سے لوٹتے ہوئے لوگ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئے تھے' ایک گروہ تحکیم کے خلاف تھا اور دوسرا گروہ ان پر مسلمانوں کی جماعت علیٰحدہ ہو جانے کا الزام لگا رہا تھا۔ تحکیم کے مخالف گروہ نے ''لاحکم الا اللہ'' (حکمیت (فیصلہ) کا حق صرف خدا کے پاس ہے) کا نعرہ لگا کر علم بغاوت بلند کر دیا اور نہروان کے مکام پر لوگوں کو ستانا شروع کر دیا۔ امیر المومنین علیہ السلام نے ان کی سرکوبی کے لیے نہروان کا رخ کیا اور بغداد سے چار فرسخ کی دوری پر ۳۸ھ میں یہ معرکہ پیش آیا۔ ابتداء میں ان باغیوں کی تعداد بارہ تھی جو بعد میں ان کے حامی انتشار کے باعث چار ہزار رہ گئی' لیکن امیر المؤمنینؑ کے لشکر نے ایسا حملہ کیا کہ ۱۹ افراد کے علاوہ یہ سب قتل کر دیے گئے اور یہ باغی اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ معرکہ صفین کے بے پناہ قتل وخون کے بعد معاویہ کی مکاریوں سے حکمین کا فیصلہ اور اسکے بعد محمد ابن ابی بکرؓ اور مالک اشترؒ کا قتل، یہ واقعات تھے کہ جنہوں نے حضرت علی علیہ السلام کو مجبور کر دیا کہ معاویہ کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کریں مگر امامؑ کا ساتھ دینے کے لیے تیار لوگوں کی تعداد بہت کم تھی اور دوسری طرف امیر المومنین علیہ السلام کو لشکر کی روانگی سے قبل ہی شہید کر دیا گیا۔

شہادت

خوارج سے تعلق رکھنے والے تین افراد عبدالرحمٰن ابن ملجم، برک ابن عبداللہ تمیمی اور عمر ابن بکیر نے مکے میں یہ باہمی عہد کیا کہ وہ حضرت علیؑ، معاویہ اور عمرو ابن عاص کو قتل کریں گے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن ابن ملجم امیر المؤمنینؑ کو شہید کرنے کی غرض سے کوفہ آیا۔ اور خوارج سے تعلق رکھنے والے اپنے تمام دوستوں سے ملاقاتیں کرنے لگا۔ کوفہ میں اس کی ملاقات ایک حسین عورت قطام بنت شجنۃ بن عدی سے ہوگئی۔ جس کا باپ اور بھائی نہروان میں قتل ہو گئے تھے، ابن ملجم لعنۃ اللہ علیہ نے اس عورت سے شادی کی درخواست کی تو اس نے اپنا مہر تین ہزار دینار اور امیر المومنین علیؑ کا قتل قرار دیا۔ ابن ملجم نے کہا کہ وہ بھی اتفاقاً اسی مقصد سے کوفہ آیا ہے۔ اس نے کچھ عرصہ تک اپنی تلوار کو زہر میں بجھایا، پھر اسی تلوار سے عین سجدہ کی حالت میں آپؑ کے سر اقدس پر وار کیا۔ آپؑ نے اس وقت بلند آواز سے فرمایا ''فزت و رب الکعبۃ'' (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا) یہ واقعہ ۱۹ رمضان المبارک ۴۰ ہجری کو پیش آیا، گہرے زخم اور زہر کے اثر سے ۲۱ رمضان المبارک ۴۰ھ کو آپؑ کی شہادت واقع ہوگئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ

سبق 6

حضرت فاطمہ الزہراء سلام اللہ علیہا

مختصر تعارف

اسم مبارک: فاطمہ

مشہور القاب: زہرا، راضیہ، مرضیہ، بتول، صدیقہ، الرسول، ام ابیہا

تاریخ ولادت: ۲۰ جمادی الثانی ۵ھ بعثت

تاریخ شہادت: ۳ جمادی الثانی ۱۱ھ

مقام ولادت: مکہ مکرمہ

مدفن: جنت البقیع (مکہ مکرمہ)

والد بزرگوار: پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

عمر مبارک: ۱۸ سال

والدہ ماجدہ: حضرت خدیجہ الکبریٰ علیہا السلام

کنیت: ام ابیہا، ام حسن، ام حسین، ام محسن

اولاد: ۵ اولادیں (۳ بیٹے، ۲ بیٹیاں)

اخلاق واوصاف

حضرت فاطمہ الزہراء سلام اللہ علیہا کے اوصاف وکمالات اتنے بلند تھے کہ ان کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا سے بے پناہ محبت کیا کرتے تھے، محبت کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جب آپ کسی غزوہ پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا سے رخصت ہوتے تھے اور جب واپس تشریف لاتے تھے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا سے ملنے کے لیے جاتے تھے۔ عزت واحترام کا نمونہ یہ ہے کہ جب بھی جناب سیدہ سلام اللہ علیہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ملنے کے لیے آتیں تو آپ تعظیم کے لیے کھڑے ہوجاتے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ برتاؤ فقط اپنی بیٹی سیدہ زہراء سلام اللہ علیہا کے لیے مخصوص تھا۔ سیدہ زہراء سلام اللہ علیہا کی فضیلت وعظمت میں بے شمار احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں اکثر علماء اسلام کے درمیان متفق علیہ ہیں

۔جیسے:

فاطمہ بہشت میں جانیوالی عورتوں کی سردار ہیں۔

فاطمہ کی رضا سے اللہ راضی ہوتا ہے اور فاطمہ کی ناراضگی سے اللہ ناراض ہوتا ہے،

جس نے میری بیٹی کو تکلیف پہنچائی اس نے گویا مجھے تکلیف پہنچائی۔

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا اخلاق و کردار میں اپنی ماں حضرت خدیجہؑ کی صفات عالیہ کا واضح نمونہ تھیں۔ جود و سخاء اعلیٰ فکری افکار اور نیکی و دینداری میں اپنی والدہ کی وارثہ اور ملکوتی صفات و اخلاق میں اپنے والد بزرگوار کی جانشین تھیں۔ حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا اپنے شوہر امام علی علیہ السلام کے لیے ایک دلسوز، مہربان، اور فدا کار زوجہ تھیں۔ بچوں کی تربیت اور گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ عبادت خدا سے حضرت سیدہ زہراء سلام اللہ علیہا کو عشق تھا۔

آپؑ جب بھی مصلیٰ عبادت پر کھڑی ہوتی تو اپنے کمسن بچوں کو بھی ساتھ کھڑا کرتیں۔ آپ گھر کا تمام کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں، جھاڑو دینا، کھانا پکانا، چرخہ چلانا، چکی پیسنا اور بچوں کے امور انجام دینا جناب سیدہ سلام علیہا کے معمول کے کاموں میں شامل تھے۔ مگر ان تمام امور کو انجام دیتے ہوئے آپ (س) کبھی بھی اپنے شوہر سے ملازمہ یا خدمتگار کی فرمائش نہیں کی۔

ایک مرتبہ جب اپنے بابا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک کنیز کی خواہش کی تو آنحضرتؐ نے بجائے کنیز عطا کرنے کے وہ تسبیح تعلیم فرمائی جسے "تسبیح زہراء" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (۳۴ مرتبہ اللہ اکبر، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ) اس تسبیح کے عطا ہونے پر جناب سیدہ سلام اللہ علیہا بے حد خوش ہوئیں اور کنیز کی فرمائش ترک کر دی۔

سیدہ عالم سلام اللہ علیہا نہ صرف اپنی سیرت بلکہ اقوال سے بھی خواتین کے لیے پردہ کی اہمیت پر بہت زور دیتی تھیں۔ آپؑ کا مکان مسجد نبوی سے بالکل متصل تھا مگر آپ (س) کبھی حجاب میں بھی اپنے والد بزرگوار کی اقتداء میں نماز پڑھنے یا وعظ و نصیحت سننے کے لیے تشریف نہیں لائیں۔ بلکہ اپنے فرزند امام حسن علیہ السلام سے جب وہ مسجد سے واپس آتے تو اکثر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبے کے مضامین سن لیا کرتیں۔

ایک مرتبہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منبر پر یہ سوال کیا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر کیا چیز ہے؟ یہ بات جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کو معلوم ہوئی تو آپ (س) نے جواب دیا عورت کے لیے سب سے بہتر بات یہ ہے کہ نہ اس کی نظر کسی غیر محرم پر پڑے اور نہ کسی غیر محرم مرد کی نظر اس پر پڑے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے یہ جواب پیش ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "فاطمہ میرا ہی ٹکڑا ہے"۔

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی ساری زندگی نہ صرف خواتین عالم کے لیے بلکہ تمام انسانوں کے لیے ایک نمونہ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ گھر ہو یا گھر کے باہر زندگی کے ہر شعبہ میں جناب فاطمہ (س) نے انسانیت خاص طور پر عورتوں کی رہنمائی فرمائی ہے۔

احوال وواقعات

حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا پانچ سال تک اپنی والدہ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے زیر سایہ رہیں۔ اور جب بعثت کے دسویں سال جناب حضرت خدیجہ الکبریٰ سلام اللہ علیہا کا انتقال ہوا تو جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کا گہوارہ تربیت صرف باپ کا سایہ رحمت تھا۔ آپ (س) کفار مکہ کی طرف سے اپنے والد بزرگ وار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی جانے والی تمام مشکلات وتکالیف میں ان کا ساتھ دیتی تھیں۔ کبھی بابا کے جسم اطہر سے خون صاف کرتیں اور مرہم پٹی کرتیں۔ تو کبھی مشرکین کی طرف سے پھینکے گئے کوڑا کرکٹ کو اپنے بابا کے جسم سے صاف کرتیں۔ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نے کم سنی کے باوجود نہایت بہادری، حوصلہ مندی اور صبر وتحمل سے ان حالات کا سامنا کیا۔ اور اپنے بزرگ مرتبہ باپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مددگار بنی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ (س) کو ''ام ابیھا'' کے لقب سے نوازا۔

ہجرت کے پہلے ہی سال مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحکم خدا اپنی بیٹی کا عقد حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے فرما دیا اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ فاطمہؑ کا کوئی ہمسر وکفو نہیں تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی زرہ بیچ کر حق مہر ادا کیا اور اسی سے حاصل شدہ رقم سے آنحضرتؐ نے ایک مختصر جہیز اپنی بیٹی کو عطا فرمایا اور ایک مختصر ولیمہ ہوا اور رخصتی کا عمل انجام پایا۔ اس طرح کائنات کے سب سے عظیم جوڑے کی شادی کے مراسم نہایت سادگی سے انجام پائے۔ مختلف جنگوں اور غزوات میں آپ (س) اپنے والد بزرگوار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کی مددگار اور معاون تھیں۔ جب کبھی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میدان جنگ سے زخمی ہو کر پلٹتے تو سیدہ عالم سلام اللہ علیہا ان کے زخموں کو دھوتی تھیں۔ اور حضرت علیؑ کی خون آلودہ تلوار کو بھی اپنے ہاتھوں سے صاف کرتی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ عورت کا جہاد گھر کی چار دیواری کے اندر ہوتا ہے لہٰذا کبھی آپ (س) نے میدان جنگ میں قدم نہیں رکھا۔ آپ (س) صرف ایک موقع پر نصرت اسلام کے لیے اپنے والد بزرگوار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شوہر نامدار علیہ السلام کے ہمراہ گھر سے باہر نکلیں اور نصاریٰ نجران سے مباہلے کا موقع تھا۔ کیونکہ یہ ایک پر امن مقابلہ تھا اور اس میں روحانی فتح کا سوال تھا۔ اس معرکے میں نجران کے عیسائیوں نے مباہلے سے انکار کر دیا تھا اور اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔

۲۸ صفر ۱۱ھ کو آپؑ کے والد بزرگوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال سیدہ عالم سلام اللہ علیہا کے لیے ایک عظیم صدمہ ثابت ہوا۔ مگر افسوس کہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کو اس عظیم مصیبت کے موقع پر تسلی وتشفی دینے کے بجائے اہل

زمانہ کا رخ آپ (س) کی عظمت کی طرف سے پھر گیا اور ظلم کے عظیم پہاڑ آپ (س) پر توڑے جانے لگے۔ حضرت علی علیہ السلام سے خلافت چھین لی گئی پھر ان سے بعیت کا سوال کیا جانے لگا اور صرف بیعت پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ جبر وتشدد سے بھی کام لیا جانے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ سیدہ سلام اللہ علیہا کے گھر پر لکڑیاں جمع کی جانے لگیں اور اس دروازے کو آگ لگا دی گئی جس پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ آیۂ تطہیر انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا پڑھا کرتے تھے۔ اس وقت آپ (س) کو جسمانی صدمہ پہنچا جسے آپ (س) برداشت نہ کرسکیں اور وہی آپ (س) کی وفات کا سبب بنا۔ ان صدموں اور مصیبتوں کا انداز سیدہ عالم سلام اللہ علیہا کی زبان پر جاری ہونے والے اس پر سوز مرثیہ سے لگایا جاسکتا ہے جس میں فرمایا:

صبّت علیّ مصائب لو انھا　　　صبت علی الایام صرن لیالی

یعنی مجھ پر اتنی مصیبتیں پڑیں کہ اگر وہ دنوں پر پڑتیں تو وہ راتوں میں تبدیل ہوجاتے۔

سیدہ عالم سلام اللہ علیہا کو جو جسمانی وروحانی صدمات پہنچے ان میں سے ایک فدک کی جائیداد کا غصب کیا جانا بھی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدہ عالم سلام اللہ علیہا کو مرحمت فرمائی تھی۔ جائیداد کا چھن جانا حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے لیے اتنا تکلیف دہ نہ تھا جتنا صدمہ آپ (س) کو اپنے حق کے مطالبے پر حکومت وقت کی طرف سے آپ (س) کے دعوے کو جھٹلانے پر ہوا اور یہ وہ صدمہ تھا جس کا اثر حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کے دل میں مرتے دم تک باقی رہا

شہادت

جناب سیدہ زہراء سلام اللہ علیہا ۱۱ ھ اپنے والد بزرگوار پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ۷۵ یا ۹۵ دن ۳ جمادی الثانی ۱۱ ھ کو وفات پا گئیں۔ سیدہ عالم سلام اللہ علیہا کی وصیت کے مطابق آپ کا جنازہ رات کی تاریکی میں ایک تابوت میں اٹھایا گیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے آپ کی تجہیز وتکفین کا انتظام کیا۔

صرف بنو ہاشم اور جناب سلمان فارسیؓ، جناب مقدادؓ اور جناب عمار یاسرؓ جیسے مخلص اور وفادار اصحاب کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام نے آپ (س) کی نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کردیا۔

مگر ۸ شوال ۱۳۴۴ ھ میں ابن سعود نے دوسرے مقابر اہل بیتؑ کے ساتھ سیدہ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کے روضہ مبارک کو بھی منہدم کرادیا۔ آپ (س) کا روضہ مبارک اب بھی ظالم ستمگر لوگوں کے ہاتھوں میں ویران ہے اور آج بھی زائرین کو آپ کی زیارت کرنے سے بھی روکتے ہیں۔

(اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ)

سبق 7

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام

مختصر تعارف

اسم مبارک: حسن

مشہور القاب: مجتبیٰ سبط، امین، تقی، ذکی، طیب، زاہد

تاریخ ولادت: ۱۵ رمضان المبارک ۳ھ

تاریخ شہادت ۲۸ صفر المظفر ۵۰ ہجری

مقام ولادت: مدینہ منورہ

مدفن: جنت البقیع (مدینہ منورہ)

والد بزرگوار: حضرت علی علیہ السلام

عمر مبارک: ۴۷ سال

والدہ ماجدہ: حضرت فاطمہ الزہراءؑ

اولاد: ۱۵ بیٹے، بیٹیاں

کنیت: ابو محمد

اخلاق واوصاف

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے نواسے امام حسن علیہ السلام سے بے پناہ محبت تھی۔ اور اپنے اصحاب کو بھی حکم کرتے کہ وہ ان سے محبت رکھیں۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''بارالہا! میں ان سے محبت کرتا ہوں، تو بھی ان سے محبت فرما اور جو کوئی ان سے محبت کرتا ہے اس سے بھی محبت فرما''۔ جو کوئی بھی اہل جنت کے سردار کو دیکھنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ حسن علیہ السلام بن علی علیہ السلام کو دیکھے۔ امام حسن علیہ السلام ایک زاہد اور عبادت گزار ہستی تھے آپ نے ۲۵ سال باپیادہ حج انجام دیے۔ آپؑ کے حسن اخلاق اور سخاوت کا چرچا زبانِ زدِ عام تھا۔ امام حسنؑ کی ایک غیر معمولی صفت جس کے دوست اور دشمن سب معترف تھے وہ حلم کی صفت تھی۔

چنانچہ ایک شامی کہتا ہے کہ ایک دن میں نے مدینہ میں ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کا چہرہ باوقار اور انتہائی

خوبصورت تھا۔اس کے بدن کالباس بھی انتہائی مناسب اورآراستہ تھااورگھوڑے پر سوارتھا۔میں نے ان کے بارے میں پوچھاتولوگوں نے بتایاکہ حسن ابن علیؑ ہیں یہ سن کرمیراپوراوجودغصے میں جلنےلگا۔اور میں بغض اہل بیتؑ کی وجہ سے ان پرسب وشتم کرنے لگا۔جب میں انہیں کافی برابھلاکہہ چکاتوانہوں نے مجھ سے پوچھا: کیاتم مسافرہو؟میں نے کہا ہاں،آپؑ نےفرمایامیرے ساتھ آؤ۔اگرتمہارے پاس رہائش نہیں ہےتومیں تمہیں رہائش دوں گا،اگرپیسہ نہیں ہےتو میں تمہاری مددکروں گااگرتمہاری کوئی ضرورت ہےتومیں ضرورت پوری کروں گا۔یہ سن کرمیں ان کے قدموں میں گرپڑااوراپنے کام پرشرمندگی کااظہارکیااوراس کے بعدروئے زمین پران سے زیادہ محبوب میرے نزدیک کوئی نہ تھا ۔آپؑ کی سخاوت اورمہمانوازی بھی پورے عرب میں مشہورتھی۔آپؑ نے تین مرتبہ اپنامال راہ خدامیں تقسیم کردیا۔کسی سائل کوخالی ہاتھ نہیں لوٹاتے تھےکسی نے پوچھاکہ: باوجودیکہ آپؑ خودضرورت مندہیں پھربھی کیابات ہے کہ سائل کورد نہیں فرماتے؟ آپؑ نے جواب دیا: میں خودخداکی بارگاہ کاسائل ہوں مجھے شرم آتی ہے کہ خودسائل ہوتے ہوئے دوسرے سائلوں کاسوال پورانہ کروں۔

احوال وواقعات

جب ۲۱ رمضان المبارک ۴۰ھ کوامیرالمومنین حضرت علیؑ کی شہادت ہوگئی اورامام حسنؑ اپنے باباکےکفن و دفن سے فارغ ہوئےتومسلمانوں کے مجمع سے خطاب فرمایااورایک مختصرمگرانتہائی جامع خطبہ ارشادفرمایا:

اےلوگو! آج کی شب اس شخص نے انتقال فرمایاہےجس پرعمل وکردارکےاعتبارسے نہ پہلےسبقت لے گئے ہیں اورنہ بعدوالے وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔وہ مردمیدان' رسول اکرمؐ کے ساتھ راہ خدامیں جہادکرتاتھا۔انہیں بچاتاتھااورجب وہ پرچم دےکراسے میدان جہادمیں بھیج دیتے تھےتوداہنی طرف جبرائیل اوربائیں طرف میکائیل ہوتے تھےاوراس وقت تک نہ آتاتھاجب تک دونوں ہاتھوں پرفتح حاصل نہ کرلے۔ان کاانتقال اس رات میں ہوا ہےجس رات عیسیٰ بن مریمؑ کوآسمان پراٹھالیاگیاہےاوریوشع بن نون کاانتقال ہواہے۔انہوں نے ترکے میں نہ درہم چھوڑے ہیں اورنہ دینار۔۷۰۰ درہم عطایاسے باقی رہ گئے تھےجس سے ایک خادم خریدنے کاارادہ تھااوروہ نہ ہوسکا ۔

اےلوگو!جومجھے جانتاہے،وہ توجانتاہے۔مگرجونہیں جانتاوہ جان لے کہ میں حسن ابن علیؑ ہوں،فرزندرسول اکرمؐ،فرزندبشیرونذیراوراس کافرزندہوں جوخداکی طرف دعوت دینے والااورسراج منیرتھا۔میراشماران اہل بیتؑ میں ہوتاہےجن سے خدانے ہررجس کودوررکھاہےاورانہیں مکمل طہارت عنایت فرمائی ہے۔ان کی محبت کواجررسالت قرار دیاہے۔نیکی ہم اہل بیتؑ کی محبت کانام ہے۔

اس خطبے کے بعد ۴۰ ہزار افراد نے آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کی اور یوں ظاہری امامت وخلافت پر متمکن ہوگئے۔مگر شام ابوسفیان کے بیٹے معاویہ کے زیر تسلط تھا۔ وہ آپؑ کی بیعت پر راضی نہ ہوا۔ختمی مرتبت ﷺ کی رحلت کے بعد ابوسفیان اوراس کی اولاد کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ دھوکہ،فریب اور مکاری کے ذریعے اسلامی معاشرے پر حکومت قائم کر کے اسلام کے حقیقی چہرے کو داغدار کر دیا جائے۔لیکن وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف تھے کہ اسلامی معاشرے سے عدل وانصاف اورالٰہی تعلیمات کومسخ کرنااس وقت تک ممکن نہیں جب تک خاندان اہل بیتؑ کا ایک ایک فرد موجود ہے۔معاویہ جو پہلے ہی شام میں مال ودولت اور مستحکم پروپیگنڈا مشنری کے باعث سادہ لوح لوگوں میں خاندان علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے خلاف زہر بھر چکا تھا۔جب اس کومعلوم ہوا کہ اہل کوفہ نے امام حسن علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے اورعراق کی حکومت پھراولادِ علی علیہ السلام کی طرف جارہی ہے۔توفوراً ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور کوفہ پر حملہ کرنے کے لیے ۲۰ ہزار کالشکر روانہ کر دیا۔

ادھرامام حسن علیہ السلام کواطلاع ہوئی تو آپؑ نے ۱۲ ہزار کالشکر قیس ابن سعدؓ کی سرداری میں معاویہ کی پیش قدمی روکنے کے لیے روانہ کر دیا لیکن معاویہ نے اپنی فطری مکاری سے کام لے کر قیس بن سعدؓ اورامام حسن علیہ السلام دونوں کے لشکر میں یہ خبر عام کر دی کہ امام حسن علیہ السلام اورمعاویہ کے درمیان صلح ہوگئی ہے۔قیس بن سعدؓ کے لشکر میں خبر نشر ہوئی کہ امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے صلح کر لی ہے اور قیسؓ بلاسبب لڑرہے ہیں اورامام حسن علیہ السلام کے کیمپ میں یہ خبر نشر ہوئی کہ قیسؓ نے معاویہ سے صلح کر لی ہے اورامام حسن علیہ السلام بلاسبب جنگ کرنا چاہتے ہیں۔اوراس طرح لشکر میں پھوٹ پڑگئی اورتحکیم کے موقع پرامام علی علیہ السلام کو دین سے خارج کہنے والوں نے امام حسن علیہ السلام پربھی دین سے منحرف ہونے کاالزام لگا دیا اورنوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ امام حسن علیہ السلام کے قدموں کے نیچے سے مصلیٰ عبادت تک کھینچ لیا گیا،یہاں تک کہ اپنوں کی تلوار سے خود آپؑ زخمی ہوگئے اور آپؑ کومدائن میں کئی دنوں تک زیرِعلاج رہنا پڑا۔اس موقع پرامام حسن علیہ السلام کو درج ذیل مسائل درپیش تھے:

۱۔امام حسن علیہ السلام کے زخمی ہونے کے بعد شدید اختلاف پیدا ہوگیا،لوگ مسلسل جنگوں سے عاجز آگئے تھے مال غنیمت کی امیدیں ختم ہوگئیں،معاویہ نے رشوت دے کرامام حسن علیہ السلام کے کئی سرکردہ رہنماؤں کوخرید لیا تھا۔

۲۔مدائن کے لوگوں کی طرف سے امام حسن علیہ السلام کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے صورتحال مزید سنگین ہوگئی تھی اورمقابلہ کےامکانات بالکل ختم ہوگئے۔

۳۔شام سے لشکر مادی،معنوی اورنفسیاتی طور پر برتری حاصل ہوگئی تھی۔اموال کی فراوانی تو پہلے بھی تھی اور افرادی قوت میں بھی اضافہ ہوگیااوریوں وہ اپنے حاکم کی فرمانبرداری پر ہرحال میں سربستہ تھے۔

۴۔امام حسن علیہ السلام کی ظاہری فتح کا کوئی امکان باقی نہیں بچا تھا اگر امامؑ جنگ کرتے تو آپؑ کا ساتھ دینے کے لیے چند مخلص صحابہ رہ گئے تھے اور ان کی شہادت کے بعد حقیقی اسلام کا نام لینے والا بھی کوئی نہ رہ جاتا۔

مسلمانوں کے خون اور جان کی حفاظت امامؑ پر عائد ہوتی ہے۔اور وہ اس وقت تک جہاد کا حکم نہیں دیتا جب تک فتح یقینی نہ ہو یا قربانی دین کے حق میں مفید ثابت نہ ہو۔جبکہ موجودہ صورتحال میں امام حسن علیہ السلام کے سامنے نہ تو فتح یقینی تھی اور نہ ہی کوئی قربانی اسلام کے حق میں مفید تھی۔اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خود معاویہ بھی اپنی تمام مکاریوں کے باوجود سوچ رہا تھا کہ حسن ابن علی علیہ السلام کو جھکا لینا ممکن نہیں ہے اور ان کی موافقت کئے بغیر اپنی حکومت کی کوئی قیمت نہیں ہے چنانچہ اس نے صلح کا راستہ اختیار کیا اور بظاہر انتہائی فراخدالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک سادہ کاغذ امامؑ کی خدمت میں بھیج دیا کہ ہم آپؑ کے شرائط پر صلح کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اب امام حسن علیہ السلام کے سامنے چند مسائل مزید آ گئے، صلح کا انکار کر دیں تو اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی ہوگی، اور صلح پر آمادہ ہو جائیں تو لشکر میں مزید ہنگامہ ہو جائے گا۔چنانچہ آپؑ نے معاملے کو ساتھیوں کے سامنے رکھا کہ اگر اب بھی جہاد کے لیے آمادہ ہو۔تو میں اتمام حجت کے لیے تیار ہوں لیکن تم لوگ زندگی چاہتے ہو تو میں کس کے ساتھ جہاد کروں گا، لشکر نے مکمل طور پر 'البقاء البقاء' کا نعرہ لگا یا دیا۔آپؑ نے دیکھ لیا کہ میرے بارے میں نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس صلح کا ذکر فرمایا تھا اب اسی کا وقت آ چکا ہے۔چنانچہ آپؑ نے صلح کی منظوری دیدی اور حسب ذیل شرائط لکھ کر معاویہ کو بھیج دیں:

۱۔حکومت معاویہ کے ہاتھ رہے گی بشرطیکہ وہ کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ پر عمل کرے۔

۲۔معاویہ کو کسی کو بھی اپنا ولی عہد نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

۳۔اہل عراق کے لیے عمومی طور پر امن وامان کا حصول ہوگا۔

۴۔معاویہ خود کو امیر المومنین نہیں کہے گا۔

۵۔معاویہ کے پاس شہادتوں کا قیام نہ ہوگا۔

۶۔امیر المومنین علی علیہ السلام پر سب وشتم کا سلسلہ بند کر دیا جائے گا۔

۷۔ہر صاحب حق کو اس کا حق دیا جائے گا۔

۸۔شیعیان اہل بیتؑ کے لیے عمومی چور سے امن وامان رہے گا۔

۹۔اہواز کا خراج جمل وصفین کے مقتولین کی اولاد کو دیا جائے گا۔

۱۰۔کوفہ کا بیت المال امام حسن علیہ السلام کے قبضے میں رہے گا۔

۱۲۔امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام اور اہل بیتؑ کے خانوادہ کو کسی طرح کی اذیت نہ دی جائے گی۔

صلح کے فوائد

امام حسن علیہ السلام نے اپنی صلح سے درج ذیل فائدے حاصل کیے:

۱۔سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان ایک ایسی خونریز جنگ سے بچ گئے کہ جس کا انجام سوائے اصحاب باوفا، مخلص مسلمانوں اور خاندان اہل بیتؑ کے قتل عام کے اور کچھ بھی نہ تھا۔

۲۔امیر المومنین علی علیہ السلام پر سب وشتم بند کرنے کی شرط لگا کر دنیا پر واضح کر دیا کہ شام کے زیر اقتدار نفس رسول علیہ السلام سے کس طرح کا برتاؤ کیا جا رہا ہے اور آل محمدؐ کس مظلومیت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

۳۔اسلامی حکومت کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کی بنیاد کتاب وسنت پر ہو، اس سے ہٹ کر حکومت' اسلامی کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔امام حسن علیہ السلام نے سب سے پہلی شرط یہ قرار دی کہ اے معاویہ! تجھے کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل کرنا ہوگا۔جو اس امر کا کھلا اعلان تھا کہ شام کی حکومت میں کتاب وسنت پر عمل نہیں ہو رہا۔

۴۔امام حسن علیہ السلام معاویہ کے ناپاک عزائم سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے لہٰذا آپؑ کو یہ خدشہ تھا کہ معاویہ ان کے خاص صحابہ اور مخلص مسلمانوں کو کسی بہانے سے قتل کر دے گا لہٰذا صلح نامہ میں ان کی زندگیوں کا تحفظ فراہم کر دیا۔

۵۔صلح کے نتیجے میں محبان اہل بیتؑ کو قدرے آزادی مل گئی اور انہوں نے اسلام کے صحیح عقائد اور احکام کی نشر واشاعت کا کام شروع کر دیا اور یوں امت اسلامیہ حقائق سے آشنا ہونے لگی۔

۶۔معاویہ کو پابند کیا گیا کہ وہ اپنے بعد ولی عہد مقرر نہیں کرے گا۔

یہ تھا صلح نامہ کا لب لباب، اگرچہ معاویہ نے اس میں سے کسی شق پر عمل نہیں کیا لیکن امام حسن علیہ السلام نے یہ عہد نامہ لکھ کہ روح اسلام کی نقشہ کشی کر دی اور ۱۰ سال کی مدت میں جہاں بھی صلح نامہ کی کسی شق سے انحراف نظر آتا۔تو لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول کراتے۔خصوصاً جب معاویہ نے توارث کی بنیاد پر یزید کو ولی عہد بنا لیا تو امام حسن علیہ السلام کی تقریر سے اسلامی معاشرے میں ایک فکری انقلاب آ گیا۔اور معاویہ نے محسوس کیا کہ امام حسن علیہ السلام کے ہوتے ہوئے وہ کسی بھی صورت مذہب اسلام میں تحریف نہیں کر سکتا اور یوں وہ امام حسن علیہ السلام کے قتل کے منصوبے بنانے لگ گیا جس میں بالآخر کامیاب ہو گیا اس نے آپؑ کی زوجہ ''جعدہ بنت اشعث'' کو انعام واکرام کا لالچ دے کر اس کام کے لیے آمادہ کر لیا۔چنانچہ مشہور یہ ہے کہ ۵۰ھ میں ۴۷ سال کی عمر میں اس نے آپؑ کو زہر دے کر شہید کر دیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ

سبق8

حضرت امام حسین علیہ السلام

(قیام سے پہلے کی زندگی)

مختصر تعارف

اسم مبارک: حسین

مشہور القاب: سید، سبط اصغر، شہید اکبر، سید الشہداء

تاریخ ولادت: ۳ شعبان المعظم ۴ھ

تاریخ شہادت: ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ

مقام ولادت: مدینہ منورہ

مدفن: کربلاء معلی (عراق)

والد بزرگوار: حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام

عمر مبارک: ۵۷ سال

والدہ ماجدہ: حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا

مدت امامت: ۱۰ سال

کنیت: ابو عبداللہ

اولاد: ۶ اولادیں (۴ بیٹے اور ۲ بیٹیاں)

اخلاق و اوصاف

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شخصیت اور فضائل کے متعلق کتب میں بے شمار احادیث موجود ہیں۔ اپنے بچپن کے ابتدائی چھ سے سات سال آپؑ اکثر اپنے نانا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ نماز کے وقت بھی آپؑ ان سے جدا نہیں ہوتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؑ اور آپ کے بھائی امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ساتھ شدید اظہار محبت فرمایا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ:

الحسن والحسین سیدا شباب اهل الجنة

حسنؑ اور حسینؑ جوانان جنت کے سردار ہیں۔

آنحضرتؐ اپنے اصحاب کی محافل میں فرمایا کرتے تھے کہ:

من احب الحسن والحسین فقدا حبنی ومن اغضبھما فقدا غضبنی

جس نے حسنؑ اور حسینؑ سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان دونوں سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔

کبھی فرماتے تھے کہ:

ھماریحانی من الدنیا

یہ دونوں دنیا میں میرے پھول ہیں۔

امام حسین علیہ السلام کے کئی مخصوص فضائل بھی نقل ہوئے ہیں جن میں سے مشہور روایت یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ:

حسین منی وانا من الحسین

حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔

حضرت سلمان فارسیؓ روایت ہے کہ امام حسین علیہ السلام آنحضرتؐ کے زانوئے مبارک پر بیٹھے ہوئے تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے بوسے لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ:

تو سید و سردار ہے سید کا بیٹا ہے اور سادات کا باپ ہے۔ تو امام ہے امام کا بیٹا ہے اور آئمہ کا باپ ہے، اور تو حجت ہے، حجت کا بیٹا ہے اور حجج الٰہی کا باپ ہے۔ تیرے صلب سے نو باپ پیدا ہوں گے جن کا نواں قائم آل محمدؐ ہوگا۔ ابوبکر بن حزام کہتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام ایک چبوترے کے پاس سے گزر رہے تھے کہ آپ کی نظر چند فقیروں پر پڑی جو عبائیں بچھائے ہوئے خشک روٹیاں ان پر رکھ کر کھا رہے تھے۔ انہوں نے امامؑ کو کھانا کھانے کی دعوت دی تو امامؑ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ پھر نیچے اترے اور ان کے ساتھ کھانا تناول فرمایا۔

اس کے بعد ان سے فرمایا: تم نے مجھے دعوت دی اور میں نے قبول کی اب میں تمہیں دعوت دیتا ہوں اور تم قبول کرو۔ آپؑ ان کو اپنے گھر لے گئے اور اپنی کنیز سے فرمایا کہ جو کچھ تیار کیا ہوا ہے وہ لے آؤ اس کے بعد ان کو انعامات سے نواز کر رخصت فرمایا۔ آپؑ کے زہد و عبادت کے متعلق امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے ۲۵ حج پا پیادہ بجالائے اور جب حج کا سفر کرتے تھے تو جانور آپؑ کے پیچھے پیچھے چلا کرتے تھے۔

اپنے والد امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے ساتھ ان کی مخصوص غذا تناول فرماتے تھے آپؑ زہد و عبادت، علم و حلم اور

صبت وشجاعت میں اپنے بابا کے ہمراہ عہد توڑنے والوں اور ستم کاروں کے خلاف برسرپیکار تھے۔امام حسین علیہ السلام جنگ صفین کے ابتدائی مرحلے میں شامیوں کے قبضے سے پانی کا گھاٹ چھڑوانے کی کاروائی میں شریک تھے اور اس کامیابی کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تھا:

هذا اول فتح ببركة الحسين

یہ پہلی فتح حسین کی برکت سے ہوئی ہے۔

احوال وواقعات

امام حسین علیہ السلام کے بچپن کے ابتدائی چھ سال جو آپؑ نے اپنے نانا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر شفقت گزرے تھے وہ آپؑ کی زندگی کا سنہری دور تھا۔مگر آنحضرتؐ کی زندگی کے بعد حالات یکسر بدل گئے۔آپؑ نے اپنی آنکھوں کے سامنے والدہ خاتون جنت جناب سیدہ فاطمہ الزہراء علیہا السلام اور اپنے بابا حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام پر ظلم وستم ہوتے ہوئے دیکھا مگر دین خدا کی حفاظت کی خاطر صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا۔امیر المومنین علیہ السلام کے ۲۵ سالہ سکوت کے بعد جب حضرت عثمان کے قتل کے نتیجہ میں لوگوں نے آپؑ کی بیعت کی تو امام حسین علیہ السلام کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

جہاں بظاہر تو خلافت وحکومت ملی تھی مگر حقیقت میں فتنوں کا ایک نیا طوفان اٹھنے والا تھا اور آل محمدؐ کو اس کا بھی مقابلہ کرنا تھا۔چنانچہ ۳۵ھ میں جمل کا معرکہ پیش آیا اور اس کے بعد ۳۶ھ میں جنگ صفین اور جنگ نہروان کے معرکوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔بالآخر ۴۰ھ میں آپؑ کے بابا امیر المومنین علیہ السلام کو شہید کر دیا گیا۔لیکن آپؑ نے اس عظیم مصیبت اور امتحان کو بھی صبر اور حوصلے سے برداشت کیا۔امام حسین علیہ السلام نے اپنے بھائی امام حسن علیہ السلام کے دور امامت میں بھی اپنے بھائی کی ہر میدان میں حمایت فرمائی۔صلح امام حسن علیہ السلام اور معاویہ کی عہد شکنی کے بعد اہل بیتؑ پر ظلم کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔امیر المومنین علیہ السلام پر باقاعدہ منبروں سے سب وشتم ہونے لگا۔پیروان آل محمدؐ کا قتل عام ہونے لگا اور انہیں طرح طرح کی تکالیف دی جانے لگیں۔یہاں تک کہ صفر ۵۰ھ میں امام حسن علیہ السلام کو زہر دے کر شہید کرا دیا گیا۔اور یوں اسلام کی حفاظت وبقاء کی ذمہ داری امام حسین علیہ السلام کی طرف منتقل ہوئی۔

معاویہ اپنے کاروبار ظلم وستم میں مصروف رہا یہاں تک کہ ۶۰ ہجری میں اس دنیا سے چلا گیا۔اگرچہ عراقیوں کی طرف سے امام حسین علیہ السلام کو کوفہ تشریف لے آنے کی درخواستیں موصول ہوتی رہیں مگر آپؑ اپنے بھائی امام حسنؑ کی صلح کے احترام میں اہل عراق کی رائے ماننے پر تیار نہیں تھے۔اور فرمایا کہ جب تک معاویہ زندہ ہے کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ امامؑ نے نو سال تک مجبوراً معاویہ کی حکومت کو برداشت کیا تھا۔امام حسین علیہ السلام اور معاویہ کے درمیان روابط اور مختلف مواقع پر ہونے والی گفتگوئیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ امامؑ نے سیاسی اعتبار سے

معاویہ کی حکومت کو قطعی طور پر قانونی تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ مجھے اس امت کے لیے تمہاری حکومت سے بڑھ کو کوئی فتنہ نظر نہیں آتا۔

امام حسینؑ اور تحریک کربلا

ماہ رجب ۶۰ھ میں امیر شام معاویہ بن ابوسفیان کی موت واقع ہوئی۔ معاویہ نے اپنے بعد یزید بن معاویہ کو امت مسلمہ کا خلیفہ بنایا گیا۔ جبکہ وہ اپنے باپ کی طرح کسی بھی حیثیت سے مسلمانوں کا حکمران ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ یزید خاندانی اعتبار سے ابوسفیان کا پوتا تھا۔ یزید کی دادی ہندہ تھی کہ جس نے احد کے میدان میں سید الشہداء حضرت حمزہؓ کے کلیجہ کو نکال کر چبانے کی کوشش کی تھی اور ان کی لاش کی بے حرمتی کی تھی۔ یزید کا باپ معاویہ ایک چالاک حکمران، نفس رسول حضرت علی علیہ السلام سے عناد رکھنے والا اور کئی اصحاب رسولؐ اور محبان اہل بیتؑ کا قاتل تھا۔ یزید کی ماں میسون تھی جو کہ عیسائی خاندان کی ایک عورت تھی۔ اور عیسائیت کی اسلام مخالف سازشیں کسی سے چھپی نہ تھیں۔ اگر یزید ابن معاویہ کے کردار کے حوالے سے بات کی جائے تو اس کا کردار تو کردار، اس کا نام بھی اہل نظر و ادب کی نگاہ میں داخل دشنام ہے۔ یزید کی شخصیت کے تعارف کے لیے امام حسین علیہ السلام کے وہ جملات ہی کافی ہیں کہ جن میں آپؑ نے فرمایا: ”یزید ایک فاسق و فاجر، شرابی، بے گناہ افراد کا قاتل، اور سرعام فسق و فجور کا ارتکاب کرنے والا شخص ہے۔ اہل سنت کے مورّخ علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ: ”یزید بن معاویہ ناصبی، بدسرشت، بدکردار، شرابی اور بدکار انسان تھا۔ اس نے اپنی حکومت کا آغاز حسین ابن علی علیہ السلام کے قتل سے کیا اور انجام واقعہ حرہ پر کیا“۔ یہی وجہ تھی کہ یزید کی شخصیت عالم السلام میں مود لعن و طعن بن گئی۔

علامہ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں نقل کیا ہے کہ احمد بن حنبل کے فرزند عبداللہ نے اپنے باپ سے یزید پر لعنت کرنے کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ: جس پر خدا نے لعنت کی ہو اس پر کس طرح لعنت نہ کی جائے اور اس کے بعد آیت کا حوالہ دیا کہ جہاں فساد فی الارض یعنی زمین میں فساد پھیلانے والوں کو ملعون قرار دیا گیا ہے۔ یزید خلیفہ رسول کے نام پر اسلام کو پامال کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھرے دربار میں نہایت بے حیائی کا یہ اعلان کر رہا تھا کہ اسلام صرف بنی ہاشم کا کھیل ہے۔ نہ تو کوئی خبر آئی ہے نہ ہی کوئی وحی الٰہی نازل ہوئی ہے۔ یزید نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے ان مخالفین سے بیعت لینے کی ہر ممکن کوشش شروع کر دی جن کی مخالفت اس کے خلاف کسی شورش کا باعث بن سکتی تھی۔ چنانچہ یزید نے مدینہ میں اپنے گورنر ولید بن عتبہ بن ابوسفیان کو لکھا کہ جلد از جلد عبداللہ ابن زبیر اور حسینؑ بن علیؑ سے میری بیعت لو۔ لہٰذا ولید نے امام حسین علیہ السلام کو دربار میں بلایا۔ آپؑ اپنے بعض ساتھیوں اور عزیزوں کو مسلح کر کے اپنے ساتھ دربار ولید میں لے آئے تاکہ کسی بھی ناگہانی سے نمٹا جا سکے۔

ولید نے امام حسین علیہ السلام کے سامنے بیعت کا مطالبہ رکھا تو امامؑ نے فرمایا کہ: یزید جیسے شخص کے لیے خفیہ طور پر بیعت کرنا مناسب نہیں ہوگا بلکہ ضروری ہے کہ لوگوں کے سامنے اور مسجد کے اندر بیعت کی جائے۔ ولید نے امامؑ کی بات مان لی۔ مگر مروان بن حکم نے دھمکی آمیز الفاظ استعمال کرتے ہوئے ولید کو امامؑ کی گرفتاری پر اکسانے کی کوشش کی۔ اس پر امامؑ نے مروان کو سخت جواب دیا اور ولید کو مخاطب کر کے فرمایا:

ایھا الامیر ! انا نحن اھل بیت النبوۃ و معدن الرسالہ و مختلف الملائکہ و مھبط الرحمہ و بنا فتح اللہ و بنا یختم ، ویزید رجل شارب الخمر وقاتل نفس المحترمہ و معلن بالقسق، مثلی لا یبایع مثلہ

اے امیر! ہم اہل بیت نبوت ہیں، معدن رسالت ہیں، فرشتوں کی آمد و رفت کی جگہ ہیں، نزول رحمت کا مقام ہیں، خدا نے ہم ہی سے آغاز کیا ہے اور ہم ہی پر اختتام کیا ہے۔ اور یزید ایک فاسق، شرابی، بے گناہ افراد کا قاتل، سر عام فسق و فجور کا ارتکاب کرنے والا شخص ہے، مجھ (حسین) جیسا اس (یزید) کی بیعت نہیں کر سکتا۔

اس موقع پر جب مروان نے بیعتِ یزید پر اصرار کیا تو امام حسینؑ نے فرمایا:

وعلی الاسلام السلام

تو اسلام کا ہی خدا حافظ ہے۔ ''اگر یزید جیسا شخص مسلمانوں کا حکمران بن جائے تو اسلام پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔'' امام حسین علیہ السلام نے اپنی اس گفتگو میں اپنا موقف کھلے لفظوں میں بیان کر دیا ہے کہ آپؑ یزید کی بیعت اور اس کی حکومت کو غیر قانونی سمجھتے ہیں۔ آپؑ نے اپنے خاندان کی ممتاز صفات اور معاشرے میں اپنے مقام کی وضاحت کرنے کے بعد یزید کی خامیوں کو بھی بیاں فرمایا جو امت اسلامیہ کی رہبر اور قیادت کے سلسلے میں اس کے دعوے کے جھوٹے ہونے اور اس منصب کے لیے اس کی نالائقی کی دلیل ہے۔

ولید ابن عتبہ کے دربار میں بیعت یزید کو سختی سے رد کرنے کے بعد امام حسین علیہ السلام نے مدینہ منورہ میں قیام نامناسب سمجھا اور آپ ماہ رجب کی ۲۸ تاریخ کو مدینہ سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے، اس سفر میں تمام اہل بیت رسولؐ آپؑ کے ہمراہ تھے صرف محمد بن حنفیہ مدینہ میں رہے۔ البتہ مدینہ چھوڑنے سے پہلے اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے نام ایک وصیت نامہ تحریر فرمایا جس میں یزید کے خلاف قیام کے بنیادی عوامل کی طرف اشارہ فرمایا امامؑ نے فرمایا کہ (مدینہ سے) میرا نکلنا نہ خود پسندی اور تفریح کی غرض سے ہے اور نہ فساد اور ظلم وستم میرا مقصد ہے۔ میں تو صرف اس لیے نکلا ہوں کہ اپنے نانا کی امت کی اصلاح کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعرف اور نہی عن المنکر کو انجام دوں (اس انجام وہی میں) اپنے نانا اور اپنے والد گرامی کی سیرت کی پیروی کروں۔

گویا امام حسین علیہ السلام کا نکتہ نظر یہ تھا کہ اگر مجھ سے بیعت کا مطالبہ نہ بھی کیا جائے تب بھی میں خاموش اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا رہوں گا کیونکہ ارباب اقتدار سے میرا اختلاف محض یزید کی بیعت تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ یزید اور خاندان یزید ظلم وستم معاشرتی خرابیوں اور اسلامی احکام میں تبدیلی کا سبب بن رہا ہے اور بحیثیت امام میری ذمہ داری ہے کہ ان خرابیوں کی اصلاح، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی انجام دہی، اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے احیاء اور والد بزرگوار علیہ السلام کی سیرت کو زندہ کرنے اور عدل وانصاف کے فروغ کے لیے میدان میں اتروں اور دشمن اسلام بنی امیہ کا قلع قمع کردوں جوان تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ جب امامؑ مکہ پہنچے تو لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مکہ اسلام کا دینی مرکز تھا اور قدرتی طور پر وہاں کثرت کے ساتھ لوگوں کی آمد ورفت رہتی تھی۔ امامؑ کا مختلف شخصیات سے رابطہ تھا۔ اور آپؑ نے ان سے یزید کی بیعت نہ کرنے کا سبب بھی بیان فرمایا۔

سبق 9

تحریک کربلا

کوفہ کے شیعوں نے جب امام حسین علیہ السلام کی جانب سے یزید کی مخالفت اور آپؑ کی مکہ آمد کی خبر سنی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ وہ سالہا سال سے اس دن کے منتظر تھے اور انہوں نے امام حسن علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام حسین علیہ السلام کو تعزیتی خط بھیجا تھا کہ جس میں انہیں خلافت شروع کرنے کی دعوت بھی دی تھی۔ لیکن امام حسین علیہ السلام نے اسے قبول نہیں فرمایا تھا۔

اب اہل کوفہ نے ایک اجلاس منعقد کیا جس میں چند شیعہ رہنماؤں نے خطاب کیا جن میں صحابی رسول سلیمان بن صرد خزاعیؓ بھی شامل تھے۔ کوفہ کے سرداروں نے امامؑ کو کوفہ بلانے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا عہد کیا۔ اس کے بعد سرداران کوفہ سمیت متعدد افراد کے خطوط اور دعوت نامے امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچنے شروع ہوگئے۔ مورخین نے ان خطوط کی تعداد اٹھارہ ہزار سے زائد بیان کی ہے۔ چنانچہ صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ اب امامؑ کی طرف سے اہل کوفہ کی دعوت ٹھکرانا مشکل ہوگیا۔

حضرت مسلم بن عقیل کی کوفہ روانگی

اہل کوفہ کے پے در پے موصول ہونے والے خطوط کے جواب میں امام حسین علیہ السلام نے اپنے چچا زاد بھائی حضرت مسلم ابن عقیلؑ کو اپنا سفیر بنا کر کوفہ کی طرف روانہ کیا۔ امامؑ نے انہیں ہدایت فرمائی کہ: اگر تم دیکھو کہ لوگ میری

بیعت کے لیے تیار ہیں تو جلد از جلد مجھے اطلاع دینا تا کہ میں اس کے مطابق عمل کروں۔ حضرت مسلم بن عقیلؑ جن کی عمر اس وقت تقریباً ۴۰ سال تھی، انتہائی کھٹن اور دشوار گزار راستہ طے کرنے کے بعد کوفہ پہنچ گئے۔ اور وہاں جناب مختار ثقفیؒ کے گھر میں قیام فرمایا۔

جو کوفہ کے شیعوں میں ایک اہم مقام و منزلت کے حامل شخص تھے۔ اس کے بعد آپ نے لوگوں سے امام حسین علیہ السلام کے لیے بیعت لینا شروع کی۔ یہ بیعت کتاب خدا اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دعوت، ظالموں کے خلاف جہاد، کمزوروں کا دفاع، محرومین کی مدد، مسلمانوں کے درمیان بیت المال کی عادلانہ تقسیم، اہل بیت السلام کی مدد اور گفتار و کردارِ اہل بیتؑ کی مکمل پیروی جیسی شرائط پر مشتمل تھی۔ جناب مسلمؑ کے کوفہ پہنچنے کے تقریباً ۳۵ روز بعد (پانچ شوال ۶۰ ہجری) تک اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ افراد نے آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ روز بروز جناب مسلمؑ کے حامیوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور حکومت کی گرفت کوفہ پر کمزور پڑ گئی تھی۔

چنانچہ جناب مسلمؑ نے امام حسینؑ کو خط لکھا کہ آپ کوفہ تشریف لے آئیں حالات انتہائی سازگار ہیں۔ دوسری طرف بنو امیہ کے جاسوس جو گورنر کوفہ نعمان بن بشیر کی کارکردگی سے سخت نالاں تھے، انہوں نے یزید کے نام خط لکھا کہ اگر تمہیں کوفہ کی ضرورت ہے تو اس کے بارے میں جلد کوئی مناسب فیصلہ کر دو۔ چنانچہ یزید نے فوری حکم نامہ صادر کر کے نعمان بن بشیر کو معزول کر دیا۔ اور ایک فاسق، ظالم اور شقی القلب شخص عبید اللہ ابن زیاد کو بصرہ کے ساتھ ساتھ کوفہ کی گورنری بھی سپرد کر دی۔ عراقیوں کی سرکوبی کے لیے ابن زیاد کا اہم ترین حربہ اور کارآمد ہتھیار دھمکی تھی۔ چنانچہ اس نے کوفہ پہنچتے ہی عمائدین کوفہ کو بلوایا اور انہیں یزید کی مخالفت اور بغاوت کرنے کی صورت میں شدید ڈرایا اور دھمکایا۔ اس نے کوفہ کے اندر اپنے جاسوسوں کا جال بچھا دیا۔

ابن زیاد کے ان اقدامات کے باعث جناب مسلمؑ نے اپنی سرگرمیاں خفیہ کر لیں اور قبیلہ مزحج کے سردار جناب ہانی بن عروہ کے گھر میں پناہ لی جب اس کا علم عبید اللہ ابن زیاد کو ہوا تو اس نے جناب ہانی بن عروہ کو گرفتار کر لیا گیا ادھر جناب مسلمؑ نے اپنے کچھ اعوان و انصار کے ہمراہ ابن زیاد کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ بعض روایات کے مطابق کوفہ سردار اور زعماء اس وقت ابن زیاد کے دربار میں موجود تھے چنانچہ ابن زیاد کے اکسانے پر انہوں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو دھمکانا شروع کر دیا اور انہیں یہ کہہ کر ڈرایا کہ کل شام سے ایک بہت بڑا لشکر کوفہ پہنچ جائے گا جو تمہاری نسلوں تک کو تباہ و برباد کر دے گا۔

اس کے بعد لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہونا شروع ہو گئے یہاں تک کہ جب مسلم بن عقیلؑ نے مغرب کی نماز ادا کی تو آپؑ کے گرد صرف ۱۳۰ افراد بچ گئے تھے اور کچھ دیر بعد وہ بھی منتشر ہو گئے اور جناب مسلمؑ کوفہ میں تنہا رہ گئے۔

عبداللہ ابن زیاد کے سپاہیوں نے آپؑ کی تلاش شروع کردی۔ بالآخر ایک جھڑپ کے بعد آپ کو گرفتار کرلیا گیا۔ اور آپ کو دارالامارہ کی چھت پر سے شہید کر کے بے دردی کے ساتھ نیچے گرا دیا گیا۔

عراق کی جانب امام حسینؑ کی روانگی

اہل کوفہ اور جناب مسلم بن عقیلؑ کے خطوط کے بعد امام حسین علیہ السلام کو اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ بنوامیہ کے خلاف قیام کے لیے حالات سازگار ہیں لہٰذا آپؑ جلد کوفہ پہنچنا چاہتے تھے۔ آپؑ آٹھ ذہ الحجہ کو یعنی عین اعمال حج کے درمیان عمرہ تمتع کو عمرہ مفردہ میں تبدیل کر کے عراق کی طرف روانہ ہوگئے۔ ایک لمحے کی تاخیر بھی عراق کی حالت کو دگرگوں کرسکتی تھی۔ اس کے علاوہ امامؑ کو مکہ میں ہی قتل کیے جانے کا امکان بھی موجود تھا۔ اور آپؑ کا مکہ میں رہنا کسی صورت بھی مصلحت کے مطابق نہ تھا۔ جب امام حسین علیہ السلام کا قافلہ مقام ’صفاح‘‘ پر پہنچا تو آپؑ کی ملاقات ایک جوان شاعر فرزدق سے ہوئی، جو کوفہ سے آرہا تھا۔ امامؑ نے اس سے کوفہ کے حالات کے متعلق پوچھا تو اس نے جواب دیا:

قلوب الناس معك و سيوفهم عليك

لوگوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں۔ مگر ان کی تلواریں آپ کے خلاف ہیں۔!

’’’بطن الرمہ‘‘ کے مقام پر آپؑ نے اہل کوفہ کے نام خط لکھ کر اپنی آمد کی خبر دے دی۔ یہ خط آپ نے قیس بن مسہر صیداوی کے سپرد کیا تا کہ وہ اہل کوفہ تک اسے پہنچا دیں مگر راستے میں عبداللہ ابن زیاد کے فوجیوں نے ان کو گرفتار کرلیا اور ابن زیاد نے انہیں شہید کر دیا۔ اور ’’زبالہ‘‘ کے مقام پر آپؑ کو قیس بن مسہر صیداوی اور اپنے رضاعی بھائی عبد اللہ بن یقطر کی شہادت کی خبریں موصول ہوئیں۔ یہ اطلاعات اس بات کی نشاندہی کر رہی تھیں کہ کوفہ کی وہ کیفیت جو جناب مسلمؑ نے بتائی تھی اب تبدیل ہو چکی ہے۔ اس موقع پر امامؑ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور فرمایا:

اے لوگو! ہمارے شیعوں نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ تم میں سے جو جانا چاہتا ہے وہ یہیں سے واپس چلا جائے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پر وہ لوگ امام حسین علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ گئے جو راستے میں اس لیے ساتھ ہو لیے تھے کہ امام علیہ السلام کے ہاتھ حکومت آنے والی ہے لیکن امامؑ کے خاص اصحاب آپؑ کے ہمراہ رہ گئے۔ اس مرحلے کے بعد بھی امام نے اپنا سفر جاری رکھا۔

آپؑ مقام اشراف کی جانب روانہ ہوئے رات وہیں بسر کی اور اگلے دن پھر سفر کا آغاز کیا۔ اسی دن دوپہر کے وقت دور سے ابن زیاد کے ۱۰۰۰ سپاہی حر بن یزید ریاحی کی سربراہی میں نمودار ہوئے۔ اور امامؑ کا راستہ روک لیا یہ سپاہی دوپہر کی شدید گرمی میں گرد و غبار میں اٹے ہوئے اور بھاری اسلحوں کے بوجھ سے تھکے ماندے ہونے کے ساتھ

ساتھ پیاس کی شدت سے نڈھال بھی تھے یہ دیکھ کر امام حسین علیہ السلام نے اپنے اصحاب وانصار کو حکم دیا کہ وہ ان سپاہیوں اوران کے پیاسے گھوڑوں کو سیراب کریں اصحاب نے آپ کے حکم کی تعمیل کی۔

حرابن یزید ریاحی کو بھیجنے کا مقصد امامؑ کو کوفہ میں داخل ہونے سے روکنا تھا جبکہ امامؑ اپنا سفر جاری رکھنا چاہتے تھے۔ کافی بحث وتکرار کے بعد آخر حربن یزید ریاحی نے امامؑ کو ایک ایسا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا کہ جو نہ تو کوفہ کی طرف جاتا ہو نہ ہی مدینہ کی طرف۔ اس طرح امام حسینؑ کا قافلہ اور حربن یزید کا لشکر ایک دوسرے کے متوازی چلتے ہوئے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ نینوا کے مقام پر پہنچ گئے۔ اس مقام پر ابن زیاد کا ایک قاصد حر کے نام ایک خط لے کر آیا کہ جس کا مضمون یہ تھا کہ:

یہ خط ملتے ہی حسین ابن علی علیہ السلام کے ساتھ سختی سے پیش آؤ اور انہیں ایک ایسے بیاباں میں اترنے پر مجبور کر دو جہاں نہ پانی ہو اور نہ کوئی پناہ گاہ ہو۔

بہر حال امام حسین علیہ السلام کے اصرار پر یہ قافلہ کچھ آگے بڑھا اور ۲ محرم الحرام ۶۱ھ کو کربلا پہنچ گیا۔ امام نے اس جگہ کا نام دریافت کیا تو بتایا گیا اس جگہ کو ''طف'' کہا جاتا ہے۔ امامؑ نے پوچھا اس کا کوئی اور نام بھی ہے؟ عرض کیا گیا اسے 'کربلا' کہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

بارالہا! رنج وغم سے میں تیری پناہ مانگتا ہوں' (پھر فرمایا) یہی ہمارے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ خدا کی قسم! یہی ہماری قبروں کا مقام ہے یہیں سے ہم بروز قیامت زندہ کیے اور اٹھائے جائیں گے، میرے جد امجد نے اس کا وعدہ کیا تھا اور ان کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔

حربن یزید ریاحی نے ایک خط کے ذریعہ ابن زیاد کو امام حسین علیہ السلام کے کربلا پہنچنے کی اطلاع دی۔ یہ خبر پاکر ابن زیاد نے امام حسین علیہ السلام کے نام ایک خط ارسال کیا جس کا مضمون یہ تھا:

اما بعد! مجھے آپؑ کے کربلا پہنچے کی اطلاع ملی ہے امیر المومنین یزید ابن معاویہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس وقت تک چین سے نہ سوؤں اور پیٹ بھر کر کھانا نہ کھاؤں جب تک آپؑ کو قتل نہ کر دوں یا پھر آپؑ میرا حکم قبول کرتے ہوئے یزید کی حکومت کے مطیع نہ ہو جائیں۔ والسلام۔

امامؑ نے ابن زیاد کا خط پڑھ کر زمین پر پھینک دیا اور فرمایا:

وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی، جو خالق کی ناراضگی کی قیمت پر مخلوق کی خوشنودی اور رضا حاصل کرے۔ اس (ابن زیاد) کے لیے ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے اللہ کا عذاب طے ہو چکا ہے۔

امام حسین علیہ السلام کے کربلا پہنچنے کے اگلے ہی روز رفتہ رفتہ ابن زیاد کے سپاہی پہنچنا شروع ہو گئے ابن زیاد کا

اصرار تھا کہ کوفہ کے تمام لوگ اس جنگ میں شریک ہوں یہ پالیسی مستقبل میں صرف چند قبیلوں کو قتل حسینؑ کے الزام سے بچانے کے لیے اور اس اقدام میں تمام قبائل کو ملوث کرنے کے لیے اختیار کی گئی تھی تا کہ کل کو کوئی شخص یا قوم یا آواز امام مظلومؑ کے حق میں نہ اٹھ سکے۔ عاشورا سے چند روز قبل ابن زیاد کی طرف سے عمر بن سعد کو حکم نامہ ملا کہ:

امام حسینؑ اور پانی کے درمیان اس طرح حائل ہو جاؤ کہ وہ پانی کا ایک قطرہ بھی نہ پا سکے۔ اس طرح سات محرم الحرام کو خیام حسینی پر پانی بند کر دیا گیا۔ ابن زیاد کا لشکر ۹ محرم کی شام کو بھی حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن امام حسینؑ نے ایک رات کی مہلت طلب فرمائی اس رات آپؑ نے اپنے اصحاب کا امتحان لیا اور ان سے اپنی بیعت اٹھائی اور فرمایا:

اگر وہ جانا چاہتے ہیں تو رات کی تاریکی میں چلے جائیں۔ حتی کہ اوہ خاندان اہل بیتؑ کے کچھ افراد کو بھی ہمراہ لے جائیں مگر امام حسینؑ کے باوفا اور جاں نثار اصحاب نے اپنی خون کے آخری قطرہ تک امام مظلومؑ کا ساتھ دینے کا تہیہ کیا۔ شب عاشور امام حسین علیہ السلام کے خیموں میں عجیب وغریب جوش وجذبہ اور غیر معمولی ولولہ نظر آتا تھا۔ کوئی اپنا اسلحہ تیار کر رہا تھا، کوئی اللہ کی عبادت اور اس کے ساتھ راز و نیاز کر رہا تھا اور کوئی قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول تھا۔ مورخین لکھتے ہیں:

''اصحاب امام کے خیام سے اس طرح عبادت اور تلاوت قرآن کی آواز آتی تھیں جس طرح شہد کی مکھیوں کے چھتے سے جھنجھناہٹ کی آواز آتی ہے۔ کوئی حالت قیام میں تھا، کوئی رکوع میں اور کوئی سجدے کی حالت میں تھا۔

بالآخر دسویں محرم کا دن بھی طلوع ہوا امام حسین علیہ السلام نے نماز فجر ادا کی اور اپنی مختصر فوج کی صف بندی کرنے لگے۔ ادھر دشمن بھی جنگ کے لیے آمادہ ہو چکا تھا۔ لڑائی سے پہلے اور لڑائی کے دوران بھی متعدد بار امام نے فوج یزید کے سامنے اتمام حجت اور ان کے ضمیروں کو جھنجوڑنے کے لیے خطبات ارشاد فرمائے جن کے نتیجہ میں کچھ لوگ لشکر یزید کو چھوڑ کر امام حسین علیہ السلام کے لشکر میں شامل بھی ہوئے۔ لیکن اکثر کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ خاندان اہل بیتؑ کے لیے مصائب وآلام لے کر آنے والا یہ دن عزیز واقارب اور باوفا اصحاب کی شہادت کے ساتھ ساتھ خیام آل رسولؐ کی تاراجی اور شہداء کے لاشوں کی پامالی پر اختتام پذیر ہوا۔

مگر سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے باوفا اصحاب کی شہادت نے معاشرے میں ایک انقلاب برپا کر دیا جس سے پورے عالم اسلام میں یزیدیت کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے اور حجاز وعراق کے گوشہ وکنار سے حکومت وقت کے خلاف تحریکیں اٹھنے لگیں اور لوگوں میں از سر نو ظالم حکمران کے خلاف آواز اٹھانے کا حوصلہ اور جرات پیدا ہوگئی۔

(اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ)

سبق 10

حضرت امام علی ابن الحسین علیہ السلام

مختصر تعارف:

اسم مبارک:	علی
مشہور القاب:	سید الساجدین زین العابدین، سجاد، ذوالثفنات
تاریخ ولادت:	۱۵ جمادی الاول ۳۸ھ
تاریخ شہادت:	۲۵ محرم الحرام ۹۵ھ
مقام ولادت:	مدینہ منورہ
مدفن:	جنت البقیع (مدینہ)
والد بزرگوار:	حضرت امام حسین علیہ السلام
عمر مبارک:	۵۷ سال
والدہ ماجدہ:	حضرت شہر بانو
مدت امامت:	۳۴ سال
کنیت:	ابو محمد
اولاد:	۱۵، اولادیں (۱۱ بیٹے ۴ بیٹیاں)۔
بادشاہان وقت:	معاویہ بن ابوسفیان، یزید ابن معاویہ، معاویہ ابن یزید، مروان بن حکم عبدالملک بن مردان، ولید بن عبدالملک

اخلاق و اوصاف:

اہل بیتؑ میں ہر فرد کا اخلاق ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے لیکن امام علی ابن الحسین علیہ السلام نے اخلاقیات کے مظاہرے کے ساتھ ساتھ فلسفہ اخلاق کو بھی واضح کیا۔ جس سے انسان اپنے کردار کی بہترین تعمیر کر سکتا ہے۔ آپؑ کی ذات علم و عمل، زہد و تقوی کی عبادت سخاوت اور حلم کا بہترین نمونہ تھی۔ عبادت میں اس مقام پر پہنچے کہ زین العابدین (یعنی عبادت گزاروں کی زینت) کا لقب پایا۔ بعض روایات کے مطابق یہ لقب آپؑ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا تھا

اور اپنی زندگی میں ہی خبر دے گئے تھے کہ روز قیامت جب ''زین العابدین'' کو آواز دی جائے گی تو میرا ایک فرزند علی ابن الحسین علیہما السلام لبیک کہتا ہوا بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوگا۔

آپؑ کے ایک لقب 'سجادؑ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ ہر معمولی نعمت خدا کے ملنے یا مصیبت کے دفع ہو جانے یا مؤمنین کے درمیان صلح ہو جانے پر سجدہ شکر بجالاتے تھے لہٰذا سجاد (کثرت سے سجدہ کرنے والا) کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

خوف خدا کا یہ عالم تھا کہ جب آپؑ وضو شروع کرتے۔ تو چہرے کا رنگ بدل جاتا کہ رب العالمین کی بارگاہ میں حاضری دینا ہے۔ بسا اوقات نماز میں سورہ حمد کی تلاوت کرتے ہوئے ''مالک یوم الدین'' کی تکرار فرمایا کرتے تھے اور آپؑ کا بدن کانپتا رہتا تھا کہ کس کی بارگاہ میں کھڑا ہوں جو روز قیامت کا مالک ہے پوری کائنات اس کے قبضہ قدرت میں ہے اور کسی کا کوئی اختیار نہیں ہے اور مال و اولاد کچھ کام آنے والا نہیں ہے۔

ایک مرتبہ امام محمد باقر علیہ السلام نے دیکھا کہ رات بھر عبادت خدا میں بیدار رہنے کی وجہ سے آپؑ کا رنگ زرد ہو چکا تھا اور شدت گریہ کے باعث آپؑ کی آنکھیں علیل ہو چکی تھیں۔ پیشانی اور ناک سجدہ کرنے کی وجہ سے زخمی ہو چکی تھی پنڈلیوں اور پاؤں پر مسلسل قیام کی وجہ سے ورم آچکے تھے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے اپنے بابا کی یہ حالت دیکھی نہ گئی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ دیکھ کر امام زین العابدینؑ اپنے فرزند کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ ذرا مجھے ان صحائف و کتب میں سے وہ دینا جس میں حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی عبادت کا تذکرہ ہے جب امام محمد باقر علیہ السلام نے وہ صحیفہ آپؑ کو دیا تو آپ نے اس میں سے تھوڑا سا پڑھا اور پھر فرمایا:

کس کے بس میں ہے کہ وہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام جیسی عبادت کر سکے؟!

امام زین العابدینؑ علوم آل محمدؐ حاصل کرنے والوں کی بہت زیادہ عزت فرمایا کرتے تھے۔ ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ جب آپؑ کے پاس کوئی سائل آتا۔ تو جو کچھ ہوتا اس کو عطا کر دیتے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ شخص وہ ہے جو میرے مال کو دنیا سے آخرت تک پہنچا دیتا ہے اور کسی اجرت کا مطالبہ نہیں کرتا۔ مدینہ منورہ میں چار سو غرباء کے گھرانے تھے جہاں رات کی تاریکی میں سامان غذا پہنچایا کرتے تھے اور اس طرح پشت مبارک پر سامان اٹھانے کے واضح نشان پڑ جاتے تھے۔ آپ نے جس ناقہ پر سوار ہو کر حج کیے اسے کبھی ایک تازیانہ تک نہیں لگایا۔

شیخ مفیدؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ امام زین العابدینؑ کے رشتہ داروں میں سے ایک شخص آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؑ کو برا بھلا کہا آپؑ نے اس کے جواب میں کچھ نہ فرمایا، جب وہ شخص چلا گیا تو آپؑ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ اس شخص کے گھر چلیں تا کہ میں اس کی گالیوں کا جواب

دے سکوں۔

پس آپؑ اپنے اصحاب کے ہمراہ گئے اور راستے میں یہ آیت تلاوت کر رہے تھے۔

وَالْكٰظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ

"اور وہ لوگ جو غصے کو پی جاتے ہیں لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"[1]

جب اس شخص کو یہ معلوم ہوا کہ امامؑ اس کے گھر کی طرف آ رہے ہیں تو اس نے خیال کیا کہ یقیناً آپؑ بھی بدلہ لینے کے لیے آ رہے ہیں لہٰذا وہ بھی لڑائی کی غرض سے تیار ہو کر امام کے سامنے آ گیا لیکن امام زین العابدینؑ نے فرمایا: اے بھائی! تو نے جو کچھ کہا ہے اگر وہ باتیں میرے اندر پائی جاتی ہیں تو خدا مجھے معاف کرے، اور اگر وہ باتیں مجھ میں نہیں پائی جاتیں تو خدا تجھے معاف کرے۔ یہ سن کر وہ شخص آگے بڑھا اور امامؑ کی پیشانی پر بوسہ دے کر کہنے لگا کہ بے شک جو باتیں میں نے کہی ہیں وہ آپؑ میں موجود نہیں ہیں اور میں خود ان باتوں کا زیادہ مستحق ہوں۔

احوال و واقعات

امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنی زندگی کے ابتدائی دو سال اپنے دادا علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے زیر سایہ گزارے۔ اور اس کے بعد آپؑ اپنے عم نامدار حضرت امام حسن علیہ السلام اور واقعہ کربلا تک اپنے والد بزرگوار امام حسین علیہ السلام کے ہمراہ رہے۔ واقعہ کربلا کے بعد آپؑ کی امامت کا آغاز ہوا اور اس سلسلے میں سب سے پہلی اور عظیم ذمہ داری جو آپؑ کے کندھوں پر عائد ہوئی وہ انقلاب عاشورا کو کامیاب بنانا تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جس وقت عہدہ امامت آپؑ کو ملا اس وقت اسلام تباہی کے دہانے پر کھڑا تھا لوگوں نے ایک فاسق و فاجر، ظالم و شراب خور انسان کو مسند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بٹھا دیا تھا اور اس کے ہر حکم کو شرعی حکم اور اسلام کا درجہ دے رکھا تھا ان حالات میں امام سجاد علیہ السلام کو آثار نبوت و امامت اور مذہب کے بنیادی ارکان کا تحفظ کرنا تھا آپ کا مقابلہ انہی بنی امیہ سے تھا جن کی اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

امیہ کی اولاد نے ایک بار پھر اسلامی معاشرے کو دور جاہلیت کی طرف لوٹا دیا تھا۔ ظلم و بربریت کا بازار گرم کر رکھا تھا ہر قسم کی طاقت اسلام کے دشمنوں کے ہاتھوں میں تھی۔ ایسے خطرناک اور بدترین حالات میں بات صرف شہادت حسین ابن علی علیہ السلام پر منتہی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ ایک ایسی مقتدر شخصیت کی ضرورت تھی جو اسلامی معاشرے میں اس شہادت عظمیٰ کی نشر و اشاعت کرے اور فکری طور پر مردہ انسانوں میں ازسرنو روح پھونک دے ایک ایسے انسان کی ضرورت تھی جو عدل دشمن عناصر کے مقابلے میں ڈٹ جائے اور لوگوں کی فکر اور سوچ کو دشمن کے ہاتھوں سے آزاد کرلے۔ ایسا انسان کہ جو امویوں کی سالہا سال تبلیغات کو ناکام بنا کر لوگوں کو دوبارہ دین حق کی طرف پلٹا دے۔ اللہ نے یہ

عظیم ذمہ داری عالم اسلام کے مقتدر انسان امام زین العابدین علی ابن الحسین علیہ السلام کے دوش مبارک پر رکھی تھی۔

چنانچہ ابھی حادثہ کربلا کو دو دن سے زیادہ نہیں گزرے تھے کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے شہر کوفہ میں لوگوں کے سامنے ایک انقلابی خطبہ دیا اور ان کے سامنے یہ ثابت کیا کہ بنوامیہ کی روش غیر قانونی اور مذہب اِسلام کے اصول وقواعد کے سراسر خلاف ہے۔ وہ اسلام کے لبادے میں اسلام ہی کو نیست و نابود کرنے کے لیے کس قدر کوشاں ہیں اور اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قتل اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام نے حالت اسیری میں کوفہ و شام میں اپنے خطبات کے ذریعے لوگوں کے اذہان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

شام میں یزید نے جب امامؑ سے نازیبا الفاظ میں گفتگو کی اس وقت آپؑ نے ایک عظیم الشان خطبہ ارشاد فرمایا کہ جس میں شامیوں کے سامنے اپنا اور اپنے خاندان کا تعارف کرایا۔ مسجد میں موجود شامی، جو اموی پروپیگنڈے کی وجہ سے غفلت کا شکار تھے اور خاندان رسولؐ سے نا آشنا تھے، انہیں امامؑ کے اس خطبے نے کسی حد تک آگاہ کیا اور ان پر بنوامیہ کا حقیقی چہرہ آشکار ہونے لگا۔

یہی وجہ ہے کہ یزید نے خطبے کے دوران مداخلت کی اور اسے جاری نہ رہنے دیا۔ اس کے بعد لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے آل رسولؐ کے قتل کا سارا گناہ عبید اللہ ابن زیاد کے سر تھوپ دیا اور علی ابن الحسین علیہ السلام اور دوسرے اسیران کربلا کو کچھ عرصہ قید میں رکھنے کے بعد مدینہ روانہ کر دیا۔

صحیفہ سجادیہ

عوام کی فکر اور سوچ کو بنی امیہ کے پلید شکنجوں سے آزادی دلانے کے بعد امام زین العابدینؑ کی دوسری ذمہ داری اسلامی معارف کی نشر و اشاعت کر کے لوگوں کے دلوں کو دوبارہ صحیح دین و مذہب کی طرف پلٹانا تھا۔ سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی طور پر بے راہ روی کے شکار معاشرے کی تربیت کے لیے امام سجاد علیہ السلام نے دعا و مناجات کا سہارا لیا۔ امام سجاد علیہ السلام کی دعاؤں کا مجموعہ ''صحیفہ سجادیہ'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اگرچہ بظاہر ان دعاؤں کا اصل مقصود معرفت الٰہی اور عبادت ہی تھا لیکن اگر ان دعاؤں میں موجود عبارتوں پر غور کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان دعاؤں کے ذریعے لوگ ان سیاسی مفاہیم سے بھی آشنا ہو سکتے تھے جو امام زین العابدین علیہ السلام کے پیش نظر تھے۔

امام علیہ السلام کی دعاؤں کا شاہکار مجموعہ صحیفہ سجادیہ پچاس سے کچھ زائد دعاؤں پر مشتمل ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام کی دعاؤں کے صرف کچھ ہی حصے پر مشتمل ہے اور بعض دوسرے مجموعوں میں بھی آپؑ کی دعائیں جمع کی گئی ہیں۔ آپؑ کی دعاؤں میں ایک ایسی عبارت موجود ہے جسے کثرت کے ساتھ دہرایا گیا ہے اور شاید ہی کوئی دعا اس عبارت

سے خالی ہوگی۔

یہ عبارت ''محمدؐ و آل محمدؐ '' پر صلوات ہے۔ جس زمانے میں اہل بیت رسولؐ کا نام تک لینا جرم سمجھا جاتا تھا اور سر منبر علیؑ و اولاد علیؑ پر سب وشتم ہوتا تھا، ایسے حالات میں اس عبارت کا استعمال بخوبی اپنی اہمیت کا عکاس ہے۔ آپؑ کی دعاؤں میں 'محمد و آله الطیبین الطاهرین الاخیار الانجبین جیسی عبارتیں بار بار دہرائی گئی ہیں۔

اس طرح سے آپؑ عوام میں اہل بیتؑ سے مضبوط وابستگی پیدا کرنا چاہتے تھے اور فرمایا کرتے تھے:

''اللہ تعالی نے عالم پر اپنے پیغمبرؐ پر درود بھیجے کو واجب کیا ہے اور ہمیں بھی ان کے ساتھ ملا دیا ہے تو جو رسول اللہؐ پر صلوات بھیجے لیکن ہم پر درود نہ بھیجے اس نے رسولؐ پر صلوات کو ادھورا چھوڑ دیا اور حکم خدا کو ترک کر دیا ہے''۔

صحیفہ سجادیہ کے اہم ترین مضامین میں سے ایک ''امامت'' بھی ہے امامؑ نے مختلف دعاؤں میں حق خلافت اور امامت و رہبری کو اہل بیت رسولؐ کے لیے مقدم ہونے کو آشکار کیا۔

الغرض امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنی دعاؤں میں ایک بگڑے ہوئے معاشرے کو حقیقی اسلامی معارف سے روشناس کرایا یوں لوگوں کو ایک نئی زندگی دینے اور مستقبل میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی سرگرمیوں کے لیے سازگار حالات فراہم کرنے میں کامیاب رہے۔

واقعہ حرہ

واقعہ کربلا کے بعد جب اہل حرم شام سے رہائی پانے کے بعد واپس مدینہ پہنچے اور مدینہ والوں کو یزید کے مظالم کا اندازہ ہوا تو ایک مرتبہ احتجاج کی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے مدینہ میں یزید کے نمائندے عثمان بن محمد کو معزول کر کے عبداللہ بن حنظلہ کو حاکم بنا دیا جو جناب حنظلہ غسیل الملائکہ کے بیٹے تھے۔ یزید نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے بدترین انسان مسلم بن عقبہ کا انتخاب کیا اور اس نے مدینہ پر چڑھائی کا منصوبہ بنالیا۔

اہل مدینہ نے دفاع کا ارادہ کیا اور شہر سے باہر مقام حرہ پر گھمسان کا رن پڑا۔ جس کے نتیجے میں دس ہزار مسلمان جن میں سات سو حافظان قرآن بھی شامل تھے قتل کر دیے گئے اور ہزاروں خواتین کی عصمت دری کی گئی، سارا شہر لوٹ لیا گیا اور تین دن تک مدینہ منورہ لشکر یزید کے لیے مباح قرار دیا گیا۔

یہ واقعہ ۲۷، ۲۸ ذی الحجہ ۶۳ھ کو پیش آیا۔ امام زین العابدینؑ ان حالات کے پیش نظر ایک دیہات ''ینبع'' کی طرف منتقل ہو گئے تھے اور لشکر یزید نے بھی سارے مدینہ سے غلامی کی بیعت لینے کا باوجود آپؑ سے بیعت کا تقاضا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یزید ایک مرتبہ مطالبہ بیعت کا حشر دیکھ چکا تھا اور اس کا نتیجہ بھگت رہا تھا۔

اس موقع پر مروان جیسے بدترین دشمن نے بھی امام زین العابدین علیہ السلام سے پناہ کی درخواست کی کہ مدینہ

مخالف ہوگیا ہے اور میں اپنے بچوں کے لیے خطرہ محسوس کرتا ہوں تو آپؑ نے اس شخص کے گھرانے کو بھی پناہ دے دی جس نے سب سے پہلے قتل امام حسین علیہ السلام کا اشارہ دیا تھا۔

کعبہ پر آتش باری

مدینہ کو تباہ و برباد کرنے کے بعد مسلم بن عقبہ نے مکہ مکرمہ کا رخ کیا لیکن راستے میں ہی وہ واصل جہنم ہو گیا اور حصین بن نمیر کی قیادت میں لشکر یزید نے چالیس روز تک مکہ کا محاصرہ کیسے رکھا اور عبداللہ بن زبیر کو گرفتار کرنے کے لیے خانہ کعبہ پر آگ برسائی گئی مگر وہ گرفتار نہ ہوسکا۔ اسی دوران یزید بھی واصل جہنم ہو گیا اور مکہ کا نقشہ بدل گیا، عبداللہ بن زبیر کو فتح حاصل ہوئی اور حصین بن نمیر بھاگ گیا۔

۸۶ھ میں عبدالملک کا بیٹا ولید حاکم بنا اور اسی نے ۹۵ھ میں امام زین العابدین علیہ السلام کو زہر دلوا کر شہید کر دیا۔ آپؑ کی شہادت کا یہ اثر ہوا کہ سارے مدینہ میں کہرام بپا ہو گیا اور مدینہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غم و اندوہ میں ڈوب گیا۔

(اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ)

سبق 11

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

مختصر تعارف:

اسم مبارک:	محمد
مشہور القاب:	باقر، شاکر، ہادی
تاریخ ولادت:	یکم رجب المرجب ۵۷ھ
تاریخ شہادت:	۷ ذی الحجہ ۱۱۴ھ
مقام ولادت:	مدینہ منورہ
مدفن:	جنت البقیع (مدینہ منورہ)
والد بزرگوار:	حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام
عمر مبارک:	۵۷ سال
والدہ ماجدہ:	جناب فاطمہ بنت حسنؑ
مدت امامت:	۱۹ سال

کنیت: ابوجعفر

اولاد: ۷ اولادیں (۵ بیٹے، ۲ بیٹیاں)

بادشابان وقت: معاویہ ابن ابوسفیان، یزید ابن معاویہ، معاویہ ابن یزید، مروان بن حکم، عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، عمر ابن عبدالعزیز، یزید بن عبدالملک، ہشام بن عبدالملک

اخلاق واوصاف

امام محمد باقر علیہ السلام کی پر عظمت شخصیت کا تعارف خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں کرایا تھا جب انہوں نے جناب جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کو اپنے تمام جانشینوں اور آئمہ معصومین کے نام بتلائے تو امام محمد باقر علیہ السلام کا خصوصی طور پر نام لے کر فرمایا کہ:

اے جابر! خدا تمہیں اتنی لمبی عمر عطا کرے گا کہ تم میرے اس فرزند سے ملاقات کا شرف حاصل کرو گے جو لوگوں میں سب سے زیادہ مجھ سے مشابہ ہوگا اور اس کا نام میرے نام پر ہوگا، جب تم اس سے ملو تو اسے میرا اسلام پہنچا دینا۔

جب حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ بوڑھے ہو گئے اور انہیں اپنا وقت وفات قریب نظر آنے لگا تو وہ مسلسل کہا کرتے تھے کہ:

اے باقر! اے باقر! کہاں ہو؟ یہاں تک کہ ایک دن ان کی ملاقات امام باقر علیہ السلام سے ہوگئی، وہ آپ ؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس حال میں کہ مسلسل آپ ؑ کے ہاتھوں اور پیروں کو چومتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ: میرے ماں باپ آپ ؑ پر فدا ہوں۔ آپ ؑ اپنے جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شبیہ ہیں اور آپ ؑ کے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ ؑ کو سلام کہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس روایت کے نقل ہو جانے کی وجہ سے آپ ؑ ''باقر'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ یعنی آپ ؑ نے علم کو شگافتہ کیا اور اس کے اسرار و رموز کو واضح کیا۔ امام محمد باقر علیہ السلام کو اپنے زمانہ حیات میں بہت زیادہ علمی شہرت حاصل تھی اور آپ ؑ کی بزم تمام اسلامی شہروں اور سرزمینوں سے تعلق رکھنے والے آپ ؑ کے محبین سے بھری رہتی تھی۔

ایک عالم اور فقیہ کی حیثیت سے اور بالخصوص علوم آل محمد ؐ کے ایک نمائندے کی حیثیت سے آپ ؑ کا علمی مقام بہت سے لوگوں کو اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ وہ آپ ؑ کی بزم سے استفادہ کریں اور اپنی علمی و فقہی مشکلات کا حل آپ ؑ سے طلب کریں۔ حصول علم کے لیے نا فقط حجاز سے بلکہ عراق اور خراسان سے بھی بہت زیادہ تعداد میں لوگ آپ ؑ کی

خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔اور اس بات میں کوئی شک اور تردید نہیں ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ میں سے امیر المومنین علی علیہ السلام کے بعد اکثر روایات کی سند امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام تک جاتی ہے اور اس کی وجہ زمانے کے مخصوص سیاسی حالات تھے، جن کی بناء پر ان دو اماموں کو دوسرے اماموں سے زیادہ علوم آل محمدؐ کی نشر واشاعت کا موقع ملا۔

چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام کے متعلق کہا گیا ہے کہ تفسیر قرآن، کلام، احکام اور حلال وحرام کے بارے میں جو کچھ آپؑ سے صادر ہوا ہے اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی اولادوں میں سے کسی اور سے صادر نہیں ہوا۔ آپؑ سے علوم اہل بیتؑ حاصل کرنے والوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہوئی تھی اور آپؑ کے شاگردوں نے سینکڑوں کتابیں لکھیں۔ جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام کے دور سے اسلامی دنیا میں علم و مذہب نے کس قدر ترقی کی منازل طے کیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے حلقہ درس میں شریک ہونے والا ہر شخص آپؑ کے اخلاق حسنہ کا گرویدہ ہوجاتا۔ اور آپؑ کے اخلاق تو وہ تھے کہ دشمن بھی اُس کا قائل نظر آتا۔ چنانچہ ایک شخص اہل شام میں سے مدینہ میں قیام پذیر تھا اور اکثر امام محمد باقرؑ کے پاس آکر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ مجھے اس گھرانے سے ہرگز کوئی خلوص ومحبت نہیں مگر آپؑ کے اخلاق کی کشش اور کلام میں وہ فصاحت ہے کہ جس کی وجہ سے میں آپؑ کے پاس آنے اور بیٹھنے پر مجبور ہوجاتا ہوں۔

محمد بن منکدر جو ایک صوفی مسلک سے تعلق رکھنے والا شخص تھا' اس نے ایک مرتبہ امام محمد باقر علیہ السلام کو ضعیفی کے عالم میں دو اشخاص کا سہارا لیے ہوئے کسب معاش کے لیے جاتے دیکھا تو طنزیہ لہجے میں کہا کہ: بنوہاشم کے سردار بھی کسب دنیا کے لیے مرے جارہے ہیں آپؑ نے جواب دیا کہ کسب معاش، کسب دنیا نہیں ہے بلکہ اطاعت الٰہی ہے اور میں اس وقت اسی حالت میں مر بھی جاؤں تو یہ موت اطاعت الٰہی میں ہوگی۔

امام محمد باقر علیہ السلام علم، زہد، تقوی، طہارت، صفائے قلب اور دیگر محاسن میں اس درجہ پر فائز تھے کہ ان محاسن کو آپ کی ذات گرامی سے امتیاز حاصل ہوا۔

احوال وواقعات

تین برس تک امام محمد باقر علیہ السلام اپنے جد بزرگوار حضرت امام حسین علیہ السلام کے زیر سایہ رہے۔ جب آپؑ کا سن مبارک پورے تین برس کا ہوا تو امام حسینؑ نے بمع اہل وعیال مدینہ سے سفر کا آغاز کیا اور اس کم سنی میں امام محمد باقرؑ بھی راستے کی تکلیفیں سہنے میں اپنے بزرگوں کے ساتھ شریک رہے۔ امامؑ نے کربلا کے میدان میں اپنے عزیز واقارب کو بے دردی سے شہید ہوتے دیکھا اور اس کے بعد اپنے بابا امام زین العابدین علیہ السلام کے ہمراہ کوفہ وشام میں اپنے خاندان

کی برگزیدہ خواتین کو بے مقنعہ و چادر دشمن کی قید میں دیکھا۔مگران تمام صدموں کو رضا الٰہی کی خاطر اپنے بابا کی طرح صبر وتحمل سے برداشت کیا۔

واقعہ کربلا کے بعد ۶۱ھ سے ۹۵ھ تک ۳۴ برس اپنے مقدس باپ علیہ السلام کی سیرت وزندگی کا مطالعہ کرتے رہے اوراپنے فطری اور خداداد ذاتی کمالات کے ساتھ ان تعلیمات سے فائدہ اٹھاتے رہے جو انہیں اپنے والد بزرگوار علیہ السلام کی زندگی کے آئینہ میں برابر نظر آتی رہیں۔

جب آپؑ کے والد بزرگوار کی شہادت ہوئی تو آپؑ کی عمر مبارک ۳۸ سال تھی اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب بنی امیہ کی سلطنت اپنی مادی طاقت کے لحاظ سے بڑھاپے کی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ بنی ہاشم پر ظلم وستم اور خصوصا کربلا کے واقعہ نے بہت حد تک دنیا کی آنکھوں کو کھول دیا تھا۔جس کے نتیجے میں کئی تحریکوں نے جنم لیا جس سے سلطنت شام کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔لہٰذا امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانہ امامت کو حکومت وقت سے ظلم وتشدد کی گرفت سے کچھ آزادی نصیب ہوئی اور آپؑ کو خلق خدا کی اصلاح وہدایت کا کچھ زیادہ موقع میسر آیا۔

سلطنت اسلامیہ حقیقت میں اہل بیت رسول علیہم الصلوۃ السلام کا حق تھی،مگر دنیا والوں نے مادی اقتدار کے آگے سر جھکا لیا تھا اوران حضراتؑ کو گوشہ نشینی اختیار کرنا پڑی تھی۔مگر تحفظ دین اور بقاء اسلام کی خاطر اپنے فریضہ امامت کو پورا کرنے میں کبھی کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کیا۔جس طرح امیر المومنین علی علیہ السلام نے سخت موقعوں پر حکومت وقت کو مشورہ دینے سے گریز نہیں کیا اسی طرح سلسلہ امامت کے تمام حضراتؑ نے اپنے اپنے زمانہ کے بادشاہوں کے ساتھ یہی طرز عمل اختیار کیا۔

چنانچہ ۷۵ھ میں امام محمد باقر علیہ السلام نے وہ تاریخی کارنامہ انجام دیا جو اسلامی تاریخ سے محو نہیں کیا جاسکتا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ ۷۵ھ تک مسلم ممالک میں بھی رومی سکے رائج تھے اور عیسائی ان سکوں کے ذریعہ اپنے عقائد کی ترویج کر رہے تھے چنانچہ عبدالملک نے اپنے دور حکومت میں ان سکوں کو ترک کر کے ان پر کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' لکھنے کا حکم دے دیا۔ جب اس کی اطلاع قیصر روم کو ملی تو اس کو شدید غصہ آیا اور دھمکی دی کہ اگر یہ سلسلہ نہ روکا گیا تو وہ اپنے سکوں پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کے خلاف کچھ الفاظ درج کرادے گا۔ یہ سن کر عبدالملک کے ہوش وحواس اڑ گئے۔اس نے اپنے مشیروں سے مشاورت کے بعد امام محمد باقر علیہ السلام کو طلب کیا اور آپؑ سے اس مسئلے کا حل پیش کرنے کی استدعا کی۔

آپؑ نے فرمایا مسلمانوں کو خود اپنا سکہ ڈالنا چاہیے۔جس کے ایک طرف ''لا الہ الا اللہ'' اور دوسری طرف ''محمد رسول اللہ'' نقش ہو۔ پھر اس سکے کو فوراً اسلامی ممالک میں رائج کر کے رومی سکے کو لغو قرار دیا جائے۔عبدالملک نے آپؑ کی اس تجویز کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور اس پر عملدرآمد شروع کر دیا۔قیصر روم کو جب یہ خبر پہنچی تو دنگ رہ گیا اور اسے

اندازہ ہو گیا کہ خانوادہ رسالت کے علاوہ کوئی اس جیسی سیاست کا وارث نہیں ہو سکتا ہے۔

باوجود یکہ امام محمد باقر علیہ السلام ملکی معاملات میں کوئی دخل نہ دیتے تھے اور اگر کبھی دخل دیا بھی تو سلطنت کی خواہش پر اسلامی وقار کو برقرار رکھنے کے لیے ایسا کیا مگر آپؑ کی خاموش زندگی اور خالص علمی اور روحانی مرجعیت بھی سلطنت وقت کو گوارا نہ تھی۔

چنانچہ ہشام بن عبدالملک نے مدینہ کے حاکم کو خط لکھا کہ امام محمد باقر علیہ السلام کو ان کے فرزند امام جعفر صادق علیہ السلام کے ہمراہ دمشق بھیج دیا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے امام علیہ السلام کی شخصیت کو لوگوں کی نظروں میں گرا دیں۔ چنانچہ دمشق پہنچنے کے بعد تین دن تک ہشام نے آپؑ سے ملاقات نہ کی اور چوتھے دن دربار میں بلا بھیجا۔ جب امام باقر علیہ السلام دربار پہنچے تو اس وقت ہشام تخت شاہی پر بیٹھا ہوا تھا اور رؤسا سلطنت اس کے سامنے شرط باندھ کر تیر اندازی کا مقابلہ کر رہے تھے۔ امامؑ کے پہنچنے پر ہشام نے جرات اور جسارت کے ساتھ خواہش کی کہ آپؑ بھی تیر کا نشانہ لگائیں امام باقر علیہ السلام نے معذرت فرمائی مگر اس نے قبول نہ کیا وہ سمجھتا تھا کہ اتنا عرصہ گوشہ نشینی کی وجہ سے آل محمدؐ جنگ کے فنون سے بے بہرہ ہو چکے ہوں گے۔ لہٰذا لوگوں کو ہنسنے اور تفریح کا موقع ملے گا۔

جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو آپؑ نے تیر و کمان ہاتھ میں لیا اور چند تیر پے در پے ایک ہی نشانے پر بالکل ایک ہی نقطہ پر لگائے تو مجمع تعجب اور حیرت میں غرق ہو گیا اور ہر طرف سے تعریفیں ہونے لگیں۔ ہشام کو اپنے طرز عمل پر پشیمان ہونا پڑا۔ اس کے بعد اس کو یہ احساس ہوا کہ دمشق میں امام باقر علیہ السلام کی موجودگی کہیں عوام کے دل میں اہل ابیتؑ کی عظمت قائم کرنے کا سبب نہ ہو۔ اس لیے اس نے آپؑ کو واپس مدینہ جانے کی اجازت دے دی مگر اس کے دل میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے ساتھ عداوت میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔

جوں جوں سلطنت شام کو امام محمد باقر علیہ السلام کی صلاحیت اور بزرگی کا اندازہ زیادہ ہوتا چلا گیا اتنا ہی آپؑ کا وجود ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتا گیا۔ آخر کار آپؑ کو اس خاموش زہر کے حربے سے جو اکثر سلطنت بنو امیہ کی طرف سے کام میں لایا جاتا رہا تھا، شہید کرنے کی تدبیر کی گئی۔ وہ ایک بظاہر زین کا تحفہ تھا جس میں خاص تدابیر سے زہر سے پوشیدہ کیا گیا تھا اور جب امام محمد باقر علیہ السلام اس زین پر سوار ہوئے تو زہر ان کے جسم اطہر میں سرایت کر گیا۔ اس کے چند روز بعد آپؑ ذی الحجہ ۱۱۴ھ کو ۵۷ سال کی عمر میں شہید ہو گئے۔

(اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ)

سبق 12

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

مختصر تعارف:

اسم مبارک:	جعفر
مشہور القاب:	صادق، صابر، فاضل، طاہر
تاریخ ولادت:	۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ
تاریخ شہادت:	۱۵ شوال ۱۴۸ھ
مقام ولادت:	مدینہ منورہ
مدفن:	جنت البقیع (مدینہ منورہ)
والد بزرگوار:	حضرت امام محمد باقر علیہ السلام
عمر مبارک:	۶۵ سال
والدہ ماجدہ:	جناب ام فروہ بنت قاسم
مدت امامت:	۳۴ سال
کنیت:	ابو عبداللہ
اولاد:	دس اولادیں (۷ بیٹے، ۳ بیٹیاں)

بادشاہان وقت: عبد الملک بن مروان، ولید بن عبد الملک سلیمان عمر بن عبد العزیز یزید بن عبد الملک، ہشام بن عبد الملک ولید بن یزید بن عبد الملک یزید الناقص ابراہیم بن ولید مروان العمار ابو العباس سفاح منصور دوانیقی

اخلاق واوصاف

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی شخصیت عالم اسلام میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپؑ کی شخصیت علم، حلم، زہد وتقوی، جود وسخائی، مہمان نوازی، غرباء ومساکین کی مخفیانہ خبر گیری صلہ رحمی اور عفو ودرگزر جیسی اعلیٰ صفات کا مجسم نمونہ تھی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے جود وسخا کے متعلق ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ: ایک مرتبہ ایک حاجی مدینہ میں

داخل ہوا اور مسجد نبوی میں سو گیا آنکھ کھلی تو اسے شبہ ہوا کہ اس کی ایک ہزار دینار کی تھیلی موجود نہیں ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا لیکن مسجد میں کسی کو نہ پایا۔ اس وقت مسجد کے ایک گوشہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام نماز میں مشغول تھے۔ وہ آپؑ کو بالکل نہیں پہچانتا تھا۔ امامؑ کے پاس آ کر پوچھنے لگا میری رقم کی تھیلی آپؑ نے اٹھائی ہے؟ امامؑ نے پوچھا اس میں کیا تھا؟ کہنے لگا ایک ہزار دینار حضرتؑ نے فرمایا میرے ساتھ میرے مکان تک آ ؤ۔ آپؑ اس کو لے کر گھر میں آئے اور اسے ایک ہزار دینار عطا کیے۔ وہ مسجد میں واپس آ گیا اور اپنا سامان اٹھانے لگا کہ اچانک سامان میں اس کی نظر اپنی رقم کی تھیلی پر پڑی یہ دیکھ کر وہ بہت شرمندہ ہوا اور دوڑتا ہوا امامؑ کی خدمت میں آیا اور معذرت کرتے ہوئے وہ دینار واپس کرنے چاہے مگر امامؑ نے فرمایا ہم جو کچھ دے دیتے ہیں وہ واپس نہیں لیتے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا شیوہ تھا کہ آپؑ مالداروں سے زیادہ غریبوں کی عزت کیا کرتے تھے، مزدوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور خود بھی تجارت فرماتے تھے آپؑ اکثر باغات میں اپنے ہاتھوں سے کام کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ ہاتھ میں بیلچہ لے کر باغ میں کام کر رہے تھے اور آپؑ کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ کسی نے کہا: حضور! یہ بیلچہ مجھے عنایت فرمایئے تا کہ میں یہ خدمت انجام دوں۔

آپؑ نے فرمایا: طلب معاش میں دھوپ اور گرمی کی تکالیف سہنا عیب کی بات نہیں ہے۔

غلاموں اور کنیزوں پر شفقت و مہربانی آپ کی امتیازی خصوصیت تھی۔ ایک مرتبہ جب آپؑ کی کنیز مہمانوں کو کھانا پیش کر رہی تھی۔ تو اتفاقاً سالن کا بڑا پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا جس کی وجہ سے امامؑ اور آپؑ کے مہمانوں کے کپڑے خراب ہو گئے کنیز آپؑ کے غصے کے خوف سے کانپنے لگی مگر امامؑ نے غصہ کی بجائے اس کو راہ خدا میں یہ کہہ کر آزاد کر دیا کہ تو میرے خوف اور رعب سے کانپتی ہے شاید تجھے آزاد کرنا ہی میرا کفارہ ہو جائے۔

احوال و واقعات

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی کے حالات کو بیان کرتے ہوئے ہم درج ذیل اہم امور پر نظر ڈالتے ہیں۔

علمی فیوضات اور برکات

یوں تو تمام آئمہ اہل بیتؑ علمی فیض و برکات سے بھرپور تھے اور علم اولین و آخرین کے مالک تھے لیکن دنیا والوں نے ان سے فائدہ اٹھانے کی بجائے انہیں قید و بند میں رکھ کر علوم و فنون کے خزانوں پر تالے لگا دیے، اس لیے ان حضرات کے علمی کمالات کما حقہ منظر عام پر نہ آسکے ورنہ آج دنیا کسی علم میں خاندان رسالت کے علاوہ کسی کی محتاج نہ ہوتی۔

امام جعفر صادقؑ کا دور باقی ائمہ معصومینؑ کی نسبت ایک زرین عہد تھا وہ رکاوٹیں جو آپ سے پہلے یا بعد والے ائمہ اہل بیت کو پیش آئیں وہ کسی حد تک کم تھیں۔ بنوامیہ اور بنوعباس کی اقتدار کی خاطر باہمی چپقلش کی وجہ سے آپؑ کو اس قدر موقع میسر ہوا کہ آپؑ علوم محمد وآل محمدؑ کی اشاعت اور مذہب اہل بیت کی ترویج میں امن وسکون سے مشغول رہے اور لوگوں کو بھی آپؑ کی طرف علمی مسائل میں رجوع کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپؑ کی خدمت میں حجاز کے علاوہ دور دراز مقامات مثلاً، عراق، شام، خراسان، کابل، ہندوستان اور بلاد روم کے طلبا اور تشنگان علم حاضر ہو کر مستفید ہوتے تھے۔ امام جعفر صادقؑ کے حلقہ درس میں چار ہزار اصحاب تھے، شیخ مفید اپنی کتاب ''الارشاد'' میں فرماتے ہیں:

لوگوں نے آپؑ کے علوم کو نقل کیا جنہیں تیز سوار دور دراز کے علاقوں تک لے گئے علماء اہل بیتؑ میں کسی سے بھی اتنے علوم وفنون کو نقل نہیں کیا جس قدر امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیے ہیں۔ ان علماء کی تعداد چار ہزار ہے آپؑ کے شاگردوں میں سے ایک رومی النسل بزرگ زرارہ بن امین (متوفی ۱۵۰ھ) قابل ذکر ہیں۔ جن کے دادا اسنسن بلاد روم کے ایک مقدس راہب تھے زرارہ اپنی علمی خدمات کے اعتبار سے اسلامی دنیا میں کافی شہرت کے حامل ہیں۔ اور آپؑ نے کئی ایک تصانیف بھی مرتب کی ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے جن علوم میں اپنے شاگرد پیدا کیے ان میں علوم قرآن علم فقہ، منطق، فلسفہ، علم کیمیا علم طلب، علم نجوم، علم الاجسام اور دیگر بے شمار علوم بھی شامل ہیں۔ حضرت امام صادقؑ نے ان علوم میں فلک شگاف شاگرد پیدا کیے کہ جن کے نام کتب سیر وتواریخ میں موجود ہیں۔ مورخین نے امام ابوحنیفہ، امام مالک ابن انس، بن سعید انصاری، ابن جریج، امام سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ وغیرہ کو امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگردوں میں ذکر فرمایا ہے۔ امامؑ کے نامور اصحاب اور شاگروں میں امام الکیمیا جابر بن حیان، زرارہ بن امین، ابان بن تغلب، اسحاق بن عمار حمران بن اعین، صفوان بن مہران وغیرہ جیسی شخصیات بھی شامل ہیں۔

غلو کے خلاف جدوجہد

امام جعفر صادق علیہ السلام نے علمی قیام کے ذریعے اپنے دور میں اٹھنے والی غلو کی تحریک کا بھی سد باب کیا۔ غالی لوگ ائمہ طاہرینؑ کی طرف غلط روایات منسوب کرتے تھے اور ان کے مقام کو اللہ تعالیٰ سے بھی بڑھا کر پیش کرتے تھے۔ یہ سادہ لوح لوگوں کو غلط عقائد کی طرف راغب کررہے تھے۔

غلو کی یہ تحریک نہ صرف اندرونی طور پر شیعوں کے عقائد میں انتشار کا باعث تھی اور انہیں اسلامی معاشرے سے کاٹ رہی تھی بلکہ شیعوں کو دوسروں کی نظر میں فروع دین پر عمل کے حوالے سے غیر سنجیدہ اور بے عمل لوگ ظاہر کررہی

تھی۔ چنانچہ امامؑ اپنے حقیقی شیعوں کو ان منحرف غالیوں سے دور رہنے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق آپؑ نے غالیوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے صحابی مفضل بن عمر سے فرمایا:

اے مفضل! ان (غالیوں) کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھو، نہ ان کے ساتھ کچھ کھاؤ پیو، اور نہ ان کے ساتھ مصافحہ کرو۔

امامؑ خاص طور پر شیعہ نوجوانوں کے بارے میں زیادہ حساس تھے۔ اور فرماتے تھے کہ اپنے نوجوانوں کے بارے میں غالیوں سے ہوشیار رہو کہ کہیں وہ انہیں خراب نہ کردیں۔ غالی خدا کی بدترین مخلوق ہیں، یہ خدا کی عظمت کو کم کرتے ہیں اور بندگان خدا کی ربوبیت کا دعوی کرتے ہیں''۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے شیعہ معاشرے سے غالیوں کو دور کرنے کی غرض سے ان کے عقائد کو سختی سے مسترد کردیا اور آئمہ اہل بیتؑ کی طرف منسوب احادیث و روایات کو پرکھنے کے لیے ''کتاب اللہ'' کو میزان اور پیمانہ قرار دیا۔

سیاسی جدوجہد

ان حالات میں کہ جہاں آپؑ کی پالیسی میں اولین مقام علمی امور کی انجام دہی اور اصحاب کی تربیت کو حاصل تھی وہاں دوسری طرف آپؑ کی حکومت وقت کے خلاف سیاسی جدوجہد اس وقت کی حکومت سے آپؑ کی ناراضگی، اسے غیر قانونی قرار دینے اور اسلام و مسلمین کے لیے خاندان رسالت کی امامت و قیادت کے دعوی کی حد تک محدود تھی۔ کیونکہ امامؑ کے خیال میں ضروری مقدمات فراہم کیے بغیر (جن میں اہم ترین علمی اور فکری کام تھا) حکمرانوں کے خلاف مسلح تحریک چلانے سے ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اس مقصد کے لیے امامت پر پختہ عقیدہ رکھنے والی ایک وسیع تحریک کی ضرورت تھی اور قیام کے لیے امام جعفر صادق علیہ السلام کو مطلوبہ افراد کی تعداد میسر نہ تھی۔ دوسری طرف جب بنو عباس اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ بنو امیہ کو ختم کردیں اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ آل رسولؐ کی دعوت کا حوالہ دیے بغیر لوگوں کو اپنا حامی بنانا مشکل ہے تو انہوں نے آل محمد کی امداد اور انتقام کربلا کا نعرہ لگا کر بنی امیہ کے خلاف تحریک میں روح پھونک دی۔

اسی وجہ سے اکثر شیعیان بنی فاطمہ کو بھی ان سے ہمدردی پیدا ہوئی اور وہ ان کے معاون اور ہمرکاب ہو گئے۔ بنو عباس نے ابوسلمہ جعفر بن سلیمان کوفی کو آل محمدؐ کی طرف سے وزیر بنا دیا جو کہ آل رسولؐ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا تھا لیکن اسے امام جعفر صادقؑ کی طرف سے کوئی حمایت اور اجازت نہ تھی۔

جب حالات زیادہ سازگار نظر آنے لگے تو انہوں نے امام جعفر صادقؑ اور ابومحمد عبداللہ بن حسن کو الگ الگ خط لکھا کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں، مدینہ میں جب قاصد خط لے کر امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت

میں پہنچا تو رات کا وقت تھا، قاصد نے عرض کی مولا میں ابوسلمہ کا خط لایا ہوں آپؑ اسے ملاحظہ فرما کر جواب عنایت فرمائیں۔ یہ سن کر امامؑ نے چراغ منگوایا اور خط لے کر اسی وقت پڑھے بغیر نذر آتش کر دیا کیوں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام بنوعباس کی نیتوں سے اچھی طرح واقف تھے وہ فقط اہل بیتؑ کا نام استعمال کر کے حکومت حاصل کرنا چاہتے تھے اور ان کی روش غیر اسلامی اور ظلم پر مبنی تھی۔

لہٰذا امام نے ان کی کسی بھی طرح سے حمایت نہیں فرمائی اس کے بعد آپ نے قاصد سے فرمایا کہ ابوسلمہ سے کہنا تمہارے خط کا یہی جواب ہے۔ ابھی وہ قاصد واپس پہنچا ہی نہ تھا کہ تین ربیع الاول ۱۲۳ھ جمعہ کے دن حکومت کا فیصلہ ہو گیا اور حکومت عباسیوں کے ہاتھوں میں آ چکی تھی ابوالعباس سفاح خلیفہ بنایا جا چکا تھا۔

امام جعفر صادقؑ کی زندگی کا آخری حصہ منصور کے دور حکومت میں بسر ہوا منصور عباسی نے کہ جسے آئمہ اہل بیتؑ سے اور علویوں سے شدید عداوت تھی امام کو سخت نگرانی میں رکھا ہوا تھا اور امامؑ کی آزادانہ زندگی کا دائرہ تنگ کیا جا چکا تھا۔

منصور ایک ظالم، سفاک اور بے گناہ افراد کا قاتل تھا، بنو ہاشم اور علویوں سے شدید بغض وعناد رکھتا تھا اور بالخصوص امام حسن مجتبیٰؑ کی اولاد کا وجود منصور کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ اس نے حسنی سادات کا بے دریغ قتل کیا اور بعض کو تو دیواروں میں بھی زندہ چنوا دیا، انہیں قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار کیا۔

ایسے ظالم اور جلاد بادشاہ کی نگاہ میں جب سادات حسنی کے عام افراد کی زندگی ناقابل برداشت تھی تو امام جعفر صادقؑ تو بہر حال امام اور مجسمہ کمالات تھے اور ان کی شخصیت لوگوں کی نگاہ میں بے حد معزز اور محترم تھی ان کا وجود منصور کی نگاہ میں کس طرح قابل برداشت ہو سکتا تھا۔

اسی لیے وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا جس سے فائدہ اٹھا کر امامؑ کو شہید کر دے اس سلسلے میں منصور نے کئی بار امام جعفر صادق علیہ السلام کے قتل کا ارادہ بھی کیا مگر وہ اپنے ارادے میں ناکام ہوا۔

بالآخر منصور عباسی سے امام علیہ السلام کا وجود مبارک مزید برداشت نہ ہوا اور اس نے آپؑ کو زہر دلوا کر آپؑ کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

(اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ)

سبق13

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

مختصر تعارف:

اسم مبارک: موسیٰ

مشہور القاب: کاظم، عبدالصالح، باب الحوائج

تاریخ ولادت: ۷ صفر ۱۲۸ھ

تاریخ شہادت: ۲۵ رجب ۱۸۳ھ

مقام ولادت: ابواء (مکہ ومدینہ کے درمیان ایک مقام)

مدفن: کاظمین (عراق)

والد بزرگوار: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

عمر مبارک: ۵۵ سال

والدہ ماجدہ: حضرت حمیدہ خاتون

مدت امامت: ۳۵ سال

کنیت: ابوالحسن الاول

اولاد: ۳۷ اولادیں (۱۸ فرزند، ۱۹ بیٹیاں)

بادشاہان وقت: مروان الحمار ابوالعباس سفاح منصور دوانیقی مہدی عباسی ہادی، ہارون رشید

اخلاق واوصاف

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بہت نیک، زاہد و متقی اور عبادت گزار شخصیت کے مالک تھے۔ اس دور میں آپؑ کے تقویٰ کا چرچا تھا۔ آپؑ رات بھر عبادت خدا میں مشغول رہتے تھے اور خوف خدا کی وجہ بہت زیادہ گریہ فرماتے تھے یہاں تک کہ آپؑ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہوجاتی تھی۔

آپؑ بہت زیادہ صلہ رحمی کرنیوالے تھے۔ آپؑ کی سخاوت بے مثال تھی۔ مدینہ کے فقیروں کی بہت زیادہ مدد فرماتے تھے۔ آپؑ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور فقیہ بھی تھے۔ آپؑ اس طرح حزن وملال کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے تھے کہ جو شخص بھی آپؑ کی تلاوت سنتا تو گریہ کرنے لگ جاتا تھا۔ آپؑ بچپن ہی سے علوم اور کمالات کا سرچشمہ تھے۔

آپؑ کے بچپن کے حالات میں ایک واقعہ ملتا ہے کہ آپؑ کو صفوان جمال نے گھر سے اس حالت میں نکلتے دیکھا کہ آپؑ کے پاس ایک بکری کا بچہ تھا۔ آپؑ اس بکری کے بچے سے سجدہ خدا کرنے کا تقاضا کر رہے تھے صفوان نے جب یہ دیکھا تو حیرانگی کی حالت میں امامؑ سے سوال کیا کہ اگر آپؑ اس جانور سے سجدہ خدا کا تقاضا کر سکتے ہیں تو اس کو مرنے کا بھی حکم دے سکتے ہیں؟ آپؑ نے فرمایا:

موت وحیات خدا کے اختیار میں ہے ہم اس کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔

گویا آپؑ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ انسان کو اپنے فرائض کی فکر کرنی چاہیے اور امور خداوندی میں دخل اندازی بندے کی بندگی کے خلاف ہے۔ اس طرح انسان خدا کے کاموں میں دخل اندازی کر کے عذاب خدا کا مستحق بھی قرار پا سکتا ہے۔ لہٰذا امام نے یہ واضح کر دیا اگر ہم اہل بیتؑ کے ساتھ کسی جانور کا بچہ بھی ہو تو ہم اس سے خالق کائنات کے سامنے جھکنے کا تقاضا کرتے ہیں جو شخص ہمارے ساتھ منسوب ہو جائے اس سے بھی ہم عبادت خدا کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔

احوال وواقعات

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی کچھ زندگی منصور بادشاہ کی حکومت کے دور میں گزری۔ اس نے امامؑ کو ظاہری طور پر کوئی تکلیف نہیں پہنچائی اس کے بعد دس سال تک امامؑ موسیٰ کاظم بادشاہ مہدی کے دور حکومت میں زندگی گزارتے رہے۔ اس نے امامؑ کو عراق بلوایا اور قید میں رکھا دوران قید آپؑ کے معجزات اور عبادت سے متاثر ہو کر اس نے قید کے علاوہ کوئی اور تکلیف دینے کی جرأت نہ کی اور امامؑ کو مدینہ بھیج دیا۔

اس بادشاہ کا دور حکومت ختم ہونے کے بعد تیسرے بادشاہ ہادی کا دور حکومت آیا۔ اس نے ایک سال اور کچھ دن حکومت کی' اس عرصہ میں اس نے امامؑ کو گرفتار کر کے قید کر دیا، جب امامؑ قید میں تھے تو ایک رات خواب میں بادشاہ ہادی نے حضرت علی علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ فرما رہے ہیں:

عن قریب تم والی بنو گے اور زمین پر فساد وقطع رحمی کرو گے۔

جب بیدار ہوا تو حضرت علی علیہ السلام کے فرمان پر غور کرنے کے بعد امام موسیٰؑ کاظم علیہ السلام کو رہا کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اس واقعے کے کچھ عرصہ گزرنے کے بعد دوبارہ اس نے امامؑ کو گرفتار کیا۔ ابھی امامؑ اُس کی قید میں تھے کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اس کے بعد بادشاہ ہارون الرشید کا دور شروع ہو گیا۔

جب اس کو حکومت ملی تو اس نے امام موسیٰؑ کاظمؑ کو بغداد بلایا، ایک طویل مدت تک آپؑ کو اپنی قید میں رکھا اور اپنی حکومت کے چودھویں سال امام موسیٰؑ کاظم علیہ السلام کو زہر سے شہید کروا دیا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ)

بشر حافی کا واقعہ

امام موسیٰؑ کاظم علیہ السلام جب بغداد میں پریشانی کی زندگی گزار رہے تھے تو ایک دن راستے سے گزر رہے تھے کہ ایک گھر کے اندر رقص کی محفل سجی ہوئی تھی، اور گانے کی آواز باہر آ رہی تھی اس وقت گھر کے دروازے سے ایک کنیز کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے باہر آئی، امامؑ نے اس سے پوچھا کہ یہ مکان کسی بندے کا ہے یا آزاد کا؟ اس نے فوراً جواب دیا، کہ آزاد کا۔ آپؑ نے فرمایا کہ بے شک یہ آزاد ہے اگر بندہ ہوتا تو اپنے مالک کی اطاعت کرتا۔ اور یہ کہہ کر آپؑ آگے بڑھ گئے۔

کنیز گھر کے اندر واپس گئی تو صاحب خانہ بشر نے تاخیر کا سبب پوچھا تو اس نے واقعہ بیان کیا، بشر کے دل پر واقعہ کا اس قدر اثر ہوا کہ دوڑ کر امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت اس کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے اس نے امامؑ سے اپنے حرام عمل یعنی گانے اور رقص کرنے کی معافی مانگی تو امامؑ نے فرمایا تو خدا سے معافی طلب کر اور خدا تجھے معاف کر دے گا، اس نے خدا سے معافی طلب کی اور اللہ نے اس کو معاف کر دیا۔

اس واقعے کے بعد وہ گلیوں اور بازاروں میں ننگے پاوں چلتا رہا اس نے کبھی بھی پاؤں میں جوتے نہ پہنے، بشر سے کسی نے پوچھا تو پاوں میں جوتے کیوں نہیں پہنتا تو بشر نے جواب دیا: کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو بساطت اور فرش تعمیر کیا ہے اور بندے کی مجال نہیں ہے کہ مالک کے فرش پر جوتا پہن کر چلے اور وہ کہتا کہ کل میں نے خدا کے حضور امام موسیٰؑ کاظم علیہ السلام کے دربار میں معافی کی درخواست کی، تو اس وقت میرے پاؤں میں جوتے نہیں تھے اسی وجہ سے میں نے بعد میں جوتے پہننا پسند نہیں کیا۔

حضرت فاطمہ معصومہ سلام اللہ علیہا

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی ۳۷ اولادیں تھیں۔ آپؑ کے بیٹوں میں افضل امام علی رضا علیہ السلام تھے، اور بیٹیوں میں جناب سیدہ معظّمہ فاطمہ سلام اللہ علیہا ہیں۔ جناب سیدہ کا مشہور لقب معصومہ ہے۔ ان کا مزار شریف قم المقدس (ایران) میں ہے۔ حضرت معصومہ سلام اللہ علیہا کے دادا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام آپؑ کے بارے میں فضائل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''آگاہ رہو! خدا کا حرم اور رسول خدا کا حرم مدینہ ہے اور امیر المؤمنینؑ کا حرم کوفہ ہے، آگاہ رہو! میرا حرم اور میری اولاد کا حرم میرے بعد قم میں ہوگا۔ بہشت کے آٹھ دروازے ہیں ان میں تین دروازے قم کی طرف ہے، قم میں میری اولاد میں سے ایک خاتون وفات پائے گی اس کا نام فاطمہ دختر موسیٰؑ ہوگا۔ جس کی شفاعت سے میرے تمام شیعہ بہشت میں داخل ہوں گے۔

باب14

حضرت امام علی رضا علیہ السلام

مختصر تعارف:

اسم مبارک:	علی
مشہور القاب:	رضا، صابر، فاضل، رضی، وفی
تاریخ ولادت:	۱۱ ذی القعدہ ۱۴۸ھ
تاریخ شہادت:	۲۳ ذی القعدہ ۲۰۳ھ
مقام ولادت:	مدینہ منورہ
مدفن:	مشہد مقدس (ایران)
والد بزرگوار:	امام موسیٰ کاظم علیہ السلام
عمر مبارک:	۵۵ سال
والدہ ماجدہ:	جناب نجمہ خاتون علیہا السلام
اولاد:	ایک فرزند (امام محمد تقی علیہ السلام)
کنیت:	ابوالحسن
بادشاہان وقت:	منصور دوانیقی، مہدی عباسی، ہادی، ہارون الرشید، امین، مامون

اخلاق واوصاف

امام علی رضا علیہ السلام اپنے دادا امام جعفر صادق علیہ السلام کی شہادت کے ۱۵ روز بعد دنیا میں تشریف لائے۔ آپؑ کے دادا کی آرزو تھی کہ اپنے اس فرزند کو دیکھ لیتے۔ جیسا کہ اپنے فرزند امام موسی کاظم علیہ السلام سے فرمایا تھا:

''عنقریب تمہارے ہاں ایک فرزند پیدا ہونے والا ہے جو 'عالم آل محمدؐ '' ہوگا کاش میں ان کو دیکھتا"۔

امام علی رضا علیہ السلام گذشتہ وآئندہ کے زمانے کے حالات کا اچھی طرح علم رکھتے تھے۔ مامون کے دربار میں جس قدر مناظرے ہوئے سب میں علماء یہود ونصاری، ملحدین اور ہر قسم کے دانشمندوں نے آپؑ کے بے پناہ علم وفضل کا اقرار کیا۔ محمد بن عیسی کا بیان ہے کہ میں نے آپؑ کے تحریری جوابات کو جمع کیا تو ان کی تعداد اٹھارہ ہزار تھی۔

ایک عیسائی عالم جس کا نام جاثلیق تھا ہر مسلمان سے یہ کہتا تھا کہ حضرت عیسی کی شخصیت کا ہر کوئی اقرار کرتا ہے لہٰذا ان کی نبوت پر سب کا اتفاق ہے جبکہ تمہارے رسول محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا ہر کوئی اقرار نہیں کرتا لہٰذا ان کی شخصیت اختلافی ہے۔اس لیے بہتر یہ ہے کہ چونکہ عیسی علیہ السلام کی شخصیت و نبوت پر سب اتفاق کرتے ہیں تو ان کو مان لینا چاہیے اور اختلافی چیز (یعنی نبوت محمدیؐ) کا انکار کر دینا چاہیے۔مسلمان علماء اس کی اس دلیل سے عاجز تھے لہٰذا امام علی رضا علیہ السلام کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ اتفاق اس عیسیؑ پر ہے جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت دینے آئے تھے۔اور اللہ کی بندگی کیا کرتے تھے اگر اس کے علاوہ کوئی عیسی ہے تو ہم مسلمان اس کو تسلیم نہیں کرتے۔

''امام علی رضاؑ کی طرز زندگی کے متعلق شیخ صدوق نے ابراہیم ابن عباس سے روایت کی ہے کہ کبھی امام علی رضا کو تند کلامی کرتے دیکھا گیا ہے اور نہ ہی کسی کی بات کو کاٹتے دیکھا گیا ہے۔ہر شخص کی ضرورت کو پورا کرتے تھے، آپ کسی کی طرف پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے اور نہ ہی محفل میں کسی کے سامنے ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے، غلاموں کے ساتھ بھی سختی سے گفتگو نہ فرماتے، بلند آواز سے قہقہ نہیں لگاتے تھے، دستر خوان پر اپنے ساتھ تمام نوکروں کو بٹھا لیا کرتے تھے راتوں کو کم سوتے تھے اور اکثر راتوں میں شب بیداری فرماتے تھے۔ہر مہینہ میں پہلی اور آخری جمعرات اور درمیانی بدھ (درمیانی عشرے کی پہلی بدھ) کو روزہ رکھتے تھے۔رات کی تاریکی میں صدقات و خیرات عطا فرمایا کرتے تھے۔صدقہ ہمیشہ چھپا کر دیتے تھے۔اندر معمولی کپڑا پہنتے تھے اور باہر کبھی ضرورت کے اعتبار سے اچھا لباس زیب تن کیا کرتے تھے''۔

آپؑ کے خادم یاسر کا بیان ہے کہ ہم لوگ میوہ کھاتے وقت ایک حصہ کھاتے اور ایک حصہ پھینک دیتے تھے تو آپؑ نے تنبیہ فرمائی کہ رزق خدا کو ضائع مت کرو۔جو ضرورت سے زیادہ ہوا سے فقراء و مساکین کو عنایت کر دیا کرو۔اپنے شیعوں کو تنبیہ فرمایا کرتے تھے۔کہ تمہارے تمام اعمال ہر روز شام کے وقت تمہارے امام کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور وہ تمہارے حق میں استغفار کرتے ہیں۔(لہٰذا تم اپنے گناہوں سے ان کا دل مت دکھاؤ اور ایسے بن جاو جیسا کہ ان کے شیعوں کو ہونا چاہیے۔)

احوال وواقعات

یہ آل محمدؐ کی تاریخ حیات کا عجیب وغریب سانحہ ہے کہ ہر امامؑ کو پہلے امامؑ کے مقابلہ میں تقریباً مختلف اور متضاد حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔اور اس کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ حکومت ایک حربہ کو آزمانے میں ناکام ہو جاتی تھی تو وہ حربہ تبدیل کر دیتی تھی اور بعد والے امامؑ کو بالکل نئے قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔مثال کے طور پر معاویہ ابن

ابی سفیان نے مولائے کائنات علیہ السلام سے صفین کے میدان میں انتہائی خونریز قسم کی جنگ کی اور ان کی شہادت کے بعد امام حسن علیہ السلام سے صلح کرنے پر آمادہ ہوگیا اور پھر معاویہ کے بیٹے یزید نے امام حسین علیہ السلام سے بیعت کا مطالبہ کر دیا جس کے نتیجہ میں کربلا کا عظیم سانحہ پیش آیا۔ لیکن امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد طوق و سلاسل میں جکڑے ہوئے قیدی امام سجاد علیہ السلام سے بیعت کا مطالبہ نہیں کیا امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کو قدرے موقع میسر ہوا تو کھل کر مذہب اسلام کی ترویج و اشاعت کا کام سرانجام دیا۔ پھر امام موسی کاظم علیہ السلام کو تقریباً ۱۴ سال قید میں رکھا گیا۔

امام علی رضا علیہ السلام نے ۳۰ یا ۳۵ سال اپنے والد بزرگوار کی امامت میں سیاسی و معاشرتی حالات کا گہرا مشاہدہ فرمایا اور قید و بند میں اپنے والد بزرگوار کی حکمت عملی کا مطالعہ فرماتے رہے کہ ان حالات میں حفاظتِ اسلام اور ترویج علوم آل محمدؐ کے لیے کیا طریقہ کار اپنایا جائے۔ امام موسی کاظم علیہ السلام کے بہیمانہ قتل اور جنازے کی بے حرمتی نے خلیفہ ہارون الرشید کے خلاف ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ اب اس میں مزید ظلم کی طاقت نہیں رہ گئی تھی، دوسری طرف اس نے اندرونی خلفشار اور قبائل کے دباؤ سے مجبور ہو کر سلطنت کو اپنے دو بیٹوں امین اور مامون کے درمیان تقسیم کر دیا اور یوں خود خلیفہ ہارون الرشید لاوارث اور بے بس ہوگیا۔ ان حالات کے پیش نظر امام علی رضا علیہ السلام کی امامت کے ابتدائی ۱۷ سال قدرے سکون سے گزر گئے۔ اور یوں لوگوں کی تربیت اور امامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ لیکن یہ بھی ناقابل تردید حقیقت ہے کہ حکمرانان وقت ہمیشہ امام معصوم کے وجود پرنور کو اپنی حکومتوں کے لیے خطرہ سمجھتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس منصب خلافت پر وہ قابض ہوئے بیٹھے ہیں اس کے حقیقی جانشین آل رسولؐ ہیں۔ لہٰذا کسی بھی قسم کے انقلاب سے بچنے کے لیے امام معصوم پر گہری نظر رکھی جاتی اور انہیں مختلف بہانوں سے قید و بند کی صعوبتوں سے گزارا جاتا تھا۔

دنیاوی اقتدار اور حکومت کے بھوکے ہارون الرشید کے دونوں فرزند امین اور مامون کے درمیان خونریز جنگ ہوئی جس کا نتیجہ امین کی شکست و موت اور مامون کی فتح کی صورت میں سامنے آیا۔ اپنی ہوشیاری اور زیرکی کے باعث مامون خلافت مسلمین کے عہدے پر قابض ہوتے ہی اقتدار کو مضبوط کرنے کے حربے آزمانے لگا۔

مامون اس بات کو اچھی طرح بھانپ چکا تھا کہ امام علی رضا علیہ السلام کی شخصیت لوگوں میں نمایاں ہو چکی ہے، علم اور تقویٰ کی بناء پر لوگ امام علی رضا علیہ السلام کو دل سے اپنا پیشوا اور خلیفہ رسول مانتے ہیں اور یہ چیز مامون کی حکومت کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ جہاں تک ہو سکے ان کے روحانی اور معنوی نفوذ کو کم کیا جائے اور امام علیہ السلام کے شیعوں کے خلاف اس طرح کام کیا جائے کہ جس سے عوام میں غم و غصہ کی لہر نہ دوڑ سکے اس سے بہتر کیا ہوگا کہ آئمہ اہل بیت کی محبوبیت کے عوامل ہی کو ختم کر دیا جائے اور سب سے اہم یہ کہ آل رسول کی علمی ہیبت و سطوت کو منہدم کر دیا

جائے۔اس فکر کی بنیاد پر مامون چارہ سازی میں مشغول ہوگیا اور وہ اپنے زعم میں امام کی علمی عظمت کو ختم کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے علم ودانش کو ترقی دی، علماء ودانشوروں کو جمع کیا انہیں یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا ان علماء کو بہت زیادہ احترامات اور سہولیات سے نوازا خصوصا مجمع عام میں ان کا احترام کیا کرتا تھا۔اس طرح وہ امام علی رضا علیہ السلام کے مقابلے میں ایسے علماء کو جمع کرنے میں کامیاب ہوگیا جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔امام معصوم کی معرفت اوران کی علمی پیمائش سے ناآشنا مامون یہ خیال کرر ہا تھا کہ ان علماء سے مباحثے اور مناظرے کے ذریعے وہ امام علی رضا علیہ السلام کو لاجواب وعاجز کردے گا اور یوں آپ کی علمی عظمت وسطوت گھٹ جائے گی۔

اس غلط فکر کی بنیاد پر اس نے ماہ شوال ۲۰۰ھ میں امام علی رضا علیہ السلام کو مدینہ سے خراساں بلالیا۔مامون نے اپنے ناپاک منصوبوں کو خفیہ رکھنے اور لوگوں کو حقائق سے منحرف کرنے کے لیے امام علی رضا علیہ السلام کو نہ صرف خراسان تشریف لانے بلکہ انہیں خلافت قبول کرنے کی بھی درخواست کی۔تاریخ نے اس واقعہ کو اس طرح لکھا ہے:

مامون: اے فرزند رسولؐ! منصب خلافت کے لیے میں اپنے سے زیادہ شائستہ آپ کو سمجھتا ہوں لہٰذا میں اسے آپ کے سپرد کرکے اس سے علیحدہ ہونا چاہتا ہوں۔

امام علی رضاؑ: اگر یہ منصب خلافت خدا نے تمہیں دیا ہے اور تمہارا حق ہے تو اس سے دست بردار ہونا اور اسے دوسروں کے سپرد کرنا درست نہیں اور اگر یہ تیرا حق نہیں ہے تو غیر کی چیز کو تم کسی دوسرے کے حوالے کیسے کرسکتے ہو؟

مامون: ہر صورت آپؑ کو یہ منصب قبول کرنا ہے۔

امام علی رضاؑ: میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا اور بہ رضا ورغبت تمہاری بات کو قبول نہیں کروں گا۔

مامون: واقعاً آپ مائل نہیں ہیں؟

امام علی رضاؑ: قطعاً مائل نہیں ہوں۔

مامون: میری ولی عہدی قبول کرلیجیے!

امام علی رضاؑ: میں اسے بھی قبول نہیں کرسکتا۔

مامون: خواہ نہ خواہ یہ قبول کرنا ہی پڑے گا، اسے قبول کرنے کے لیے میں آپؑ کو مجبور کردوں گا۔

امام علی رضاؑ: تم مجھے ڈراتے ہو؟

مامون: ہاں یہ میری دھمکی ہے ولی عہدی قبول کرکے آپؑ زندہ رہ سکتے ہیں۔

امام علی رضا علیہ السلام سمجھ چکے تھے کہ مامون اپنے سیاسی مقاصد کے حصول اور اپنے منصب ومقام کو محفوظ رکھنے کے لیے میرے وجود سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔یہ وہی شخص ہے جس نے خلافت حاصل کرنے کے چکر میں اپنے بھائی

امین کو بھی قتل کر دیا ہے لہٰذا کچھ بھی اس شخص سے بعید نہیں خواہ میرا قتل ہی کیوں نہ ہو اب حالات نازک اور خطرناک ہیں لہٰذا مجبوراً قبول کرنا پڑے گا۔ آپؑ نے فرمایا: جب بات جبر اور دھمکی کی حد تک پہنچی ہے تو میں مجبوراً ولی عہدی قبول کرتا ہوں لیکن تمھیں بھی میری کچھ شرائط قبول کرنا ہوگی۔ مامون نے اپنا منصوبہ کامیاب ہوتے دیکھا تو مسکرایا اور اس کا بگڑا ہوا چہرہ کھل اٹھا اور کہنے لگا: اپنی شرائط بیان کریں، قبول کروں گا۔ امام رضاؑ نے فرمایا:

میں ان شرائط کے ساتھ ولیعہدی قبول کرتا ہوں کہ میں سیاسی اور حکومتی امور میں دخل نہیں دوں گا اور نہ میں کسی حاکم کو معزول کروں گا اور نہ ہی کسی کو حاکم مقرر کروں گا میں کسی کام میں مداخلت نہیں کروں گا۔

امام علی رضا علیہ السلام نے بادلِ نخواستہ، مجبوراً ولیعہدی قبول فرمائی۔ اس لیے کہ آپؑ امام معصوم تھے آپ کی عصمت اور فریضہ امامت و ہدایت کبھی بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ آپ ظالموں اور سرکشوں کے ساتھ تعاون کریں۔ آپؑ ایسی حکومت کے خواہاں تھے جس کی بنیاد عدل و انصاف پر استوار ہو۔

اگر آپؑ اس منصب کو قبول کر لیتے اور اس کے سیاسی امور کی انجام دہی کی ذمہ داری بھی قبول کر لیتے اور سرکاری کاموں میں مشغول ہو جاتے تو اس سے ثابت ہو جاتا کہ امام ایسی حکومت کے کارناموں سے خوش ہیں۔ لہٰذا آپ نے حکومت کے امور سے الگ تھلگ رہ کر ولی عہدی کو قبول کر لیا۔ امام کی باریک بین نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ اگر مامون کی پیشکش کو سختی سے رد کر دیا تو آپؑ پر سخت طریقہ سے نظر رکھی جائے گی۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ آپؑ کو شہید کر دیا جائے گا۔ اور اس طرح آپ امامت کے فرائض سرانجام نہیں دے سکیں گے جو اللہ نے آپؑ کے سپرد کیے ہیں۔

اس طرح امام علی رضا نے سیاسی امور میں مداخلت کے بغیر ولیعہدی کو قبول فرما کر ضرورت اور مصلحت کو بہترین طریقے سے جمع کیا اور پھر اپنی علمی حیثیت اور منصب سے استفادہ کرتے ہوئے اسلام کے علمی مکتب کو پہنچوانے اور پھیلانے میں مشغول ہو گئے۔ اس نازک اور خطرناک دور میں امام اس عہد کے بڑے بڑے علماء و دانشمندوں کے علمی مذاکروں اور مناظروں میں جاتے اور اسلام کی علمی منطق اور اس کے شکوہ و جلال کو نمایاں کرتے۔ ان علمی محافل میں شریک تمام دانشور آپؑ کی فضیلت و برتری اور اپنی عاجزی اور کم علمی کا اعتراف کرتے تھے۔ لہٰذا علمی حلقوں میں امامؑ کی شخصیت کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔

مامون امامؑ کی علمی عظمت کو گھٹانے کے کے ناپاک عزائم خاک میں ملتے چلے گئے۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ آخر کیا کیا جائے؟ اس طاقت کو کیسے فنا کیا جائے؟ وہ امامؑ کی شخصیت کو نہ گرا سکا چنانچہ اس نے خود امامؑ کو راستے سے ہٹانے کا ارادہ کیا یہاں اس کی کھوپڑی میں امامؑ کو قتل کر دینے کا خیال پیدا ہوا آخر کار اس نے اپنے ارادے کو پورا کیا اور امام علی رضا علیہ السلام کو زہر دے کر شہید کرا دیا۔ (اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ)

سبق 15

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

مختصر تعارف:

اسم مبارک:	محمد
مشہور القاب:	تقی، قانع، مرتضیٰ، نجیب، جواد
تاریخ ولادت:	۱۰ رجب المرجب ۱۹۵ھ
تاریخ شہادت:	29 ذی القعدہ ۲۲۰ھ
مقام ولادت:	مدینہ منورہ
مدفن:	کاظمین (عراق)
والد بزرگوار:	حضرت امام علی رضا علیہ السلام
عمر مبارک:	۲۵ سال
والدہ ماجدہ:	جناب سبیکہ خاتونؑ
مدت امامت:	۱۷ سال
کنیت:	ابوجعفر
اولاد:	۴ اولادیں (۲ بیٹے، ۲ بیٹیاں)
بادشاہان وقت:	امین، مامون معتصم عباسی

اخلاق واوصاف

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کی عمر مبارک تمام ائمہ اہل بیتؑ سے کم ترین رہی ہے۔آپؑ نے دار دنیا میں صرف ۲۵ سال گزارے لیکن آپؑ کے کمالات وفضائل اور علوم واحکام الٰہی کی نشر واشاعت میں کسی قسم کی کمی یا کوتاہی نظر نہیں آئی۔تقوی اور عبادت الٰہی ضرورتمندوں کی حاجت روائی مساوات اور سادگی، غرباء کی خفیہ امداد مہمان نوازی اور علمی و مذہبی تشنگان کے لیے فیض کے چشموں کا جاری رکھنا آپؑ کی سیرت زندگی کے نمایاں پہلو ہیں۔

ایک مرتبہ کم سنی کے ایام میں امام محمد تقی علیہ السلام راستے میں کھڑے ہوئے بچوں کا کھیل دیکھ رہے تھے کہ اچانک بادشاہ وقت مامون الرشید کی سواری آگئی اور بچے ڈر کر بھاگ نکلے مگر امام جواد علیہ السلام اپنی جگہ پر کھڑے رہے یہاں تک

کہ بادشاہ کی سواری قریب آ گئی۔ بادشاہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا کہ آپؑ نے راستہ کیوں نہیں چھوڑا؟ تو امامؑ نے جواب دیا کہ ''نہ راستہ تنگ تھا اور نہ میں مجرم تھا، پھر بھاگنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ صرف ایک ہی امکان تھا کہ تو ایسا ظالم ہو کہ بلا سبب بھی سزا دیتا ہو اور یہ میں نہیں کہہ سکتا ہوں''۔ بادشاہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ واپسی پر مامون مچھلی کا شکار کر کے اور اسے مٹھی میں چھپا کر امامؑ کا امتحان لینے لگا اور پوچھا اس مٹھی میں کیا ہے؟ آپؑ نے نہایت تفصیل کے ساتھ مچھلی کی اصل تک بیان فرما دی کہ رب العالمین نے آسمان وزمین کے درمیان دریا پیدا کیے ہیں اور ان دریاؤں میں مچھلیاں پیدا کی ہیں اور سلاطین وقت کو شکار کا ذوق دیا ہے اور وہ اپنے بازوں سے ان مچھلیوں کا شکار کر کے خاندان نبوت کا امتحان لیا کرتے ہیں۔ مامون یہ سن کر حیران رہ گیا اور یوں امامؑ کو اپنے فضل و کمال کے ذریعے دربار تک رسائی حاصل ہو گئی۔

احوال وواقعات

حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو زہر دلوا کر شہید کرانے کے بعد علویوں کے ذہنوں میں مامون الرشید کے خلاف شدید نفرت اور غم وغصہ کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ چنانچہ مامون کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ کسی طرح اپنے مظالم کی پردہ پوشی کرے۔ اس سلسلے میں اس نے سب سے بڑا اقدام یہ کیا کہ مدینہ سے حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کو دارالخلافہ بغداد طلب کر لیا تاکہ عوام میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اگر مامون نے امام علی رضا علیہ السلام کو شہید کرایا ہوتا تو ان کے بیٹے کے ساتھ کبھی اس طرح کا برتاؤ نہ کرتا۔

مامون الرشید کو اس بات کا بھی اچھی طرح اندازہ تھا کہ امام محمد تقی علیہ السلام کم سنی کے باوجود اپنے آباء واجداد کی طرح فضل وکمال اور علم وحکمت میں اس بلند مقام پر فائز ہیں جہاں اہل زمانہ کے بڑے بڑے مشائخ اور علماء بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی بیٹی ام الفضل کا عقد امام محمد تقی علیہ السلام سے کر دے گا۔ لیکن عباسیوں نے مامون کے اس فیصلے کی شدید مخالفت کی کہ کل کو علویوں میں سے امام علی رضا علیہ السلام کو ولی عہد بنایا تو کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور آج پھر وہی غلطی کیوں دہرائی جا رہی ہے؟ لوگوں نے دبے الفاظ میں مامون پر اعتراض کیا کہ اگر ایسا ہی ارادہ ہے تو پہلے بچے کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کر لو اور اس کے بعد اپنی بیٹی کا ان سے عقد کر دینا۔

لیکن مامون نے جواب دیا کہ میں تم سے بہتر جانتا ہوں کہ یہ بچہ اس خاندان سے تعلق رکھتا ہے کہ جس میں علم خدا کی طرف سے عطیہ والہام ہوتا ہے۔ یہ بچہ امام علی رضا علیہ السلام کا بیٹا ہے اور یہ تمہارے علماء سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اگر تمہیں یقین نہ ہو تو آزما کر دیکھ لو چنانچہ لوگوں نے موقع غنیمت سمجھا اور یحیی ابن اکثم کو تلاش کرنے لگے، جو اپنے دور کا قاضی القضاۃ اور بہت بڑا عالم دین شمار ہوتا تھا۔ لوگوں نے یحی ابن اکثم سے استدعا کی کہ وہ امامؑ سے ایسا سوال پوچھیں جس کا وہ جواب نہ دے سکیں۔ مقررہ دن آ پہنچا اور لوگ مجمع کی صورت میں دربار میں کھڑے تھے۔ امام محمد تقی علیہ السلام جن

کی عمر اس وقت نو سال اور چند ماہ تھی مامون الرشید کے ساتھ دو تکیوں کے درمیان تشریف فرما تھے اور یحیی بن اکثم آپؑ کے سامنے بیٹھا تھا۔ یحییٰ ابن اکثم نے امامؑ سے سوال کرنے کی اجازت چاہی اور پھر پوچھا:

آپؑ یہ فرمائیے کہ اس شخص کے کفارے کا حکم کیا ہوگا جو حالت احرام میں کسی حیوان کا شکار کرے؟

آپؑ نے فرمایا: تمہارا سوال ہی ناقص ہے پہلے اپنا سوال مکمل کرو۔

یحییٰ نے پوچھا: سوال میں کیا نقص ہے؟

آپؑ نے فرمایا: اس مسئلے کی بے شمار صورتیں بنتی ہیں:

۱۔ شکار حرم کی حدود سے باہر تھا یا حرم کے اندر؟

۲۔ شکار کرنے والا مسئلے سے باخبر تھا یا جاہل؟

۳۔ اس نے جان بوجھ کر شکار کیا یا غلطی سے ہوگیا؟

۴۔ شکار کرنے والا آزاد تھا یا غلام؟

۵۔ شکار کرنے والا بالغ تھا یا نابالغ؟

۶۔ اس نے پہلی مرتبہ شکار کیا تھا یا شکار کھیلنا اس کا مشغلہ تھا؟

۷۔ جس حیوان کا شکار کیا وہ چھوٹا حیوان تھا یا بڑا؟

۸۔ شکار کرنے والا اپنے اس کام پر نادم تھا یا نہیں؟

۹۔ شکار رات کے وقت کیا گیا یا دن میں؟

۱۰۔ شکار کرنے والے کا احرام حج کا تھا یا عمرے کا؟

جب یحیٰ ابن اکثم نے یہ سنا تو مبہوت ہو کر رہ گیا اور شرم سے سر جھکا لیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا چھوٹا سا سوال امام محمد تقی علیہ السلام کی نظروں میں ایک ضخیم کتاب کی صورت اختیار کر لے گا۔ محل میں موجود تمام لوگ انگشت بدندان تھے اور مجمع پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آخر کار مامون نے جلسہ کی خاموشی کو توڑا اور اپنے چچا زاد بھائیوں کو مخاطب کر کے کہا! تم سب نے دیکھ لیا اور پہچان بھی لیا کہ یہ فرزند علی رضا علیہ السلام ہیں۔ یہی جواد الائمہؑ ہیں کہ جنہیں میں نے اپنی دامادی کے لیے منتخب کیا ہے۔ جب جلسہ برخاست ہوگیا اور چند خواص آدمی رہ گئے تو مامون نے امامؑ سے عرض کیا: میں آپؑ پر قربان جاؤں! اگر مناسب خیال کریں تو ان سوالوں کے جوابات بھی عنایت فرما دیں تاکہ دربار میں موجود افراد مستفید ہوسکیں''۔ اور پھر امام محمد تقی علیہ السلام نے ان تمام صورتوں کے جوابات بھی پیش کر دیے۔

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام ام الفضل سے عقد کے بعد بغداد سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ آپؑ کے ہمراہ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ آپؑ راستے میں واقع ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے رکے اس مسجد کے صحن میں بیری کا ایک

درخت تھا۔ جس میں ابھی تک پھل نہیں لگا تھا۔ آپؑ نے پانی کا کوزہ منگوایا اور اس بیری کے درخت کے نیچے وضو کیا اس کے بعد آپؑ نے لوگوں کو نماز مغرب پڑھائی۔ نماز کے بعد جب لوگ اس بیری کے درخت کے پاس پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ اس پر بہترین پھل آچکا ہے انہیں بہت تعجب ہوا اس کے بیر کھائے تو بہت میٹھے تھے اور ان میں گٹھلی بھی نہیں تھی۔ پھر لوگ آپؑ سے الوداع ہوئے اور آپ مدینہ کی طرف تشریف لے گئے۔

مدینہ پہنچ کر ام الفضل کو غربت، پریشانی، دکھ، سادگی جیسے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ام الفضل خلیفہ مامون الرشید کی بیٹی تھی۔ اور اس نے عیش و عشرت اور دنیاوی مال و اسباب سے بھرپور گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ام الفضل معنویت اور روحانیت سے کوسوں دور تھی۔ اس کو امام محمد تقی علیہ السلام کی سادہ، مقدس، غریب پرور نیز عیش و نشاط سے دور زندگی پسند نہ آئی اور یوں بالآخر امامؑ کے قتل میں بھی ملوث ہوئی۔

عام طور پر ہر امامؑ کی شہادت کے بعد پیش آنے والی مشکلات کی وجہ سے ایک مدت تک شیعوں کا بعد میں آنے والے امامؑ سے رابطہ انتہائی محدود ہو جاتا تھا۔ اور یہی صورتحال امام محمد تقی علیہ السلام کو بھی اپنے والد بزرگوار علیہ السلام کی شہادت کے بعد پیش آئی۔

امام محمد تقی علیہ السلام کی امامت کے آغاز میں ان کی کم سنی کے مسئلہ نے بھی ایک مشکل پیدا کر دی تھی اور آپؑ کی امامت کے متعلق شیعوں کے شکوک و شبہات برطرف ہونے میں کافی وقت لگ گیا تھا۔ چنانچہ ایک نص میں آیا ہے کہ " امام محمد تقی علیہ السلام نے دس سال تک اپنی امامت کو خفیہ رکھا یہ خود امامؑ اور ان کے شیعوں کے درمیان روابط کی برقراری میں دشواری کی ایک دلیل ہے۔ دوسری طرف حکمران بھی اس حوالے سے سختیاں کیا کرتے تھے اور نتیجے میں شیعہ اپنے امامؑ کے پاس آزادی کے ساتھ آمد و رفت نہیں رکھ پاتے تھے۔ رابطے کا ایک سادہ ترین اور آسان ترین راستہ امامؑ کو خط لکھ کر جواب لینا تھا۔ لہٰذا حضرت امام محمد تقی علیہ السلام اور ان کے بعد حتی کہ ان سے پہلے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے زمانے میں بھی شیعہ خط و کتابت کے ذریعے سے اپنے امامؑ کیساتھ رابطہ رکھتے تھے۔

ان حالات کے باوجود مختلف اسلامی مسائل پر حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کی بے شمار احادیث ہماری دسترس میں پہنچی ہیں اور آپؑ سے منقول اس قدر روایات سے آپؑ کی علمی عظمت اور فقہی، تفسیری اور کلامی مسائل نیز دعا اور مناجات پر آپؑ کے عبور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ آپؑ کے آثار میں سے مختصر اور خوبصورت جملوں (کلمات قصار) سے آپؑ کے اخلاقی کمالات بخوبی آشکار ہیں۔

امام محمد تقی اپنے زمانے میں موجود فرقوں کے حوالے سے بھی اپنے شیعوں کی رہنمائی فرماتے تھے۔ چنانچہ ان ہی فرقوں میں ایک فرقہ خدا کی جسمانیت کا قائل تھا۔ امام نے ان کے بارے میں اپنے شیعوں سے فرمایا کہ انہیں کسی بھی

ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے اور اسے زکوۃ دینے کی اجازت نہیں ہے جو خدا کی جسمانیت کا قائل ہو۔

اسی طرح امام محمد تقی علیہ السلام نے واقفی فرقے سے تعلق رکھنے والے شخص کے پیچھے بھی نماز پڑھنے سے منع فرمایا جن کا عقیدہ یہ تھا کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے بعد امامت کا سلسلہ بند ہوگیا ہے۔ اور اسی طرح کہ کچھ مزید فرقے بھی موجود تھے کہ جن کے احکام سے امامؑ نے اپنے شیعوں کو باخبر رکھا۔

اس دور میں امامؑ کے شیعہ تقریباً تمام اسلامی شہروں میں موجود تھے ان کی بڑی تعداد بغداد، مدائن اور عراق میں رہائش پذیر تھی اور کچھ لوگ ایران اور دوسرے ممالک میں بھی رہتے تھے۔ یہ لوگ امامؑ کے وکلاء کے توسط سے ہی آپؑ سے رابطہ قائم رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ حج بیت اللہ کے موقع پر آپؑ سے ملاقات کیا کرتے تھے۔

امام محمد تقی علیہ السلام کی یہ سرگرمیاں حکومت وقت کی نظر میں بہت بڑا خطرہ تھیں، امامؑ کی بلند و بالا علمی شخصیت اور آپؑ کے کردار کی عظمت نے لوگوں کے دلوں میں آپؑ کی شدید محبت پیدا کر دی تھی۔ دوسری طرف آپؑ کی زوجہ ام الفضل بھی اپنے باپ مامون کو امام سے متعلق شکایت نامے لکھتی رہتی تھی۔

ام الفضل کی امام سے ناراضگی کا ایک سبب آپؑ کا جناب سمانہ خاتون سے عقد تھا جو کہ امام علی نقی علیہ السلام کی والدہ تھیں۔ لیکن مامون اپنے سیاسی معاملات میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ امام محمد تقی علیہ السلام کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا سکا یہاں تک کہ ۲۱۸ھ میں اس کا انتقال ہوگیا اور خلافت اس کے بھائی معتصم کے ہاتھ میں آگئی۔ معتصم نے امامؑ کو ایک سال کے بعد بغداد بلالیا۔ بغداد روانگی سے قبل امام محمد تقی علیہ السلام نے اپنے بیٹے امام علی نقی علیہ السلام کی جانشینی اور امامت کا اعلان کر دیا۔

اسماعیل بن مہران کی روایت ہے کہ جب حضرت امام محمد تقی علیہ السلام پہلی مرتبہ بغداد جا رہے تھے تو میں نے پوچھا کہ خدانخواستہ اگر کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا تو امت کا وارث کون ہوگا؟ تو آپؑ نے مسکرا کر فرمایا کہ مطمئن رہو میں واپس آؤں گا۔ لیکن جب دوسری مرتبہ معتصم کے بلانے پر تشریف لے گئے تو فرمایا کہ اب اس خطرے کا وقت آ گیا ہے۔ اور یہ کہہ کر گریہ کیا اور فرمایا کہ ''میرے بعد میرا وارث میرا فرزند علی ہوگا۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ۲۲۰ھ میں معتصم نے امام محمد تقی علیہ السلام کو زہر دلوا کر شہید کر دیا۔

(اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ)

سبق 16

حضرت امام علی نقی علیہ السلام

مختصر تعارف:

اسم مبارک:	علی
مشہور القاب:	نقی، ناصح، مرتضیٰ، ہادی، نجیب، عالم فقیہ، طیب، امین
تاریخ ولادت:	۵ رجب المرجب ۲۱۴ھ
تاریخ شہادت:	۳ رجب المرجب ۲۵۴ھ
مقام ولادت:	مدینہ منورہ
مدفن:	سامرا (عراق)
والد بزرگوار:	حضرت امام محمد تقی علیہ السلام
عمر مبارک:	۴۰ سال
والدہ ماجدہ:	جناب سمانہ خاتون
مدت امامت:	۳۴ سال
کنیت:	ابوالحسن (الثالث)
اولاد:	۵ اولادیں (ایک بیٹی، ۴ بیٹے)
بادشاہان وقت:	مامون الرشید، معتصم باللہ، واثق بن معتصم، متوکل عباسی، منتصر بن متوکل، مستعین بن متوکل، معتز بن متوکل

اخلاق واوصاف

حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی سیرت زندگی اور اخلاق وکمالات وہی تھے جو اس سلسلہ عصمت کے ہر فرد کے اپنے اپنے دور میں مشاہدہ میں آتے رہتے تھے۔ قید خانہ اور نظر بندی کا عالم ہو یا آزادی کا زمانہ ہر وقت ہر حال میں یاد الٰہی، عبادت خلق خدا سے استغنائی، ثبات قدمی صبر واستقلال، دشمنوں کے ساتھ حلم ومروت محتاجوں اور ضرورت مندوں کی امداد یہی وہ اوصاف ہیں جو امام علی نقی علیہ السلام کی سیرت میں نمایاں ہیں۔

۲۲۰ھ امام محمد تقی علیہ السلام کی شہادت کے بعد ان کے فرزند امام علی نقی علیہ السلام منصب امامت و ولایت پر فائز ہوئے۔اس وقت آپؑ کی عمر مبارک ۶ سال تھی۔انتہائی کم عمری میں والد کا سایہ اٹھ جانے کے باعث بعض افراد نے آپؑ کی تعلیم و تربیت کے لیے عمر بن فرح جنیدی کو آپؑ کا معلم مقرر کر دیا جو اپنے زمانے کا بہت بڑا عالم شمار ہوتا تھا لیکن چند دنوں کے بعد جب جنیدی سے بچے کی تعلیم کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے کہا: لوگوں کا خیال ہے کہ میں اس بچے کو تعلیم دیتا ہوں، خدا کی قسم! میں تو خود اس سے علم حاصل کرتا ہوں اور اس کا علم و فضل مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔

امام علی نقی علیہ السلام زہد و تقویٰ اور معرفت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز تھے امامؑ نے اپنے علم و تقویٰ ہی سے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا، لوگ آپؑ سے بہت زیادہ محبت اور الفت رکھتے تھے۔آپؑ کی اس عظمت کا اعتراف خود دشمن بھی کرتا تھا چنانچہ حرمین کے امام جماعت بریحہ نے متوکل عباسی کو خط لکھا اور اس میں یہ تحریر کیا کہ اگر مکہ و مدینہ پر اپنی حکومت برقرار رکھنا چاہتے ہو تو اس سرزمین سے علی ابن محمد علیہ السلام کو ہٹا دو کیونکہ اہل مکہ اور مدینہ ان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ان کی اطاعت کرتے ہیں''۔چنانچہ اس نے امامؑ کو عراق بلا لیا۔

ایک مرتبہ متوکل عباسی کے دربار میں ایک عورت لائی گئی جس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ زینب بنت علی ہے۔اور رسول خداؐ کی دعا کی بناء پر چالیس سے پچاس سال کے بعد جوان ہو جاتی ہے متوکل نے علماء سے اس کے دعوے کی تردید طلب کی لیکن کوئی جواب نہ دے سکا آخر میں امام علی نقی علیہ السلام کو بلایا گیا تو آپؑ نے فرمایا: اللہ نے اولاد رسولؐ کے گوشت کو درندوں پر حرام کر دیا ہے تو اس عورت کو شیروں کے پنجرے میں ڈال دے، ابھی اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

اہل دربار نے موقع غنیمت جانا اور کہنے لگے اے متوکل! پہلے اس معیار کا تجربہ خود امام علی نقی علیہ السلام سے ہو جائے تو کتنا ہی اچھا ہو متوکل بھی خوش ہو گیا اور امام علی نقی علیہ السلام کو شیر کے پنجرے میں بھیج کر خود بلندی سے اس منظر کو دیکھنے لگ گیا لیکن خونخوار شیر نے امامؑ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور آپؑ دیر تک ان کے سر پر دست شفقت پھیرتے رہے۔یوں ہر طرف امامؑ کے کمال کا چرچا ہو گیا اور زینب بنت علی کا دعویٰ کرنے والی خاتون کا جھوٹ بھی واضح ہو گیا اور ایک روایت کے مطابق اس عورت کو درندوں کے پنجرے میں ڈال کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا۔

ابو ہاشم کی روایت ہے کہ جب امام علی نقی علیہ السلام کی عمر مبارک ابھی بارہ یا تیرہ سال تھی تو آپؑ کا گزر ترک فوج کے قریب سے ہوا۔آپؑ نے ایک ترک سپاہی سے اس کی زبان میں گفتگو شروع کر دی۔وہ حیران ہو کر امامؑ کے قدموں میں گر پڑا۔جب اس سپاہی سے پوچھا گیا کہ تجھے کس چیز نے اس قدر متاثر کیا ہے تو کہنے لگا کہ آپؑ نے مجھے اس نام سے پکارا ہے جس کا علم میرے باپ کے علاوہ کسی کو بھی نہیں ہے اس کا مطلب ہے کہ یہ یقیناً اللہ کے ولی ہیں۔

احوال وواقعات

متوکل عباسی جس نے رجب ۲۰۸ھ ہجری سے ربیع الاول ۲۲۷ھ تک حکومت کی بنوعباس کے بدترین اور ذلیل ترین خلفاء میں سے ایک تھا، اسے بنوعباس کا یزید کہا جاتا ہے، متوکل کی بے ایمانی اور بدکرداری کا یہ عالم تھا کہ اس کے محل میں چار ہزار کنیزیں تھیں اور سب اس کے تصرف میں رہا کرتی تھیں۔ وہ شراب بے تحاشا پیا کرتا تھا، ہزاروں صاحبان ایمان اور سادات کا قاتل تھا اور خاندان اہل بیتؑ سے اسے سخت دشمنی تھی۔

ایک مرتبہ ابن السکیت جیسے صاحب کمال ادیب سے دریافت کیا کہ میرے دونوں فرزند بہتر ہیں یا حسنؑ و حسینؑ؟ ابن السکیت نے واضح الفاظ میں جواب دیا کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ تو کجا تیرے بیٹوں کا مقابلہ ان کے غلام قنبرؓ سے بھی نہیں ہوسکتا۔ متوکل یہ سن کر آگ بگولہ ہوگیا اور ابن اسکیت کی زبان گدی سے کھینچوالی درحالانکہ وہ دربار کے مقرب ترین افراد میں شمار ہوتا تھا، متوکل ہی نے شہداء کربلاؑ کے مزاروں اور قبر امام حسین علیہ السلام پر ہل چلانے اور وہاں کھیتی کرنے کا حکم دیا تھا لیکن وہ اپنے اس ناپاک ارادے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

جب مکہ و مدینہ میں حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی عوام میں بڑھتی ہوئی مقبولیت اور علمی کمالات کے چرچے متوکل عباسی تک پہنچے تو اس نے امامؑ کو مکہ و مدینہ میں اپنی حکومت کے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھا اور آپ کی مکمل نگرانی کا منصوبہ بنایا چنانچہ اس نے امامؑ کو خط لکھا اور آپؑ کو مرکز حکومت سامرا آنے اور وہیں قیام پذیر ہونے کی دعوت دی اس کے بعد اس نے یحیی بن ہرثمہ کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ تین سو سپاہیوں کے ہمراہ کوفہ جاؤ اور وہاں ساز و سامان رکھنے کے بعد صحرا کے راستے مدینہ جا کر علی ابن محمد تقی علیہ السلام کو عزت و احترام کے ساتھ سامرا لے آؤ۔

متوکل نے یہ پروگرام اس احتیاط سے تیار کیا کہ لوگ حساس نہ ہوجائیں اور امامؑ کو مجبور کر کے سفر پر آمادہ کرنا خطرناک نتائج کا سبب نہ بن جائے۔ لیکن مدینہ کے لوگ سمجھ گئے تھے کہ امامؑ کو درحقیقت اس طرح سے گرفتار کیا جارہا ہے۔ چنانچہ عوام انتہائی غضبناک ہوگئی اور شدید مظاہرے شروع ہو گئے یہاں تک کہ یحیی بن ہرثمہ نے لوگوں کے سامنے یہ قسم کھائی کہ مجھے امام علی نقی علیہ السلام کو اذیت و تکلیف دینے کے لیے نہیں بھیجا گیا بلکہ مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ جب امامؑ سامرا کے سفر کے لیے روانہ ہوں۔ تو میں آپؑ کی خدمت میں رہوں''۔

بالآخر حضرت امام علی نقی علیہ السلام کو مجبوراً متوکل کے کمانڈر یکی بن ہرثمہ کے ساتھ سامرا کی طرف روانہ ہونا پڑا۔ جب امام علی نقی علیہ السلام سامرا پہنچے تو آپؑ کو ایک گھر میں رکھا گیا جہاں بظاہر تو نرمی کا برتاؤ ہوتا تھا لیکن حقیقت میں آپؑ کو ایک مستقل روحانی اور ذہنی اذیت میں رکھا گیا تھا۔ کیونکہ آپؑ کی نقل و حرکت پر اور آپؑ سے ملنے والے لوگوں پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔

ایک مرتبہ متوکل کے پاس کسی نے شکایت کی کہ امام علی نقی علیہ السلام کے چاہنے والے ان کے گھر اسلحہ جمع کر رہے ہیں اور عنقریب حکومت کے خلاف قیام کرنے والے ہیں۔ متوکل نے راتوں رات تلاشی کا حکم دے دیا، سپاہی گھر کے اندر داخل ہوئے تو کیا دیکھا کہ آپؑ مصلیٰ پر بیٹھے تلاوت قرآن میں مصروف ہیں۔ آپؑ کو دربار میں لے جایا گیا اور متوکل کو خبر دی گئی کہ ان کے گھر میں کوئی اسلحہ نہیں ہے۔

اس نے حسب عادت امامؑ کی ضیافت بھی جام شراب سے کرنا چاہی تو آپؑ نے فرمایا کہ ''تجھے معلوم ہے کہ شراب آل محمدؐ کے گوشت و پوست میں جذب نہیں ہوئی ہے پھر اس نے آپؑ سے شعر سنانے کا مطالبہ کیا تو آپؑ نے فرمایا کہ میں شعر بہت کم پڑھتا ہوں لیکن اس نے اصرار کیا تو آپؑ نے دنیا کی بے ثباتی اور محل نشینوں کے انجام پر چند اشعار پڑھے۔ حضرت امام علی نقی علیہ السلام کے ان اشعار نے تمام حاضرین بزم کو ہلا کر رکھ دیا یہاں تک کہ خود متوکل کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا اور اس نے امامؑ کو عزت و احترام کے ساتھ گھر پہنچانے کا حکم دیا۔

اس کے بعد بھی کئی مواقع پر امامؑ کے گھر کی تلاشی اور آپؑ کو مسلسل اذیت دینے کا سلسلہ جاری رہا۔ متوکل اس بات پر اصرار کیا کرتا تھا کہ امامؑ اس کی محفلوں میں موجود رہا کریں جس کا مقصد ظاہر یہی تھا کہ وہ مختلف طرح سے آپؑ کی توہین کرے اور آپؑ کو لوگوں کی نظروں میں گرا کر آپؑ کے پیروکاروں کو آپؑ سے دور کر دے۔ مگر امامؑ سامرا میں ایسی بلند اور باعظمت شخصیت کے مالک بن چکے تھے کہ سب لوگ آپؑ کے سامنے انکساری کا مظاہرہ کرتے تھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی آپؑ کے ساتھ عاجزی اور انکساری سے پیش آتے اور آپؑ کا احترام کیا کرتے تھے۔

متوکل عباسی نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں حضرت امام علی نقی علیہ السلام کو شہید کرنے کا پروگرام بھی بنا لیا تھا مگر اپنے اس ناپاک ارادے کو عملی شکل دینے سے پہلے ہی ترکوں کے ہاتھ اس وقت قتل ہو گیا جب وہ رات کے وقت اپنے گھر میں سو رہا تھا۔ متوکل کے بعد اس کا بیٹا مستنصر مسند اقتدار پر بیٹھا اور یہ امام علی نقی علیہ السلام سمیت خاندان علوی پر حکومتی دباؤ میں کمی کا سبب بنا اگرچہ بعض دوسرے شہروں میں شیعوں پر حکام کا ظلم و ستم جاری رہا۔

آئمہ اہل بیتؑ کا آخری دور عباسی خلفاء کی جانب سے پیدا کردہ شدید مشکلات اور گھٹن کا دور تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس دور میں شیعہ تمام اسلامی ممالک میں پھیل چکے تھے اور ان شیعوں کے آئمہ طاہرینؑ سے تعلقات کے لیے ان علاقوں میں وکیل متعین کیے گئے تھے اور وکالت کا یہ سلسلہ امام علی رضا علیہ السلام کے دور سے شروع ہوا تھا۔

یہ وکلا امام اور شیعوں کے درمیان روابط کی برقراری اور ان میں تنظیم کے ذمہ دار تھے۔ وہ خمس کو جمع کر کے امامؑ کی خدمت میں ارسال کرنے کے علاوہ دینی مشکلات کے حل میں اہم کردار کے مالک تھے بہرکیف وکلاء کا نظام شیعوں کے سیاسی اور فکری پوزیشن کے استحکام میں بنیادی کردار ادا کرتا تھا۔ امام علی نقی علیہ السلام کا اپنے شیعوں سے رابطہ انہی

وکلاء کے توسط سے قائم تھا۔

حضرت امام علی نقی علیہ السلام نے اپنے شیعوں میں پیدا ہونے والے بہت سے کلامی مسائل کا حل بھی پیش کیا چنانچہ اس سلسلے میں بے شمار روایات بھی آپؑ سے منقول ہیں اس کے علاوہ آپؑ نے شیعوں کو معارف وعلوم سے آشنا کرنے اور ان کی تربیت کرنے کے لیے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی طرح ادعیہ وزیارات کا سلسلہ اپنایا ان دعاؤں اور زیارات کے ذریعے عوام اور اہل بیتؑ کے درمیان تعلق قائم کرنے، اہل بیتؑ کے عظیم مقام اور ان کی قیادت پر تاکید، ظلم وستم کے خلاف جہاد اور خدا سے راز و نیاز کے اسلوب کے علاوہ بعض سیاسی اور سماجی مسائل کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی۔

اس تمام عرصے میں امام نے لوگوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور اس دوران حکمرانوں کی طرف سے دی جانے والی مختلف اذیتوں کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۲۵۲ھ میں متوکل کا بیٹا معتز مسند اقتدار پر بیٹھا اور اپنے باپ کے مظالم کے سلسلے کو جاری رکھا اور امام علی نقی علیہ السلام پر عرصہ زندگی تنگ کر دیا اور بالآخر ۳ رجب ۲۵۴ھ میں امام علی نقی علیہ السلام کو زہر دلوا کر شہید کر دیا۔

(اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ)

سبق 17

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

مختصر تعارف:

اسم مبارک:	حسن
مشہور القاب:	عسکری، ازکی، ابن الرضا، الصامت، الرفیق
تاریخ ولادت:	۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ
تاریخ شہادت:	۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ
مقام ولادت:	مدینہ منورہ
مدفن:	سامرا (عراق)
والد بزرگوار:	حضرت امام علی نقی علیہ السلام
عمر مبارک:	۲۸ سال

والدہ ماجدہ: جناب حدیثہ سلام اللہ علیہا

مدت امامت: ۶ سال

کنیت: ابومحمد

اولاد: ایک فرزند (امام مہدی)

بادشاہان وقت: واثق باللہ، متوکل عباسی، مستنصر بن متوکل، مستعین بن متوکل، معتز بن متوکل، مہتدی معتمد علی اللہ

اخلاق واوصاف

مرحوم محدث قمیؒ کے مطابق خلفاء بنوعباس کی طرف سے اوقاف وصدقات کے ذمہ دار احمد بن عبید اللہ امام حسن عسکری علیہ السلام کے متعلق کہتے ہیں:

میں نے سامرا میں علم وزہد، وقار، ورع، عفت وحیاء اور قدر ومنزلت میں امام حسن عسکری علیہ السلام جیسا علوی سادات میں سے کسی کو نہیں پایا۔ انہیں صفات کی وجہ سے آپؑ امامت کے سزاوار تھے اور اس خدائی منصب پر فائز ہوئے۔

چنانچہ جب امام علی نقیؑ نے اپنے بیٹے کی امامت کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا چاہا تو امامت کے معیاروں کو بیان کرتے تھے۔ اس چیز کو مرحوم جواد فاضل نے کتاب ''چہاردہ معصومین میں امام حسن عسکری علیہ السلام کے حالات میں رقم کیا ہے کہ ابوبکر فدکی کہتے ہیں:

امام ابوالحسن سوم (امام علی نقی علیہ السلام) نے مجھے لکھا کہ میرا بیٹا ابومحمد تمام آل محمدؐ سے زیادہ گرامی، شریف اور منصب امامت کے لیے سب سے زیادہ شائستہ ہے۔ وہ میرا سب سے بڑا بیٹا ہے وہی میرا جانشین ہوگا بہتر ہے کہ تم دینی مسائل میں اس کی طرف رجوع کرو۔ اس خط میں امام علی نقی علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے علم وفضل اور ان کی شرافت و عظمت کو بیان فرمایا ہے۔

جس زمانے میں امام حسن عسکری علیہ السلام صالح بن وصیف کی قید میں تھے تو بنوعباس کے کچھ لوگوں نے صالح کو کہا کہ وہ امامؑ پر زیادہ سختی کرے۔ لیکن صالح نے جواب دیا میں اس سے زیادہ اور سختی نہیں کرسکتا کیونکہ میں نے امامؑ کو دوشتی ترین افراد کی حویل میں دیا تھا۔ لیکن جب سے امامؑ ان کی تحویل میں گئے ہیں وہ دونوں بھی نیک وصالح بن گئے ہیں۔

جب صالح نے ان دونوں کو بلا کر سرزنش کی تو انہوں نے کہا کہ: اس شخص کے بارے میں کیا کہیں جو دنوں کو

روزہ رکھتا ہے اور راتوں کو عبادت خدا کرتا ہے جب ہماری طرف دیکھتا ہے تو اس کی ہیبت سے ہمارے بدن کانپ اٹھتے ہیں۔ احمد بن عبداللہ بن خاقان نے امام حسن عسکری علیہ السلام کے ظاہری شکل وشمائل کے بارے میں لکھا ہے کہ آپؑ سیاہ آنکھوں، خوش قامت خوش شکل اور موزوں ومتناسب بدن کے حامل تھے۔

احوال وواقعات

سامرا میں قیام کے دوران امام حسن عسکری علیہ السلام اپنے بلند علمی اور اخلاقی مقام، بالخصوص شیعوں کی قیادت اور لوگوں کی جانب سے بے حد احترام کی وجہ سے امام حسن عسکری علیہ السلام نے بہت زیادہ شہرت حاصل کر لی تھی۔ نیز آپؑ عوام وخواص کی توجہ کا مرکز تھے اس لیے عباسی خلافت نے بعض مواقع کے علاوہ عموماً آپؑ کے ساتھ بظاہر احترام آمیز طرز عمل اختیار کیے رکھا۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کا خادم کہتا ہے کہ جن دنوں امامؑ خلیفہ کی اقامت گاہ میں جایا کرتے تھے تو لوگوں میں عجیب جوش وخروش پیدا ہو جایا کرتا تھا۔ آپؑ کے راستے میں آنے والی سڑکیں لوگوں سے بھر جاتی تھیں۔ جب امامؑ تشریف لاتے تو ایک دم خاموشی طاری ہو جاتی اور آپؑ لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے دربار میں داخل ہو جاتے تھے۔

متوکل نے امام علی نقی علیہ السلام کے ہمراہ ان کے فرزند امام حسن عسکری علیہ السلام کو بھی مدینہ سے سامرا طلب کیا تھا تا کہ ان دونوں اماموں پر نظر رکھی جا سکے۔ بعض مواقع پر اس نظر بندی کے دوران ان حضرات پر زیادہ سختی کی جاتی تھی خاص طور پر جب ایسے حادثات وجود میں آتے، جو کسی اعتبار سے حکومت کے لیے خطرہ شمار ہوتے تھے۔ ان مواقع پر امام حسن عسکری علیہ السلام کو ان کے بعض اصحاب کے ہمراہ قید خانے میں ڈال دیا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ مختلف اوقات میں امام کو قید وبند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا کبھی صالح بن وصیف کے قید خانہ میں رہے تو کبھی علی بن حزین کی جیل میں اور ایک عرصہ تک ''نحریر'' کے زندان میں بھی قید رہے۔

ان حالات میں بھی امام حسن عسکری علیہ السلام نے ہر ممکن طریقے سے اپنے چاہنے والوں سے رابطہ بحال رکھا اور اس مقصد کے لیے وہی طریقہ اپنایا گیا جو امام علی رضا علیہ السلام سے چلا آ رہا تھا یعنی دور دراز کے علاقوں میں آپؑ نے اپنے وکلا مقرر فرمائے ہوئے تھے جو عوام اور امام علیہ السلام کے درمیان رابطے کا کام انجام دیتے تھے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام اپنے آباء واجداد کی طرح ظالم خلفا اور ستمگروں کے مدمقابل رہے۔ آپؑ کے زمانے کا حکمران معتمد عباسی نہایت سفاک اور خونخوار بھیڑیا تھا۔ اس خصلت کا انسان علویوں کے قائد وپیشوا امام حسن عسکری علیہ السلام سے ہرگز چشم پوشی نہیں کر سکتا تھا معتمد عباسی نے ہی آپؑ کو زہر دلوا کر شہید کر دیا۔ چونکہ امامؑ سامرا کی ایک جانی پہچانی

شخصیت تھے اس لیے آپ کی شہادت کے موقع پر پورے شہر کی فضا غم واندوہ سے بھر گئی۔ چنانچہ احمد بن عبید اللہ نے ایک روایت میں بیان کیا ہے کہ:

''جب امام حسن عسکری علیہ السلام نے رحلت فرمائی، تو ہر طرف سے گریہ وزاری کی آوازیں آنے لگیں لوگ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ ''ابن الرضا علیہ السلام'' رحلت کر گئے۔ پھر آپؑ کی میت کو تدفین کے لیے تیار کیا گیا بازار بند ہو گیا۔ میرا باپ (جو کہ معتمد عباسی کا وزیر تھا) بنوہاشم، فوج، عدلیہ کی شخصیات، معتمد عباسی اور عوام سب نے جنازے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اس روز سامرا میں ایک قیامت بپا تھی۔

امام حسن عسکری علیہ السلام اور آپؑ کے والد بزرگوار امام علی نقی علیہ السلام کی سامرا میں کم از کم سترہ سال موجودگی کے دوران نہ صرف عوام الناس آپ کی طرف مائل ہوئے بلکہ بہت سے شیعہ بھی اس شہر میں جمع ہو گئے تھے ایسی حالت میں قدرتی بات تھی کہ آپ علیہ السلام کی شہادت کے وقت پورا سامرا سوگ میں ڈوب جائے اور فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جدائی پر بیتابی کا مظاہرہ کرے اور عزاء کی تصویر بن جائے۔

(اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ)

سبق 18

حضرت امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف

مختصر تعارف:

اسم مبارک:	م ح م د
مشہور القاب:	مہدی، قائم، منتظر غائب، خاتم، بقیہ اللہ، حجت خلق، صالح
تاریخ ولادت:	۱۵ شعبان المعظم ۲۵۵ھ
مقام ولادت:	سامرا (عراق)
والد بزرگوار:	حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام
والدہ ماجدہ:	جناب نرجس خاتونؑ
مدت امامت:	۲۶۰ھ تا حال
کنیت:	ابوالقاسم

اخلاق واوصاف

جب امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت ہوئی تو اس وقت امام عصر علیہ السلام کی عمر مبارک صرف ساڑھے چار برس تھی اور اسی کمسنی میں آپ کے سر پر خالق کی طرف سے امامت کا تاج رکھ دیا گیا۔ آئمہ اہل بیتؑ میں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ کم سنی میں ہی ایک خاص اہمیت وانتظام کے تحت کمالات کے جوہر سے آراستہ کر کے امامت کے درجے پر فائز کر دیے گئے ہوں۔

حضرت امام مہدی علیہ السلام سے قبل بھی ایسی نظیریں سامنے آچکی تھیں جیسے آپؑ کے جد بزرگوار حضرت امام علی نقی علیہ السلام جن کی عمر مبارک اپنے والد امام محمد تقی علیہ السلام کی شہادت کے وقت چھ برس اور چند ماہ سے زیادہ نہ تھی اسی طرح امام محمد تقی علیہ السلام کو جب منصب امامت سنبھالنا پڑا تو ان کی عمر مبارک آٹھ برس سے زیادہ نہ تھی۔ مدت عمر کا کم یا زیادہ ہونا منصب ولایت وامامت کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ منصب امامت وولایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان ہستیوں کو حاصل ہوتا ہے۔

حضرت امام العصر علیہ السلام اپنے جد بزرگوار حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمنام اور صورت وشکل میں ان کے مشابہ ہیں۔ آپؑ کی والدہ گرامی نرجس خاتونؑ قیصر روم کی پوتی اور شمعون وصی حضرت عیسیٰ کی اولاد سے تھیں۔ امام حسن عسکری علیہ السلام کی ہدایت سے آپؑ کی بزرگ مرتبت ہمشیرہ جناب حلیمہ خاتونؑ نے ان کو مسائل دینیہ اور احکام شرعیہ کی تعلیم دی تھی۔

القابات اور خطابات

غالباً آئمہ معصومینؑ میں حضرت علی علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ القاب ہمارے امام عصر علیہ السلام کے ہیں جن میں زیادہ مشہور درج ذیل ہیں۔

ا۔ المہدی

یہ ایک ایسا خطاب ہے جو آپؑ کے نام کا قائم مقام بن گیا ہے۔ اور آپؑ کے متعلق آئمہ طاہرینؑ کی اکثر روایات میں اس لفظ کے ساتھ آپؑ کو یاد کیا گیا ہے۔

لفظ مہدی کے معنی ہدایت یافتہ'' کے ہیں۔ اس لحاظ سے کہ اصل ہادی (راستہ بتانے والا) خالق دو جہاں کی ذات ہے۔ اس لیے خداوند عالم کی ہدایت کے لحاظ سے ان راہنمایان دین کو مہدی کہنا درست ہے۔ اگرچہ خطاب کے لحاظ سے یہ لفظ امام عصر کے ساتھ مختص ہو گیا ہے۔

۲۔القائم

یہ لقب ان احادیث سے ماخوذ ہے کہ جن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دنیا ختم نہیں ہو سکتی جب تک میری اولاد میں سے ایک شخص قائم (کھڑا) نہ ہو جو دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دے"۔

۳۔حجت خدا

ہر نبی یا امام اپنے دور میں خالق کی حجت ہوتا ہے۔جس کے ذریعے خداوند عالم اپنے بندوں کی ہدایت کرتا ہے۔اور بندوں کے پاس اپنی کوتاہیوں کے جواز کی کوئی سند نہیں رہتی۔چونکہ ہمارے زمانے میں خلق کی رہنمائی کی ذمہ داری حضرت مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کے ذریعے سے پوری ہوتی ہے۔اس لیے آپؑ "حجت خدا" ہے۔

۴۔منتظر

چونکہ امام مہدیؑ کے ظہور کی بشارتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ ہدیٰ مختلف ادوار میں دیتے رہے ہیں جس کی وجہ سے دنیا کو بہت عرصے تک آپؑ کی پیدائش کا انتظار رہا اور اب غیبت کے بعد دنیا کو آپؑ کے ظہور کا انتظار ہے۔

ظہور امام مہدیؑ از نظر اہل بیتؑ

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس سے لے کر حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام تک تمام معصومینؑ نے امام مہدی علیہ السلام کے متعلق اخبار دی ہیں۔یہاں ہم اختصار کی غرض سے چند معصومینؑ کی روایات پر اکتفا کریں گے۔

۱۔کتاب فرائد السمطین میں حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جناب ابن عباسؓ نے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:"میں انبیاء کا سردار ہوں اور علی علیہ السلام اوصیاء کے سردار ہیں۔میرے اوصیاء (جانشین) میرے بعد بارہ ہوں گے جن میں سے اول علی علیہ السلام ہیں اور آخری مہدی علیہ السلام ہوں گے"۔

۲۔کتاب کافی میں جناب جابر بن عبداللہ انصاریؓ کی روایت ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے پاس ایک لوح تھی جس میں تمام اوصیاء آئمہؑ کے نام درج تھے۔جناب سیدہؑ نے اس لوح سے بارہ اماموں کے ناموں کی خبر دی۔جس میں سے تین محمد تھے، چار علی اور ان کا آخری فرد آپ علیہا السلام کی اولاد میں وہ ذات ہے جو قائم ہوگا۔

۳۔شیخ صدوق نے"اکمال الدین" میں امام علی رضا علیہ السلام کی روایت کو نقل کیا ہے کہ جناب امیر المومنین علی

علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت امام حسین علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا ''تیری نسل میں سے نواں وہ ہے جو حق کے ساتھ قائم، دین کا ظاہر کرنے والا اور عدل وانصاف کو پھیلانے والا ہوگا''۔

۴۔حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ''جب میرے بھائی امام حسینؑ کی نسل سے نواں امام پیدا ہوگا۔تو خداوند عالم اس کی عمر کو غیبت کی حالت میں طولانی کر دے گا۔ پھر جب وقت آئے گا تو اپنے قدرت کاملہ سے اسے ظاہر فرمائے گا''۔

۵۔حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا کہ ''ہم میں سے قائم وہ ہوگا جس کی ولادت لوگوں سے پوشیدہ رہے گی یہاں تک کہ عام لوگ کہیں گے وہ پیدا ہی نہیں ہوا''۔

۶۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ ''میرے فرزند حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام کی نسل سے پانچواں قائم آل محمد ہوگا''۔

۷۔حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپؑ کے آباءواجدادؑ نے فرمایا ہے کہ زمین حجت خدا سے قیامت تک کبھی خالی نہیں ہوسکتی ہے اور جو اپنے زمانے کے امامؑ کی معرفت حاصل کیے بغیر مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرا ہے؟

آپؑ نے فرمایا: کہ بیشک یہ اسی طرح حق ہے۔جس طرح روز روشن حق ہوتا ہے۔عرض کیا گیا پھر آپؑ کے بعد حجت اور امام کون ہوگا؟ فرمایا: میرا فرزند جو پیغمبر خدا کا ہمنام ہے میرے بعد امام اور حجت خدا ہوگا۔اس کی غیبت کا دور اتنا طولانی ہوگا کہ اس میں جاہل لوگ حیران وسرگرداں پھریں گے اور باطل پرست ہلاکت ابدی میں گرفتار ہوں گے اور ظہور امامؑ کے مقررہ وقت کی پیشن گوئیاں کرنے والے دروغ گو ہوں گے''۔

ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت سے لے کر برابر ہر دور میں امام مہدی علیہ السلام کی خبر دی جاتی رہی ہے۔ بلکہ آئمہ ہدیٰؑ کے دور میں شعراء کرام کے کلام میں امام عصر علیہ السلام کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر بہت زیادہ شہرت اور اہمیت کا حامل تھا۔دوست ودشمن سب ان احادیث سے واقف تھے یہاں تک کہ بسا اوقات ان سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔

چنانچہ سلسلہ بنو عباسیہ میں سے محمد جس کا نام تھا اس نے اپنا لقب مہدی اسی لیے اختیار کیا اور نسل امام حسین علیہ السلام سے عبداللہ محض کے فرزند محمد کے متعلق بھی مہدی ہونے کا عقیدہ قائم کیا گیا۔

سبق 19

امام مہدیؑ کی حفاظت کا الٰہی انتظام

امام مہدی سے حکومت وقت کا تجسس

جس طرح فرعون مصر نے نجومیوں کی یہ پیشین گوئی سن لی تھی کہ عنقریب بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے جو اسکی حکومت کی تباہی و بربادی کا باعث ہوگا۔ تو اس نے مکمل کوششیں صرف کر دیں کہ وہ بچہ دنیا میں نہ آنے پائے اور ہزاروں نومولود بچوں کو تہہ تیغ کرا دیا۔

اسی طرح متواتر احادیث کی بنا پر عباسی سلطنت کے فرمانروا کو معلوم ہو چکا تھا کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کے ہاں اس مولود کی پیدائش ہوگی۔ جس کے ذریعے باطل حکومتیں تباہ ہو جائیں گی تو اس کی طرف سے انتہائی شدت کے ساتھ انتظامات کیے گئے کہ ایسے مولود کی پیدائش کا امکان باقی نہ رہے اسی لیے امام حسن عسکری علیہ السلام کو مسلسل قید و بند میں رکھا گیا مگر قدرت الٰہی کے سامنے کوئی بڑی سے بڑی مادی طاقت بھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔

جس طرح فرعون مصر کی تمام کوششوں کے باوجود حضرت موسیٰؑ کی پیدائش ہوگئی اسی طرح سلطنت عباسیہ کے تمام انتظامات کے باوجود ''حضرت امام منتظر علیہ السلام'' کی ولادت ہوئی۔ مگر یہ قدرت کی طرف سے انتظام تھا کہ آپؑ کی پیدائش کو صیغہ راز میں رکھا گیا اور اس راز پر سے اس وقت پردہ اٹھایا گیا جب امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت واقع ہوئی۔ اور دنیا والوں نے وقت کے امام کا دیدار کیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب امام حسن عسکری علیہ السلام کی میت کو غسل وکفن کے بعد نماز جنازہ کے لیے رکھا گیا تھا۔ شیعیان خاص کا مجمع تھا اور نماز کے لیے صفیں بندھ چکی تھیں۔

امام حسن عسکری کے بھائی جعفر نماز جنازہ پڑھانے کے لیے آگے بڑھ چکے تھے۔ اور تکبیر کہنا ہی چاہتے تھے کہ ایک دفعہ حرم سرائے امامت سے ایک کم سن بچہ برآمد ہوا اور بڑھتا ہوا صفوں کے آگے پہنچا اور چچا جعفر کی عبا کو ہاتھ میں لے کر کہا ''چچا! پیچھے ہٹیے، اپنے والد کی نماز جنازہ پڑھانے کا حق مجھے زیادہ ہے''۔ جعفر بے ساختہ پیچھے ہٹے امام مہدی علیہ السلام نے آگے بڑھ کر نماز جنازہ پڑھائی۔ غیر ممکن تھا کہ یہ خبر خلیفہ وقت کو نہ پہنچے، چنانچہ اب زیادہ شدت وقوت کے ساتھ تلاش شروع ہوگئی تا کہ امام حسن عسکریؑ کے صاحبزادے کو گرفتار کر کے قید کر دیا جائے اور ان کی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیا جائے۔

غیبت امام مہدیؑ

حضرت امام مہدی علیہ السلام کی امامت کا زمانہ دو غیبتوں میں تقسیم ہے ایک زمانہ ''غیبت صغریٰ'' دوسرا ''غیبت کبریٰ'' کا ہے۔ اور اس کی خبر بھی معصومینؑ کی زبان پر پہلے آچکی تھی۔ امیر المؤمنینؑ نے فرمایا کہ قائم آل محمدؐ کے لیے ایک طولانی غیبت ہوگی اور وہ منتظر میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ کہ دوستان اہل بیتؑ اس کی غیبت کے زمانے میں سرگرداں پھر رہے ہونگے جس طرح جانور چراگاہ کی تلاش میں سرگرداں پھرتے ہیں۔ اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

مہدیؑ ساتویں امام کی اولاد میں سے پانچواں ہوگا، یہ ہستی تمہاری نظروں سے غائب رہے گی۔ ایک مقام پر فرمایا:

صاحب الامر کے لیے ایک غیبت ہونے والی ہے اس وقت ہر شخص کو لازم ہے کہ تقویٰ اختیار کرے اور اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام نے آپ کی غیبت کے متعلق فرمایا:

میرے فرزند کی غیبت ایسی ہوگی کہ سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے سب شک وشبہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ امام محمد باقر نے یہ خبر بھی دے دی کہ ''قائم آل محمدؐ'' کے لیے دو غیبتیں ہیں ایک بہت طولانی اور دوسری اس کی نسبت مختصر ہے۔

ان جیسی بے شمار روایات کے موجود ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے بعد ان کے اصحاب اور مخلص مؤمنین کسی شبہے میں مبتلا نہیں ہوئے اور انہوں نے امام غائب کے تصور کے سامنے سر تسلیم خم کر دیئے۔ ہم آنے والے سبق میں غیبت کے دونوں زمانوں پر مختصر نظر ڈالیں گے۔

سبق20

غیبت و نیابت امامؑ

غیبت صغریٰ

امام مہدی علیہ السلام کا یہ دور غیبت ۲۶۰ھ سے ۳۲۹ھ تک ۶۹ سال کے عرصہ پر مشتمل ہے۔اس دور میں امام کے خاص سفیر اور نمائندے لوگوں کے درمیان موجود ہوتے تھے جوان کے مسائل امامؑ تک پہنچاتے تھے اور امامؑ سے جوابات لے کر لوگوں کو بتلاتے تھے۔اسی طرح خمس وزکواۃ کے اموال کو جمع کر کے خاص مصارف میں صرف کیا کرتے تھے۔

ان خاص نائبین کی تعداد چار تھی، اور یہ علم وزہد،تقویٰ اور رازداری میں اپنے زمانے کے تمام اشخاص سے ممتاز تھے۔ان کو ''نواب اربعہ'' بھی کہا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں:

ا۔ابوعمرو عثمان بن سعیدؒ

عثمان بن سعیدؒ حضرت امام علی نقی علیہ السلام کے بھی سفیر تھے پھر امام حسن عسکری علیہ السلام کے زمانے میں اس عہدہ پر قائم رہے۔آپ کا یہ دور سفارت پانچ سال تک قائم رہا اور بغداد میں انتقال کر گئے اور وہیں دفن ہیں۔

۲۔ابوجعفر محمد بن عثمانؒ

امام حسن عسکری علیہ السلام نے ان کے منصب سفارت پر برقرار ہونے کی خبر دی تھی۔پھر ان کے والد عثمان بن سعید نے اپنی وفات کے وقت بحکم امام حجتؑ ان کی نیابت کا اعلان کیا۔انہوں نے جمادی الاول ۳۰۵ھ میں بغداد میں وفات پائی۔

۳۔ابوالقاسم حسین بن روحؒ

آپ بہت بڑے جلیل القدر، پرہیزگار عالم تھے اور علم وحکمت، کلام ونجوم میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ابو جعفر محمد بن عثمانؒ نے اپنی وفات سے پہلے امام حجتؑ کے حکم سے انہیں اپنا نائب بنایا۔آپ پندرہ برس عہدۂ سفارت پر قائم رہنے کے بعد ماہ شعبان ۳۲۰ھ میں وفات پا گئے۔

۴۔ابوالحسن علی بن محمد سمریؒ

یہ آخری نائب تھے۔حسین بن روحؒ کے بعد بحکم امام حجتؑ ان کے قائم مقام ہوئے۔اور نو برس اس فریضہ نیابت کو انجام دینے کے بعد ۱۵ شعبان ۳۲۹ھ کو بغداد میں انتقال کر گئے۔وقت آخر جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ

کے بعد نائب امام حجتؑ کون ہوگا تو انہوں نے جواب دیا کہ اب اللہ تعالیٰ کی مشیت ایک دوسری صورت کا ارادہ رکھتی ہے جس کی آخری مدت اس کو معلوم ہے۔ اسی ۳۲۹ھ کے اندوہناک سال میں کتاب ''کافی'' کے مصنف ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینیؒ اور شیخ صدوقؒ کے والد بزرگوار علی بن بابویہ قمیؒ نے بھی انتقال فرمایا۔

غیبت کبریٰ

۳۲۹ھ کے بعد سے اب تک کا زمانہ ''غیبت کبریٰ'' یعنی طولانی غیبت کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور کے لیے کہ خود امام عصر علیہ السلام نے ہدایت فرمادی تھی کہ ''اس صورت میں دیکھنا جو لوگ ہماری احادیث پر مطلع ہوں اور ہمارے حلال وحرام یعنی مسائل سے واقف ہوں ان کی طرف رجوع کرنا۔ یہ ہماری جانب سے تمہارے اوپر حجت ہیں''۔

اس حدیث کی بناء پر علماءِ شیعہ اور مجتہدین کو ''نائب امام'' کہا جاتا ہے۔ مگر یہ نیابت عمومی صفات کے لحاظ سے ہے۔ خصوصی طور پر کسی کی نامزدگی نہیں کی گئی ہے اور یہی فرق ہے نائبین عام اور ان خاص نائبین کے مابین کہ جو ''غیبت صغریٰ'' کے زمانے میں اس منصب پر فائز تھے۔

تاہم غیبت کبری کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ امام زمان علیہ السلام اپنے چاہنے والوں سے قطع تعلق کر گئے ہوں بلکہ مسلسل ہدایت خلق اور حفاظت اسلام کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ اور ہماری کسی نہ کسی صورت میں رہنمائی بھی فرماتے ہیں۔ یہ غیبت اس وقت تک رہے گی جب تک مصلحت الٰہی کا تقاضا ہے۔ اور ایک دن امام

مہدی علیہ السلام بحکم خداوند عالم ظہور فرمائیں گے اور دنیا کو عدل وانصاف سے اس طرح بھر دیں گے جیسے وہ ظلم وجور سے مملو ہو چکی ہوگی۔

دورِ غیبت میں ہمارے فرائض

علامہ شیخ عباس قمیؒ نے دورِ غیبت امامؑ میں آٹھ طرح کے فرائض کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جو احساس غیبت امامؑ اور انتظار کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بہترین وسائل ہیں۔ اور ان کے بغیر نہ ایمان بالغیب مکمل ہوسکتا ہے اور نہ انسان صحیح معنوں میں امام منتظر علیہ السلام کے منتظرین میں شامل ہوسکتا ہے۔ یہ آٹھ فرائض مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ محزون اور رنجیدہ رہنا

حقیقت امر یہ ہے کہ اگر انسان غیبت امام منتظر علیہ السلام کے زمانہ میں دنیا کے بدترین حالات کا جائزہ لے، اہل زمانہ کے بے پناہ ظلم وستم، نظام اسلامی کی بربادی، تعلیمات الہیہ کا استہزاء اور اس طرح کے بے شمار معاملات پر نظر ڈالے تو اسے غیبت امام معصومؑ کے نقصانات کا اندازہ ہوگا۔ اور اس کا دل اپنے محبوب امام کے ظہور کے لیے مضطرب ہو

جائے گا۔اور زمانے کی بے راہ روی کا احساس اس کے دل کو رنجیدہ اور محزون کر دے گا۔

جس طرح امام مہدی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہم کسی وقت بھی اپنے چاہنے والوں کی یاد سے غافل نہیں ہوتے، اسی طرح ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اپنے محبوب امام منتظر علیہ السلام کی یاد سے غافل نہ رہیں اور آنسو بہا کر ان کے ظہور کی دعا کرتے رہیں۔

۲۔انتظار حکومت آل محمدؐ

دورِ غیبت امام زمان علیہ السلام میں انتظار کو افضل ترین عمل قرار دیا گیا ہے۔اور اس میں اس امر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ دنیا میں ایک دن آل محمدؐ کا اقتدار ضرور قائم ہونے والا ہے اور مؤمنین کرام کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس دن کا انتظار کریں اور اس کے لیے زمین ہموار کریں اور فضا کو ساز گار بنانے کی کوشش کرتے رہیں۔

۳۔امامؑ کے حفظ و امان کے لیے دعا کرنا

دعا صحت و سلامتی امام زمان علیہ السلام ''اللهم كن لوليك الحجة ابن الحسنؑ'' امام قائم علیہ السلام کے وجود کی حفاظت، ان کے ظہور کی تعجیل اور ان کی عادلانہ حکومت کے بارے میں جامع ترین دعا ہے ہمیں اس دور میں اپنے امامؑ کی حفاظت اور صحت کے لیے ہمہ وقت دعا گو رہنا چاہیے۔

۴۔امامؑ کی سلامتی کے لیے صدقہ دینا

انسان جس کی سلامتی کی واقعاً خواہش رکھتا ہو اس کے حق میں صرف لفظی دعا ہی نہیں کرتا بلکہ عملی طور پر بھی دفع بلا کا انتظام کرتا ہے اور یہ انتظام صدقہ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔

۵۔امامؑ کی نیابت میں حج کرنا، یا کسی دوسرے کو حج پر بھیجنا

یہ دور قدیم سے رائج ہے کہ لوگ اپنے زمانے کے امام کی طرف سے نیابتاً اعمال انجام دیا کرتے تھے اور امام وقت کے اعمال کی قدردانی فرماتے تھے۔

لہٰذا جس شخص کی بھی استطاعت ہو اسے چاہیے کہ امام قائم علیہ السلام کی طرف سے حج کرے۔

۶۔امام کا اسم گرامی سننے پر کھڑے ہونا

جب امام مہدی علیہ السلام کا نام سنا جائے اور بالخصوص جب آپؑ کا ذکر لفظ ''قائم'' سے کیا جائے۔تو آپؑ کے قیام کے تصور کیساتھ کھڑا ہو جانا محبت، عقیدت، اور غلامی امامؑ کا بہترین مقتضا ہے جس سے کسی وقت بھی غفلت نہیں کی جاسکتی۔

۷۔دورغیبت میں دین وایمان کی حفاظت کے لیے دعا کرنا

امام جعفر صادق علیہ السلام نے جناب زرارہؓ سے فرمایا تھا کہ ”ہمارے قائم کی غیبت کے دور میں اس قدر شبہات پیدا کیے جائیں گے کہ اچھے خاصے لوگ مشکوک ہوجائیں گے۔لہٰذا اس دور میں ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے ایمان کی سلامتی کی دعا کرتا رہے“۔

۸۔مصیبت اورمشکل کے موقع پر امام زمانؑ سے استغاثہ کرنا

یہ بھی اعتقاد کے استحکام اور روابط وتعلقات کے دوام کے لیے بہترین طریقہ ہے کہ مصیبت اورمشکل کی گھڑی میں اپنے امام عصر علیہ السلام کووسیلہ بنایا جائے اوران کی بارگاہ میں استغاثہ کیا جائے۔

کیونکہ اللہ تعالٰی نے آئمہ طاہرینؑ کو یہ طاقت اورصلاحیت دی ہے کہ وہ فریاد کرنے والوں کی فریادرسی کر سکتے ہیں۔

اورسب سے بڑھ کر یہ کہ انسان اپنے دین سے آشنائی کے ساتھ ساتھ احکام الٰہی پر عمل پیرا ہو۔محرمات الٰہی سے بچ کراورواجبات کوانجام دے کر اپنے آپ کوصحیح معنوں میں امام عصر علیہ السلام کا انتظار کرنے والا ثابت کرے اور ہمہ وقت امام مہدی عجل اللہ فرجہ کے ظہور کی تعمیل کے لیے دعا گو رہے۔

اللھم عجل فرجه و سھل مخرجه (آمین)

عقائد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

''کورس کا تعارف اور اہداف''

تعارف

عقائد کسی بھی دین کی جڑیں ہوا کرتی ہیں۔ اسی لیے ہم انہیں ''اصول دین'' بھی کہتے ہیں کیونکہ دین کی بنیاد انہی عقائد اور نظریات پر استوار ہوتی ہے۔ جس دین کے عقائد اور نظریات، منطقی، واضح، فطری اور عقلی تقاضوں کے مطابق ہوں گے اس حساب سے وہ دین مضبوط، موثر اور دیر پا ہوگا۔

دین اسلام جن عقائد پر استوار ہے وہ عقل و منطق اور فطرت انسانی کے عین مطابق ہونے کے سبب صرف مختصر عرصے میں پوری دنیا میں پھیل گیا اور دنیا کا سب سے سریع ترین اور موثر ترین دین ثابت ہوا۔

آج اگر اسلامی دنیا زبوں حالی کی شکار ہے تو اس کا بنیادی سبب مسلمانوں کا اپنے عقائد اور نظریات کا درست فہم پر مبنی نہ ہونا اور ان پر پختہ یقین کی کمی ہے۔ اسلامی عقائد کی صحیح وضاحت ائمہ اہل البیتؑ کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا اور ان ہستیوں سے دوری کے باعث آج امت مسلمہ بے شمار فرقوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔

اسلامی عقائد کی مذکورہ اہمیت کے پیش نظر اس کورس میں اسلامی عقائد کو خاص اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے توحید، عدل نبوت امامت اور قیامت جیسے بنیادی عقائد کو نہایت مختصر اور طلباء کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھ کر بیان کیا گیا ہے۔

اہداف:

اس کورس کو پڑھنے کے بعد طلبہ انشاءاللہ:

۱۔ اسلامی بنیادی عقائد کو درست انداز میں سمجھیں گے۔

۲۔ اپنے عقائد کو مزید مضبوط اور پختہ بنائیں گے۔

۳۔ اپنے منطقی عقلی و فطری عقائد کو بنیاد بنا کر اپنی عملی زندگی میں تبدیلی دیکھیں گے۔

سبق 1

اصول دین

ہر شخص کسی ایک مذہب اور دین کا ماننے والا ہوتا ہے۔ کوئی مسلمان ہے تو کوئی عیسائی، کوئی یہودی ہے تو کوئی ہندو، قرآن مجید میں خداوند کریم فرماتا ہے:

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ

خدا کے نزدیک تو دین اسلام ہی ہے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡهُ

اور جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی پیروی کرے گا تو وہ قابل قبول نہیں۔

ہر دین کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ دین کی جڑیں اور دوسرا حصہ اس کی شاخیں کہلاتا ہے۔ دین کی جڑوں کو اصول دین اور شاخوں کو فروع دین کہا جاتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اصول دین توحید، نبوت، عدل، امامت اور قیامت ہیں۔ اور فروع دین دس ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکات، خمس، جہاد، تولا، تبرا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

جب کسی درخت کی جڑیں خراب ہو جائیں تو اس درخت کی شاخیں بھی ٹھیک نہیں رہ سکتی۔ پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے فروع دین، نماز، روزہ وغیرہ قبول ہوں تو ہمیں اصول دین کو درست کرنا ہوگا۔ اصول دین کو دلیلوں کی بنیاد پر سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ ہم خدا کو اس وجہ سے نہیں مانتے کہ ہمارے ماں، باپ مانتے ہیں یا آباء و اجداد مانتے تھے۔

اگر ہم اپنے آباء و اَجداد کی وجہ سے خدا کو ایک مانتے ہیں تو ہم ان کافروں کی طرح ہوں گے کہ جن سے جب کہا جاتا تھا کہ بتوں کی عبادت نہ کرو تو وہ کہتے کہ ہمارے آباء اجداد چونکہ بتوں کی عبادت کرتے تھے تو ہم بھی کریں گے۔

اصول دین میں ہر بالغ، عاقل شخص پر اپنی عقل کی طرف سے دلیل قائم کرنا ضروری ہوتا ہے جبکہ فروع دین کو فقط اپنی عقل سے ماننا جائز نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر خدا کے ایک ہونے پر (توحید) عقل کی طرف سے دلیل بنانا ضروری ہے۔لیکن نماز و روزہ کے لئے فقط عقل کو دلیل بنانا جائز نہیں۔ پس اصول دین میں تقلید جائز نہیں (تقلید یعنی کسی کی بات کو بغیر دلیل کے ماننا) بلکہ اپنی عقل سے تمام اصول دین توحید نبوت عدل امامت و قیامت کو ثابت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جبکہ فروع دین میں تقلید کرنا واجب ہوتا ہے۔ مجتہد جامع الشرائط کی تقلید فقط فروع دین میں کرنا ضروری ہوتا ہے۔

آنے والے درسوں میں ہم تمام اصول دین پر عقلی دلیل قائم کریں گے۔ اور یہ جاننے کی کوششیں کریں گے کہ اس کائنات کو کس نے بنایا؟ یا یہ خود بخود بن گئی ہے؟ ہمارا پیدا کرنے والا کوئی ہے؟ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کیوں آئے؟ اور ہمیں کہاں جانا ہے؟ ان تمام سوالات کے جواب ہم اپنی عقل سے معلوم کریں گے۔ یہ بات واضح ہے کہ اسلام عقل اور علم کا دین ہے۔ دنیا میں دوسرے دین اور مذہب کی طرح فقط خیالی اور واہی دین نہیں ہے۔ چونکہ اسلام ہمارے سوال کرنے پر پابندی نہیں لگاتا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے سوال کرو۔ مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''خدا اس شخص پر رحمت نازل کرے جو یہ جانتا ہے کہ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں جانا ہے۔''

اگر ہم ان سوالوں کے جواب اپنی عقل سے معلوم کریں گے تو ہمارا دل مطمئن ہو جائے گا اور ہم اپنی من پسند زندگی بسر کر سکیں گے۔

سبق 2

اثبات وجود خدا

انسان ہمیشہ حقیقت کی تلاش اور جستجو میں رہتا ہے چونکہ انسان کی فطرت جستجو اور تلاش کرنا ہے۔ جب ایک چیونٹی کے بارے میں سائنسدان کئی کئی سال تک ریسرچ کرتے ہیں۔تو ہم اس کائنات کے خالق کے بارے میں ریسرچ کیوں نہ کریں؟ چھوٹی سی چھوٹی چیز بغیر بنانے والے کے نہیں بن سکتی تو کیا یہ ستارے، آسمان، زمین اور پوری کائنات بغیر بنانے والے کے بن سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یقیناً اس کائنات کو کوئی بنانے والا ہے۔تو سوال یہ ہے کہ ہم کائنات کے خالق کو کیسے پہچانیں؟

خدا کی پہچان کے مندرجہ ذیل طریقے ہیں:

نشانیوں کے ذریعے

ہزاروں سال پہلے والا اگر کوئی ایک برتن ہمیں مل جائے تو اس برتن سے ہزار سال قبل کے حالات وغیرہ معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ اگر آپ زمین پر شیر کے قدموں کے نشان دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یقیناً آس پاس موجود ہے۔ اگر کہیں سے دھواں اٹھتا دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آگ لگی ہے۔ ہم ان نشانیوں کے ذریعے آگ، شیر، ہزار سال قبل کے حالات کو جان سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کونسی نشانیوں کے ذریعے ہم خدا کو پہچان سکتے ہیں؟

معرفتِ نفس

انسان کا جسم مکمل فیکٹری کی حیثیت رکھتا ہے۔ غذا کا معدے سے خون میں تبدیل ہونا، دل کا خون کو جسم کے تمام مقامات تک پہنچانا، پھیپھڑوں کا سٹم، یہ سارا جسم اتنا پیچیدہ سٹم رکھتا ہے کہ آج تک سائنسدان مکمل طور پر اس کے رازوں کو نہیں جان سکے۔ اگر انسان خود کو دیکھے گا تو وہ کہے گا کہ میرا کوئی خالق ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ أَيَٰتٌ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ

اور خود تمہاری خلقت میں اور جن جانوروں کو پیدا کیا ہے ان میں صاحبان یقین کے لیے نشانیاں ہیں۔

ایک شخص سے حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ:

میں نے اپنے وجود پر نظر کی تو پتہ چلا کہ یقیناً اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔ تو میں نے اس کے وجود کو مان لیا۔ اسی وجہ سے حضرت علی نے فرمایا:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ

جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے مالک کو پہچان لیا۔

کائنات کا مشاہدہ

انسان اللہ تعالیٰ کی اس وسیع وعریض کائنات کا مشاہدہ کر کے اپنے خالق تک پہنچ جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَأَيَٰتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں صاحبان عقل کے لیے نشانیاں ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا: وَفِي الْأَرْضِ أَيَاتٌ لِلْمُوْقِنِينَ ''زمین میں اہل یقین کے لیے نشانیاں ہیں۔''

زمین سورج، چاند ستاروں کو جب ہم دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یقیناً ان کا کوئی بنانے والا ہے۔

نظم وضبط

نیوٹن نے نظام شمسی کا سانچہ بنایا۔ اس سانچے میں چھوٹے چھوٹے گیند تھے۔ جو ایک دھاگے سے بندھے ہوئے تھے۔ اوران کے لیے ایک ہینڈل بنایا تھا جب اس کو چلاتے تھے تو سارے گیند اپنے مدار پر گردش کرتے تھے۔ جیسے سیارے گردش کرتے ہیں۔

ایک دن نیوٹن کا ایک قریبی دوست اس سے ملنے آیا۔ جیسے ہی اس کی نگاہ اس خوبصورت سانچے پر پڑی تو وہ حیران رہ گیا اور چیخ پڑا۔ ارے واہ! یہ تو بہت ہی حیرت انگیز چیز ہے اس کو کس نے بنایا ہے؟ نیوٹن نے کہا اس کو کسی نے نہیں یہ خود بخود بن گیا۔ تو نیوٹن کے دوست نے کہا تم مجھے پاگل سمجھتے ہو اس کا بنانے والا کوئی عام شخص نہیں بلکہ ماہر مکینک ہوسکتا ہے نیوٹن آہستہ سے اٹھا اور اپنے دوست کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا: اے میرے دوست تم دیکھتے ہو کہ یہ ایک نظام شمسی کا سانچہ ہے اور تم اس بات پر بالکل راضی نہیں کہ یہ خود بخود وجود میں آیا تو تم اس بات کو کیسے مان لیتے ہو کہ خود نظام شمسی اپنی تمام تر وسعت اور پیچیدگی کے ساتھ بغیر کسی بنانے والے کے بن گیا؟

جی ہاں! کائنات میں سیاروں اور ستاروں کا خاص ترتیب اور نظم وضبط سے ہونا کسی دھماکے کے اتفاق کی وجہ سے نہیں ہوسکتا۔ کیا آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ایک دھماکہ ہو اور صفحے اڑ کر آئیں کتابیں بن جائیں اور پھر خاص ترتیب کے ساتھ الماری میں فٹ ہو جائیں؟ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔

کائنات کی منظم خلقت پر غور کریں تو کسی حکیم علیم ذات کے وجود کا یقین ہو جاتا ہے۔

سبق 3

خدا کی صفات

اس کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہمارا خدا ہے اب ہم یہ جانیں گے کہ خدا کی کونسی صفات ہونی چاہئیں؟

تو اس کا بہت ہی آسان جواب یہ ہے کہ خدا کی ذات کمال مطلق ہونی چاہیے اور تمام تر عیوب اور نقائص سے وہ مبرا ہونا چاہیے۔ خدا کی تمام صفات ہماری صفات جیسی نہیں ہیں۔ اگر خدا عالم ہے تو ہمیشہ سے عالم ہے ایسا نہیں کہ ہماری طرح پہلے جاہل تھا اور بعد میں عالم بنا۔

خدا کی اعلی اور کمال والی صفات کو صفات ثبوتیہ اور جمالیہ کہتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

* قادر ہے۔

* خدا عالم ہے۔
* خدا حی و قیوم ہے یعنی خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔
* خدا مرید ہے یعنی اپنے کاموں کو ارادہ اور قصد سے انجام دیتا ہے۔
* خدا بصیر ہے یعنی خدا سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔
* خدا سمیع ہے یعنی ہر چیز کو سننے والا ہے اور کسی چیز سے غافل نہیں ہے۔
* خدا قدیم ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اس کی کوئی ابتداء نہیں اور ابدی یعنی ہمیشہ رہے گا اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔
* خدا متکلم ہے یعنی حقیقت اور مقصد کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

خدا سے ہر قسم کے نقص اور عیب کی نفی کرنے والی صفات کو صفات سلبیہ یا جلالیہ کہتے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

خدا جاہل نہیں ہے۔
* مجبور و عاجز نہیں، یعنی ہر کام پر قدرت رکھتا ہے۔
* محتاج نہیں ہے۔
* ظالم نہیں ہے۔
* خدا مرکب نہیں، یعنی خدا مختلف اجزا سے مل کر نہیں بنا۔
* خدا جسم نہیں رکھتا، پس ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔
* مکان نہیں رکھتا۔
* اس کا کوئی شریک نہیں، یعنی خدا ایک ہے کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔

سبق4

توحید

خدا کے ایک ہونے پر دلائل

ا۔جس طرح ایک کتاب کا ایک ہی مالک ہوتو اچھا ہے۔اگر کوئی دوسرا بھی آپ کے ساتھ شریک ہوتو آپ اسے اچھا نہیں جانتے۔ایک ملک کا ایک ہی وزیر اعظم ہونا چاہیے۔جب ایک کتاب یا ایک ملک یا چھوٹی سی چھوٹی چیز کا ایک مالک ہونا چاہیے تو اس کائنات کا بھی ایک مالک ہونا چاہیے۔

۲۔خدا تمام کمالات کا مالک ہے۔کمال یہ ہے کہ اس کائنات کا خدا تنہا مالک ہو اگر کوئی دوسرا بھی خدا ہو تو نقص اور عیب ہے۔خدا ہر قسم کے نقص وعیب سے پاک ہے۔پس خدا ایک ہی ہے۔اور یہی کمال اور خوبی ہے۔

۳۔اگر دو خدا ہوتے یعنی اس کائنات کے دو مالک ہوتے تو ممکن تھا کہ جھگڑا ہوتا اگر جھگڑا نہ ہوتو دونوں مشورے اور اتفاق سے کام لیں گے۔اور مشورہ کرنا یا اتفاق کرنا ایک قسم کی محتاجی ہے۔اور محتاج ہونا ایک عیب ہے۔ جبکہ خدا محتاج نہیں ہے۔چونکہ خدا میں کوئی عیب نہیں ہوسکتا اس لیے اللہ ایک ہی ہے۔

۴۔حضرت علی علیہ السلام اپنے بیٹے امام حسن علیہ السلام کو وصیت فرماتے ہیں: اگر خدا کا کوئی شریک ہوتا، تو اس (شریک) کا کوئی رسول ہم تک ضرور آتا اور اس کی قدرت اور سلطنت کے آثار تم ضرور دیکھتے

اگر کوئی دوسرا خدا ہوتا تو اس کے بھی کوئی نبی یا رسول ہوتے۔جتنے بھی رسول اور نبی آئے ہیں وہ ایک ہی خدا کی طرف سے آئے ہیں۔پس خدا ایک ہے۔

سبق5

توحید کی اقسام

توحید کی چار قسمیں ہیں:

ان چار قسموں میں خدا کو واحد اور ایک ماننا ضروری ہے اور وہ یہ ہیں:

ا۔توحید در ذات ۲۔توحید در صفات

۳۔توحید در افعال ۴۔توحید در عبادت

توحید در ذات

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا ایک ہے اور اس کے علاوہ دوسرے خدا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالی ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ

یعنی اس کی کوئی مثل نہیں ہے۔

ہم خدا کی ذات کے بارے میں اپنے ذہن میں کوئی شبیہ نہیں بنا سکتے کہ خدا کس طرح کا ہے۔ چونکہ ہمارا ذہن چھوٹا ہے جبکہ خدا کی ذات لامحدود ہے۔ اگر ہم خدا کی ذات کا اپنے ذہن میں تصور کرینگے تو یہ شرک در ذات ہوگا۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

''جو شخص اپنی عقل اور وہم وخیال میں خدا کی ذات کا کوئی خیالی تصور قائم کرے۔ تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ خدا اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔ کیونکہ جو کچھ اس کے ذہن میں آئے گا وہ اس کے ذہن کی پیداوار ہوگی اور اس کے ذہن کی مخلوق ہوگی۔ جبکہ خدا خالق ہے مخلوق نہیں۔ پس ہمارے لیے فقط خدا کو ثابت کرنا ہی کافی ہے اور ہماری عقل کے پاس اتنی طاقت اور وسعت نہیں کہ خدا کی ذات کو سمجھ سکے۔

اسی لیے امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''جب اللہ تک پہنچ جاؤ گے تو خاموش ہو جاؤ۔''

مطلب یہ کہ اس کائنات میں جتنے بھی کام ہو رہے ہیں وہ سب اللہ تعالی انجام دے رہا ہے۔ یعنی رزق دینا، مارنا، زندگی دینا، شفاء دینا، ہر کام خدا کرتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے

اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ

اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں رزق دیا۔

حضرت امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

''یا اللہ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم رب ہیں پس ہم اس سے بیزار ہیں جس طرح حضرت عیسیٰؑ نصاریٰ سے بیزار تھے۔ بارِ الٰہا جو کچھ یہ لوگ گمان کرتے ہیں ہم نے ان کو اس کی دعوت نہیں دی۔''

توحید در صفات

اللہ تعالیٰ اپنی ذاتی صفات میں یکتا ہے۔

توحید در عبادت

اس کا مطلب یہ ہے کہ فقط خدا کی عبادت کی جائے۔ اور اگر خدا کی عبادت کے ساتھ بتوں کی عبادت کی جائے تو یہ شرک ہوگا کیونکہ ''لا الہ الا اللہ'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ قرآن مجید میں

ارشاد ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا

اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراو۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ فرمایا:

''آدمی کوئی ثواب کا کام کرتا ہے لیکن اس کا مقصد خدا کی خوشنودی نہیں ہوتا بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کی مدح وثنا کریں کہ فلاں بڑا عبادت گزار ہے تو یہ شخص عبادت خدا میں شرک کا مرتکب ہوا''۔

اسی لیے روایات میں منقول ہے: اَلرِّيَاءُ شِرْكٌ ریاکاری شرک ہے۔

سبق 6

تجسیم خدا

کیا خدا کو دیکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ جیسے ہی سوال ہمارے ذہن میں آتا ہے تو ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دیکھا تو اس چیز کو جاتا ہے کہ جو جسم رکھتی ہو۔ کیونکہ ہم Infared کی لہریں یا موبائل کی لہروں کو تو نہیں دیکھ سکتے۔ چونکہ ان لہروں کا کوئی جسم نہیں ہے۔ پس جب یہ سوال ہوتا ہے کہ ہم خدا کو دیکھ سکتے ہیں؟ تو درحقیقت سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا خدا جسم رکھتا ہے؟

قرآن اور احادیث معصومینؑ سے یہ ثابت ہے کہ خدا کو دنیا و آخرت دونوں میں دیکھنا محال اور ناممکن ہے کیونکہ خدا جسم نہیں رکھتا۔ خدا کی ذات لیس کمثلہ شیء کی مصداق ہے۔ یعنی ہم خدا کی کوئی مثل تصور ہی نہیں کر سکتے۔ خدا کی ذات اس سے بلند و بالا ہے کہ ہم خدا کو دیگر اجسام چاند سورج وغیرہ کی طرح قرار دیں۔ خدا کو دیکھنا ناممکن و محال ہے۔ اس پر تین قسم کے دلائل موجود ہیں۔

عقل کہتی ہے کہ ہمیشہ اس چیز کو انسان دیکھ سکتا ہے کہ جو جسم رکھتی ہو اور ہمارے سامنے بھی موجود ہو۔ پس اگر یہ فرض کر لیں کہ خدا کی ذات جسم رکھتی ہے اور ہمارے سامنے ہے تو خدا کی ذات میں درج ذیل عیب ونقوص لازم آئیں گے۔

ا۔ ترکیب

چونکہ جسم مختلف اجزاء کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اگر خدا کو مرکب مان لیں تو مطلب یہ ہوا کہ خدا اجزاء اور اعضا کا الغرض پورے جسم کا محتاج ہوا۔ جبکہ محتاج ہونا خدا کے لیے بہت بڑا عیب ہے۔ خدا ہر قسم کے عیب سے پاک ہے پس

خدا مرکب نہیں۔ خدا جسم نہیں رکھتا۔ جب جسم نہیں رکھتا تو دیکھا نہیں جا سکتا۔

۲۔ محدودیت

چونکہ ہم جسم کو فقط اس صورت میں دیکھ سکتے ہیں کہ جب جسم ہمارے سامنے ہو، جب جسم ہمارے سامنے ہوتو ہمارے پیچھے، دائیں اور بائیں نہیں ہوگا۔ پس خدا کا ایک طرف میں محدود ہونا لازم آتا ہے۔ جبکہ ایک طرف ہونا اور محدود جگہ پر ہونا بھی ایک عیب ہے۔ اور خدا عیب سے پاک ہے۔ پس خدا جسم نہیں رکھتا۔

۳۔ مکان

اگر جسم خدا کے قائل ہو جائیں تو جسم کے لیے مکان کا ہونا ضروری ہے اور مکان کی ضرورت ایک قسم کی احتیاج ہے۔ پس خدا ہونے کے لیے جگہ کا محتاج ہو جائے گا۔ محتاج ہونا عیب ہے اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔

سبق 7

عدل کی تعریف

عدل

کسی بھی چیز کو اس کے اصلی مقام پر رکھنا عدل ہے۔

مثلاً ٹوپی کا مقام سر ہے اگر ٹوپی کو اپنے پاؤں میں رکھیں گے تو یہ عدل نہ ہوگا، اسی طرح چور سزا کا سزاوار ہے۔ اگر چور کو انعام دیدیں تو یہ عدل نہ ہوگا۔ خداوند عالم عادل ہے۔ یعنی وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا اور نہ ہی اس سے کوئی برا کام ہوتا ہے۔ خدا کے تمام کاموں میں حکمت اور مصلحت پائی جاتی ہے۔ خدا نیک اور اچھے کام کرنے والوں کو انعام سے نوازے گا۔ اور برے کام کرنے والوں کو عذاب دے گا۔ خدا کسی بھی بے گناہ اور بے قصور شخص کو جہنم میں نہیں ڈالے گا۔

عدل خدا پر عقلی دلائل

کسی کے ساتھ عدل نہ کرنا عیب ہے، خداوند کریم ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔ پس خدا عادل ہے۔ جو شخص ظلم کرتا ہے وہ تین وجہ سے ظلم کرتا ہے۔

ا۔ جہالت

مثلاً کوئی شخص کسی کو سزا دیتا ہے اور اس وجہ سے سزا دیتا ہے چونکہ وہ اسے قصوروار سمجھتا ہے۔ جبکہ حقیقت میں وہ بے قصور ہے۔ چونکہ ظلم کرنے والا اور سزا دینے والا نہیں جانتا ہے کہ وہ بے قصور ہے۔ پس اسے سزا دیتا ہے۔

۲۔لالچ

مثلاً دوسروں کے پاس مال ودولت ہے اور اس شخص کے پاس کچھ نہیں تو وہ دوسروں پر ظلم کرے گا تاکہ مال و دولت حاصل کرسکے۔

۳۔انتقام

خداوند کریم ان تینوں چیزوں سے پاک ہے چونکہ خدا ہر شخص کے دل کی نیت کو بھی جانتا ہے۔خدا جانتا ہے کہ کون اچھا ہے اور کون برا ہے۔ ہمارے اعمال خدا سے چھپے ہوئے نہیں ہیں اور نہ ہی خدا کسی کا محتاج ہے خدا ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ہمیں رزق ودولت دینے والا خدا ہے اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی شخص خدا کا کچھ بگاڑسکتا ہے تاکہ خدا بدلہ یا انتقام لے۔پس خدا کے ظلم کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔تو خدا ظلم کیسے کرے گا۔عقل کے نزدیک یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ خدا ظلم نہیں کرتا بلکہ خدا ہمیشہ عدل وانصاف ہی کرتا ہے۔قرآن مجید بھی یہی کہتا ہے:

إِنَّ اللهَ لا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ

اللہ یقیناً لوگوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ لوگ ہیں جو اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

شَهِدَ اللهُ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ

اللہ خود گواہ ہے اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، ملائکہ اور صاحبان علم گواہ ہیں کہ وہ عدل کے ساتھ قائم ہے۔

اہم نکات

☆ کسی پر ظلم کرنا اور انصاف وعدل نہ کرنا بہت بڑا عیب ہے۔جبکہ خدا ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔

☆ خدا کے ظلم کرنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔

☆ قرآن بھی خدا کے ظلم کی نفی کرتا ہے۔

☆ انسان کی طاقت سے زیادہ تکلیف دینا بھی عدل خداوندی کے خلاف ہے۔ پس خدا انسان کو اس کی طاقت کے مطابق تکلیف دیتا ہے۔اس طرح انسان کا اپنے اعمال میں مختار ہونا بھی۔

انسان کی آزادی

مذکورہ وجوہات کی بناء پر ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔انسان اپنے ارادہ واختیار کے ذریعے اپنے کام انجام دیتا ہے۔کیونکہ اگر ہم کہیں کہ انسان جبر کی وجہ سے اپنے کام انجام دیتا ہے یعنی انسان مجبور ہے اپنے اختیار سے کوئی کام انجام نہیں دیتا بلکہ وہی کرتا ہے کہ جو خدا اس سے کرواتا ہے۔توسزا وجزا بھی عدل خداوندی

کے خلاف ہے چونکہ اس صورت میں برے لوگوں کو سزا دینا ناانصافی ہوگا۔ کیونکہ جب انہوں نے برائی اپنی مرضی سے نہیں کی تو سزا کس بات کی؟!

اسی طرح جو اچھے کام کرتے ہیں ان کو کوئی انعام بھی نہیں ملے گا کیونکہ اس میں ان کا کوئی کمال نہیں۔ اس لیے انعام کے مستحق بھی نہیں ہوں گے۔ خدا کے حق میں یہ محال ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان کے کاموں پر مجبور کرے اور پھر غلط کام کرنے پر عذاب بھی دے۔ انسان اپنی مرضی سے اپنے اختیار سے اچھے اور برے کام کرتا ہے۔ اسی لیے سزا وجزا عدل خداوندی کے مطابق ہے اور درست ہے۔

سبق8

قسمت کا کھیل

دوستو! جب بھی کسی کو کوئی ناکامی ہوتی ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اور یوں سستی اور کاہلی کو اپنی عادت بنالیتا ہے، محنت اور کوشش کرنا چھوڑ دیتا ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ قسمت میں ہو تو مل جائے گا مجھے محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ہم سوچیں کہ اگر سارے کام تقدیر کے بل بوتے پر ہوتے تو قرآن میں خدا یہ کیوں فرماتا: وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس نے اچھا کام کیا تو اپنے نفع کے لیے اور برا کام کیا تو اس کا وبال اور خمیازہ بھی وہی اُٹھائے گا۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے شاعر مشرق علامہ اقبال اپنے کلام میں یوں فرماتے ہیں :

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

قرآنی آیات سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ انسان کو اپنی محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔ اور انسان جس طرح محنت کرتا ہے اسے وہی اجر ملے گا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان نے جو کچھ کرنا ہوتا ہے خدا اسے پہلے سے جانتا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ کون اچھا کام کرے گا اور کون برائی کرے گا۔

کچھ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ جب خدا جانتا ہے کہ کون اچھا کام کرے گا اور کون برائی کرے گا۔ تو پس ہم برائی ہی کریں گے اور ہم مجبور ہیں کہ ہم برائی کریں۔ اگر خدا جانتا ہے کہ ہمیں ناکامی ملے گی تو پس ہمیں ناکامی ہی ملے گی محنت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب بہت ہی آسان ہے کہ جب کلاس کا استاد یہ جانتا ہے کہ امتحان میں کون فیل ہوگا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ طالب علم فیل ہونے پر مجبور ہے۔ یعنی استاد کے جاننے اور استاد کے علم رکھنے کی وجہ سے شاگردوں کا مجبور ہونا لازم نہیں آتا بلکہ استاد کو فقط پڑھائی میں اس کی عدم دلچسپی کا اندازہ ہوتا

ہے۔ استاد کا علم اور انداز وعظ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن خدا کا علم کامل علم ہے جو کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔

پس جب خدا ہمارے مستقبل کے بارے میں جانتا ہے تو خدا کے اس علم سے ہمارا مجبور ہونا لازم نہیں آتا۔ پس ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کوشش کرے۔ عموماً یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان جب سستی کرتا ہے اور ناکامی ہوتی ہے۔ تو سارا الزام قسمت کے سر تھوپتا ہے اور کہتا ہے کہ میری قسمت میں خدا نے یہی لکھا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِندَهٗٓ أُمُّ الْكِتَابِ ''پھر اس میں سے خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے۔ اس کے پاس اصل لوح محفوظ ہے۔''

اس آیت سے ہم یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہمارے اعمال، ہماری محنت کی وجہ سے ہماری قسمت خدا تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اور اسی بات کی تائید بہت ساری احادیث سے بھی ہوتی ہے کہ اگر ایک انسان نیک کام کرے تو اس کی زندگی خدا بڑھا دیتا ہے اور اسی طرح انسان کی دعا اور عبادت سے بھی انسان کی تقدیر بدلتی رہتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا: قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ''اے رسول کہہ دو کہ اگر تمہاری دعا پکار نہ ہو تو میرا پروردگار تمہاری کوئی پرواہ نہ کرے۔''

پس اسلام میں اہمیت، انسان کی محنت اور کوشش کی ہے۔ انسان کی قسمت بھی محنت کوشش، دعا اور عبادت سے تبدیل ہوسکتی ہے۔

سبق 9

نبوت

آپ توحید وعدل کی بحث پڑھ چکے ہیں اب یہ سوال سب کے ذہن میں ہوگا کہ اللہ کی طرف سے ایک رہبر اور معصوم یا پیشوا ہونا چاہیے جو ہمیں خدائی احکام کی طرف رہنمائی کرے۔ تو خداوند کریم نے اپنے عدل کا مظاہر کرتے ہوئے ہمارے لئے رہبر کا انتظام نبوت کی شکل میں کر دیا۔

تعریف: نبی اس برگزیدہ شخصیت کو کہتے ہیں جو اللہ تعالی کی طرف سے احکام خداوندی کو بغیر تغیر وتبدل کے بندوں تک پہنچانے کے لئے منتخب کیا گیا ہو۔

بعثت انبیاءؑ کی ضرورت

کوئی انسان بھی کسی چیز کو بغیر مقصد کے نہیں بناتا۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ اسی طرح خداوند حکیم نے ہمیں پیدا فرمایا ہے تو اس کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہونا چاہیے یہ ایک فطری بات ہے یہ سوالات ہر انسان کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں:

* ہمارا دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟

* ہم کیسے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

* ہم نے موت کے بعد کہاں جانا ہے؟

یہ بنیادی سوالات ہیں جو ہر ایک انسان کے ذہن میں جنم لیتے ہیں۔ جہاں انسان کے وجود میں خداوند کریم نے عقل وفہم جیسی عظیم نعمت رکھی ہے۔ وہاں اس کے ساتھ حیوانی خواہشات بھی موجود ہیں۔ اس لیے انسان بغیر کسی رہبر کے فقط عقل کے ذریعے اپنے حقیقی ہدف میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور کسی مسئلہ کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

لہٰذا یہ بات تقاضا کرتی ہے کہ خالق کی طرف سے کچھ ایسی ہستیاں انسان کی ہدایت کے لیے آئیں جو عقل و فہم میں کامل اور عصمت کے درجے پر فائز ہوں اور انسان ان سے ہدایت لے کر اپنے سوالات کو حل کر کے اپنے اصلی مقصد تک پہنچ سکیں لہٰذا خداوند کریم نے انسان کی ہدایت کے لئے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔

بعثت انبیاء کا مقصد

خداوند کریم نے انبیاء کرامؑ کو ہماری دین ودنیا کی راہنمائی کے لیے بھیجا ہے تاکہ ہم انبیاء کے بتائے ہوئے سنہری اصول پر عمل کر کے دنیا وآخرت میں کامیاب ہو سکیں۔ انبیاء کی بعثت کا مقصد بندوں کو خدا پرست بنانا تھا۔ جیسا کہ خود قرآن مجید نے بہت سارے مقامات پر بعثت انبیاء کا مقصد بیان فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الْأُمِّیِّینَ رَسُولًا مِنْهُمْ یَتْلُوا عَلَیْهِمْ آیَاتِهِ وَیُزَکِّیهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَإِنْ کَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِی ضَلَالٍ مُبِینٍ

وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاکیزہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے جب کہ اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

اگرچہ وہ لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے لیکن اس کے باوجود علم وحکمت کی تعلیم کو بنیاد بنایا گیا یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ علم وحکمت انسانی کمالات کے لیے سب سے پہلا مرحلہ ہے انسان کو کمالات تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلے علم و حکمت کا ہونا ضروری ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِی کُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ

یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ کی اطاعت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔

اس میں بعثت کا مقصد اللہ کی عبادت بتایا گیا ہے اور خدا دشمن عناصر سے دوری کا حکم دیا گیا ہے۔

نبی کے شرائط

ا۔عصمت

عصمت ایسی طاقت ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ (چاہے صغیرہ ہو یا کبیرہ) نہیں ہوتا۔اس لیے نبی کے لیے معصوم ہونا شرط ہے۔کیونکہ اگر نبی معصوم نہ ہو اور خطاء وغلطی کا ارتکاب کرے۔تو اس کی کوئی بات حجت نہیں رہے گی۔ بلکہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ شاید غلطی کر رہے ہوں تو اس صورت میں بعثت انبیاء کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ لٰہذا نبی کے لیے معصوم ہونا شرط ہے تا کہ لوگ کاملاً نبیؑ کو معتبر اور حجت جانیں اور ان سے ہدایت لے کر اپنے حقیقی مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔

۲۔عالم علم لدنی

نبی کے لیے ضروری ہے کہ ان کا علم خدا کی طرف سے ہو اور وہ دنیا والوں کے علم کا محتاج نہ ہو کیونکہ اگر ہماری طرح نبی دنیا میں تعلیمی درسگاہ سے تعلیم حاصل کرے تو یقیناً جو تعلیم دے رہا ہے، وہ زیادہ قابلیت کا حامل ہوگا۔تو اس صورت میں افضل کو چھوڑ کر مفضول کو عہدہ دینا عدل الٰہی کے خلاف ہے۔اِس لیے ضروری ہے کہ نبی علم لدنی کا مالک ہو اور اس قانون سے آگاہی رکھتا ہو جو انسان کی سعادت اور نیک بختی کے لیے لازم ہو۔یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے جب اس کو علم براہ راست خداوند کریم سے عطا ہو۔

۳۔معجزہ

نبی کے لیے صاحب معجزہ ہونا ضروری ہے تا کہ نبی اپنی نبوت کے اثرات کے لیے ایسا کام کر کے دیکھائے جو دیگر لوگ انجام دینے سے عاجز ہوں اور لوگ اس کو برحق نبی تسلیم کریں۔ یہ اس صورت میں ممکن ہوگا جب نبی صاحب معجزہ ہو۔

اولوالعزم انبیاء

ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے پانچ انبیاء اولوالعزم ہیں۔

اولوالعزم کا مطلب ہے وہ برگزیدہ انبیا جو مستقل شریعت کے حامل تھے۔

ا۔حضرت نوح علیہ السلام

۲۔حضرت ابراہیم علیہ السلام

۳۔حضرت موسیٰ علیہ السلام

۴۔حضرت عیسی علیہ السلام

۵۔حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آسمانی کتب

آسمانی کتب چار ہیں:

*زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔

*توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی

*انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔

*قرآن مجید حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔

سبق10

معجزہ

کسی الٰہی منصب کا دعویدار اپنے دعوے کی تصدیق کے لیے قوانین طبیعت کو توڑ کر ایسا عمل انجام دے۔ جس سے دوسرے لوگ عاجز ہوں 'معجزہ' کہلاتا ہے۔

اگر کوئی حیرت انگیز کام معصوم کے علاوہ کسی اور کے ہاتھوں سے سرزد ہو تو اسے کرامت کہتے ہیں۔

معجزہ بھی ایک حیرت انگیز کام ہوتا ہے۔ جبکہ جادو سحر اور نظر بندی بھی حیرت انگیز کام ہوتے ہیں پھر معجزہ اور جادو میں کیا فرق ہے؟

عام طور پر یہ بھی گمان کیا جاتا ہے کہ اگر معجزہ جیسے کام کو ایک جادوگر بھی انجام دے سکتا ہے تو اس معجزہ نبوت و امامت کے لیے کیسے دلیل بنے گا؟ تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ معجزہ اور جادو یا معجزہ اور نظر بندی میں بہت سارے فرق پائے جاتے ہیں۔

ہم چند ایک فرق کو بیان کرتے ہیں:

پہلا فرق: جادو ایک قسم کا علم ہے کہ جو سیکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ پس جادو بغیر تعلم و تعلیم کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ جبکہ معجزہ تعلیم اور سیکھنے سے نہیں آتا۔ جیسا کہ قرآن ایک معجزہ ہے اور یہ اس نبی کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتا ہے کہ جس

نے کبھی کسی استاد سے نہیں پڑھا۔ پس ایک ایسا شخص کہ جو کسی سے تعلیم بھی حاصل نہیں کرتا۔ جبکہ قرآن جیسی علمی کمالات کی کتاب پیش کرتا ہے تو یہ حیرت انگیز کام ہوتا ہے۔ کہ جسے ہم معجزہ کہتے ہیں۔

دوسرا فرق

معجزہ کے معنی عاجز کر دینے والے کے ہیں۔ اس لیے معجزہ کا کوئی بھی توڑ نہیں لاسکتا۔ جبکہ جادو اور سحر کا توڑ ممکن ہوتا ہے۔ ایک جادوگر دوسرے جادوگر کے سحر کو باطل کر سکتا ہے جب جادوگروں نے اپنے جادو والے سانپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش کیے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معجزہ عصا پیش کیا جو ایک اژدھا بن کر ان کے سانپوں کو نگل گیا تو سارے جادوگر اس معجزے کا توڑ نہ لا سکے اور فوراً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے خدا پر ایمان لے آئے۔

تیسرا فرق

معجزہ میں ہدایت ہوتی ہے حضرت موسیٰ نے جیسے ہی معجزہ دکھایا تو جادوگر ایمان لے آئے۔ جبکہ جادو میں گمراہی ہوتی ہے۔

چوتھا فرق

جادو کے لیے مخصوص شرائط و قواعد ہوتے ہیں۔ اسی طرح کچھ جادو مختلف قسم کے آلات کی طرف محتاج ہوتے ہیں۔ کچھ مخفی قسم کے علل و اسباب بھی رکھتے ہیں کہ جو عام آدمی کی نظر سے اوجھل ہوتے ہیں پس جادو آلات، اسباب اور قواعد و شرائط کا محتاج ہے۔ جبکہ معجزہ خدا کے امر سے صادر ہوتا ہے کسی قسم کے آلات و اسباب کا محتاج نہیں ہوتا۔

پانچواں فرق

جادو میں حقیقت نہیں ہوتی فقط نظر بندی ہوتی ہے۔ یعنی عام لوگوں کی نظر میں وہ چیز حیرت انگیز نظر آرہی ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ چیز تبدیل نہیں ہوتی۔ لیکن معجزہ میں اصل چیز ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے میں عصا درحقیقت اژدہا میں تبدیل ہو گیا۔ رسیوں کی طرح نہیں کہ فقط لوگوں کو سانپ نظر آئے درحقیقت رسیاں ہی ہوں۔ اگر امام یا نبی معصوم کسی سنگریزے کو انگور بنا دے تو انسان اسے کھا سکتا ہے کیونکہ وہ درحقیقت انگور میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن جادوگر فقط لوگوں کی نظروں میں ان سنگریزوں کو انگور دکھا سکتے ہیں۔ وہ فقط ہمیں انگور نظر آئیں گے۔ درحقیقت سنگریزے ہوں گے اور ہم اسے نہیں کھا سکتے۔ مندرجہ بالا فرقوں سے معجزہ سحر اور نظر بندی میں فرق واضح ہو گیا ہے پس معجزہ کا تعلق ہمیشہ حق اور صداقت کو ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے جبکہ جادو گمراہی پھیلانے کے لیے ہوتا ہے۔

سبق 11

قرآن مجید اور آسمانی کتابیں

ہمارا عقیدہ ہے کہ خداوند عالم نے انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے متعدد آسمانی کتابیں نازل کی ہیں جن میں صحف ابراہیم ونوح، توریت وانجیل اور سب سے جامع ترین کتاب قرآن مجید شامل ہیں۔ اگر یہ کتابیں نازل نہ ہوتیں تو انسان خداشناشی اور خدا کی عبادت کے راستے میں غلطی کا شکار ہوجاتا اور وہ تقویٰ، تربیت اور اخلاق کے اصولوں اور ان اجتماعی قوانین سے دور ہوجاتا جن کی اسے ضرورت تھی۔

یہ آسمانی کتابیں باران رحمت کی طرح دلوں پر نازل ہوئیں، ان کتابوں نے انسان کی فطرت میں تقویٰ اخلاق معرفت اللہ اور علم وحکمت کے بیج بوئے اور ان کو پروان چڑھایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ

رسول (ص) ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہے جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر اتاری گئی ہیں اور مؤمنین بھی (سب) خدا پر اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

افسوس کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نیز جاہل اور نااہل لوگوں کی مداخلت سے بہت سی آسمانی کتابیں تحریف کا شکار ہوگئیں اور ان میں غلط نظریات کا اضافہ کردیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے محفوظ رہا ہے کیونکہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

ہم نے قرآن نازل کیا ہے۔ اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ انسان کی معنوی اور مادی زندگی کے لیے ضروری بنیادی اصول قرآن میں بیان کردیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں حکومت اور سیاسی معاملات کو چلانے، دوسرے معاشروں سے تعلقات باہمی زندگی صلح وجنگ اور عدالتی واقتصادی مسائل وغیرہ کے بنیادی اصول وضوابط بیان کردیے گئے ہیں۔

قرآن مجید کی تلاوت بہترین عبادتوں میں سے ایک عبادت ہے۔ بہت کم عبادتیں اس کی ہم پلہ ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ

پس جس قدر ممکن ہو قرآن کی تلاوت کرو۔

قرآن مجید میں غور وفکر کرنا تدبر کرنا نیک اعمال کا سرچشمہ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ

ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنایا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

قرآن مجید کی تفسیر کے لیے اصول وضوابط وضع کیے گئے ہیں۔ اگر ان اصول وضوابط کے مطابق قرآن کی تفسیر نہ کی جائے تو انسان بہت بڑی غلطی کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر کرنا ''تفسیر بالرائے'' کہلاتا ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ خداوند عالم نے فرمایا:

جو شخص میرے کلام (قرآن مجید) کی تفسیر اپنی خواہشات کے مطابق کرے وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو قرآن کی تفسیر اپنی مرضی سے کرے یا اس کے متعلق بغیر علم کے کوئی بات کہے تو وہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالے۔

لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قرآن مجید کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومینؑ کی احادیث کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔ کیونکہ یہ احادیث قرآن حقائق کی تشریح اور اصول وفروع دین کے سلسلے میں اسلام کی تعلیمات کو بیان کرتی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

وما آتاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللهَ إِنَّ اللهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ

رسول نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اسے لے لو (اس پر عمل کرو) اور جس چیز سے اس نے روکا ہے اس سے رک جاو۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑ رہا ہوں جس سے تمسک رکھو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگئے وہ کتاب اللہ اور میری عترت (یعنی اہل بیت) سے عبارت ہے۔

اگر قرآن کی تعلیمات اور اہل بیتؑ کی سیرت پر بھی توجہ دی جاتی تو مسلمانوں کے لیے ہدایت، سعادت اور سربلندی نصیب ہوتی۔

سبق12

امامت

تعریف:

حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفٰے ﷺ کے بعد اللہ تعالی کی طرف سے دین کی حفاظت اور بندوں کی ہدایت کے لئے جو منصب خدا کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے اس کو منصب امامت کہتے ہیں۔

ضرورت امام

جس طرح کہ آپ بحث نبوت میں جان چکے ہیں کہ اپنے بندوں سے اللہ کی بے پناہ محبت اور لطف کا تقاضا ہے کہ انسان بغیر ہادی و رہبر کے نہ رہے۔ اسی لیے رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد بھی انسان کی ہدایت کے لئے ہادی کا ہونا ضروری ہے۔

یہ تو ایک آسان سی بات ہے کہ جب بھیڑوں اور بکریوں کا مالک بھی چرواہے کے بغیر ان کو چرنے کے لیے نہیں بھیجتا تو یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ رب کریم و حکیم رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد ان کی امت کو بغیر کسی ہادی و رہبر کے چھوڑے؟ عقل سلیم اس بات کو تسلیم کرتی کہ رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد ایک ایسا منصب ہونا چاہیے۔ جس کے ذریعے بندوں کی ہدایت کا سلسلہ چلتا رہے۔ اور وہ منصب امامت ہے۔

ہشام ابن حکم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد کا گزر بصرہ سے ہوا وہاں کی جامع مسجد میں داخل ہوئے جہاں عمرو ابن عبید مغربی (اہلسنت عالم) لوگوں کے سوالات کے جوابات دے رہا تھا۔ ہشام نے بھی اجازت چاہی کہ میں بھی سوال کروں۔ عمرو نے کہا ٹھیک ہے بیان کرو۔

ہشام نے پوچھا: کیا تیرے پاس آنکھ ہے؟

عمرو نے جواب دیا: ہاں میرے پاس آنکھ ہے

ہشام نے پوچھا: بتا اس سے کیا کام لیتے ہو؟

عمرو نے جواب دیا: اس سے دکھائی دینے والی چیزیں دیکھتے ہوئے مختلف رنگوں میں فرق کرتا ہوں۔

ہشام نے پوچھا: کیا تیرے پاس زبان ہے؟

عمرو نے جواب دیا: جی ہاں۔

ہشام نے پوچھا: اس سے کیا کام لیتے ہو؟

عمرو نے جواب دیا: اس سے کھانے کی لذت معلوم کرتا ہوں۔ ہشام نے پوچھا: کیا تیرے پاس ناک ہے؟

عمرو نے جواب دیا: جی ہاں۔

ہشام نے پوچھا: اس سے کیا کام لیتے ہو؟

عمرو نے جواب دیا: میں اِس کی مدد سے خوشبوئیں سونگھتا ہوں۔ ہشام نے پوچھا: کیا اس کے علاوہ قلب و عقل بھی ہیں؟

عمرو نے جواب دیا: ہاں! ہیں۔

ہشام نے پوچھا: کیا کام لیتے ہو؟

عمرو نے جواب دیا: اگر میرے اعضاء وجوارح مشکوک ہو جائیں تو قلب وعقل کے ذریعے سے اس شک کو دور کرتا ہوں۔

ہشام نے اس کی تمام باتوں کی تائید کرتے ہوئے فرمایا۔ خدا نے عقل کو اعضاء وجوارح کی ہدایت کے لیے خلق فرمایا۔ اے عالم کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ خدا نے آنکھ، کان اور دیگر اعضاء بغیر ہادی کے نہیں چھوڑے اور مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بغیر ہادی اور رہبر کے چھوڑ دیا تاکہ لوگ شک وشبہ اور اختلاف کے باعث فنا ہو جائیں؟ کیا کوئی صاحب عقل اس بات کو تسلیم کرے گا؟

شرائط امامت

ا۔ عصمت

انبیاء کرام کی طرح امام کا بھی معصوم عن الخطاء ہونا ضروری ہے۔ عصمت ایک نفسانی کیفیت ہے جس کے ہوتے ہوئے گناہ کبیرہ تو در کنار معصوم گناہ صغیرہ کا بھی ارادہ نہیں کرتا۔ عصمت امامت کی بنیادی شرائط میں سے ہے۔ امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ معصوم ہو۔ کیونکہ اگر امام معصوم نہ ہو تو دو خرابیاں لازم آتی ہیں۔

ایک یہ کہ عوام کا اعتماد ختم ہو جائے گا۔ جب رہبر غلطیوں اور نسیان کا شکار ہو جائے گا تو عوام اس کی بات کو درست نہیں سمجھیں گی۔ کیونکہ ان کے ذہنوں میں آئے گا کہ ہوسکتا ہے کہ غلطی کر رہے ہو یا نسیان ہو گیا ہو لہٰذا بات کی قدر و قیمت ختم ہو جائے گی۔ دوسری خرابی یہ لازم آئی گی جب رہبر کسی امر کا حکم دے اور پھر بعد میں خود اس امر کی خلاف ورزی کر دے تو عوام ہرگز اس کے حکم کو قبول نہیں کرے گی۔ مثلاً ڈاکٹر کہتا ہے کہ سگریٹ مت پیو۔ صحت کے لیے مضر

ہے۔جبکہ خود مجمع عام میں سگریٹ پیتا ہوا نظر آتا ہے۔توعوام اس کی بات کو اہمیت نہیں دے گی۔اگر امام جو دین و دنیا کا رہبر ہے گناہگار ہو تو پھر مقصد امامت فوت ہو جائے گا جو انسانوں کی ہدایت کے لیے بنایا گیا تھا۔لہٰذا امام کا معصوم ہونا ضروری ہے۔

۲۔منصوص من اللہ

جس طرح آپ نبوت کی بحث میں پڑھ چکے ہیں کہ نبی منصوص من اللہ ہوتا ہے اسی طرح امام کا بھی منصوص من اللہ ہونا ضروری ہے۔منصب نبوت ہو یا امامت اس کو منتخب کرنا اللہ کا کام ہے۔ہمارا یہ مسلم عقیدہ ہے کہ امام کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے منتخب ہونا ضروری ہے۔

باقی رہی ووٹوں کی بات کہ اکثریت جس کو امام منتخب کر دیں وہی رہبر ہے، یہ نظریہ عقلاً باطل ہے کیونکہ جو اکثریت اس کو امام بنا رہی ہے اس کی امامت بھی انہیں کے لیے ہوگی کیونکہ باقی افراد تو اس کو قبول نہیں کر رہے ہیں۔یہ کیسے ممکن ہے کہ دین کی ہدایت کچھ لوگوں کے لیے ہو اور کچھ کے لیے نہ ہو؟ دوسری بات جب ۲۵۰ افراد میں سے ۱۲۶ افراد ایک کو اپنا رہبر منتخب کریں جبکہ ۱۲۴ افراد اپنا رہبر قبول نہیں کر رہے ہیں۔تو کیا ۱۲۶ افراد کی پسند کو ۱۲۴ افراد پر تھوپنا ڈیکٹیٹر شپ نہیں ہے؟!

جو شخص ووٹوں کے ذریعے رہبر بنتا ہے تو جنہوں نے اس کو ووٹ دیئے ہیں ان کی خوشنودی کے بارے میں سوچتا ہے جبکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک دین کا رہبر اللہ کی خوشنودی کو چھوڑ کر لوگوں کی خوشنودی کے مطابق کام کرے؟ لہٰذا یہ نظریہ باطل ہے۔ضروری ہے کہ وہ نمائندہ الٰہی ہو، اللہ کی طرف سے ہو اور پوری جہاں کا ہادی ہو فقط کسی ایک گروہ کے لیے نہ ہو بلکہ پوری امت کے لیے ہو۔

یہاں بھی سوال اٹھ سکتا ہے کہ کیا یہ ڈکٹیٹر شپ نہیں کہ ایک بندے کو تمام لوگوں کے لیے رہبر کے طور پر منتخب کر دیا جائے۔اور پھر اس کی امامت کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا جائے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام بندوں کا حاکم ہے تو اللہ اپنے بندوں پر حکم نافذ کرنے کا حق رکھتا ہے لہٰذا وہ نمائندہ الٰہی ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو پہنچانے کا محتاج ہوگا جبکہ اس کی اپنی طرف سے کوئی رائے نہیں ہوگی چونکہ امام معصوم ہوتا ہے لہٰذا اس میں کسی قسم کی غلطی کا بھی شبہ نہیں ہے۔کیونکہ امام کا انتخاب اللہ کی طرف سے ہونا عقل و نقل کی رو سے ثابت ہے۔

۳۔عالم علم لدنی

تیسری صفت امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ عالم علم لدنی ہو یعنی امام کو علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست عطا ہو کیونکہ اگر امام علم نہ رکھتا ہو تو ہدایت کا کام سرانجام نہیں دے سکتا لیکن اگر دنیا میں آ کر عام لوگوں کی طرح اسکولوں میں تعلیم حاصل کریں تو پھر جو اس کو تعلیم دے رہا ہے وہ زیادہ حقدار امامت ہوگا لہٰذا یہ سلسلہ رکے گا نہیں کیونکہ اس کو بھی کسی نے تعلیم دی ہوگی۔اس طرح یہ سلسلہ برقرار رہے گا۔لہٰذا امام کا عالم علم لدنی ہونا ضروری ہے۔

سبق13

محبت اہل بیتؑ

ہمارا عقیدہ ہے کہ اہل بیتؑ کی محبت ہر شخص پر واجب ہے۔قرآن مجید میں بڑے واضح انداز میں تمام مسلمانوں پر اہل بیتؑ سے محبت کرنا واجب قرار دیا گیا ہے کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم خدا ہوا:

قُل لا اسئلکُمۡ عَلَیۡہِ أَجۡرًا إِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِي الۡقُرۡبِي

کہہ دیجیے کہ میں تم سے اس تبلیغ رسالت پر کوئی اجر نہیں مانگتا مگر یہ کہ تم میرے اقرباء سے محبت کرو۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے بھی انبیاء کرام نے احکام الٰہی کی تبلیغ کی۔انہوں نے یہی کہا کہ ہمارا اجر خدا کے ذمے ہے۔لیکن رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کا یہ حکم ہوا کہ تم لوگوں سے اپنی تبلیغ کا اجر مانگو، اور وہ اجر محبت اہل بیتؑ ہے۔پس اہل بیتؑ سے محبت کرنا اجر رسالت ہے اور واجب ہے۔جب یہی آیت مودت فی القربی نازل ہوئی ہے اور صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ کون سے آپ کے رشتہ دار ہیں کہ جن کی محبت ہم پر واجب ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ حضرت علی، جناب فاطمہ (س) اور ان کے بیٹے ہیں۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اہل بیت سے بہت محبت کیا کرتے تھے۔سوال یہ ہے کہ خداوند کریم نے ہم پر محبت اہل بیت کو کیوں واجب قرار دیا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اہل بیتؑ ہماری محبت کے محتاج نہیں ہیں۔بلکہ ہم اہل البیت کی محبت کے محتاج ہیں۔کیونکہ محبت کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، کم سے کم محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ جس سے محبت کرتے ہیں اس کی باتوں کو بھی مانتے ہو، اس کو کبھی ناراض نہیں ہونے دیتے۔پس جب ہم اہل بیتؑ سے سچی محبت رکھتے ہوں گے تو ان کے فرامین پر عمل کریں گے۔اس طرح اہل بیتؑ کے فرامین پر عمل کر کے ہم نجات پائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اہل بیتؑ کو اولوالامر کہا گیا ہے اور اولی الامر کی اطاعت کرنا واجب ہوتی ہے۔ارشاد خداوندی ہے:

یَآأَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا أَطِیعُوا اللهِ وَأَطِیعُوا الرَّسُوۡلَ وَأُولِي الۡأَمۡرِ مِنکُمۡ اے ایمان والو اللہ کی اللہ کے رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

پس ہم محبت اہل بیتؑ سے ہی نجات حاصل کر سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَنۡ مَاتَ عَلٰی حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَھِیدًا کہ جو اہل بیت کی محبت پر مرا وہ شہادت کی موت مرا۔

اور اگر کوئی شخص اہل بیتؑ سے دشمنی رکھے گا تو اس کی نجات ممکن نہیں۔

جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَنۡ مَاتَ عَلٰی بُغۡضِ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ کَافِراً جو اہل بیت کی دشمنی پر مرا وہ کفر کی موت مرا۔

اور اسی طرح فرماتے ہیں: مَنۡ مَاتَ عَلَی بَعۡضِ آلِ مُحَمَّدٍ لَمۡ یَشُمۡ رَائِحَۃَ الۡجَنَّۃَ جو اہل بیت کی دشمنی پر مرے گا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھ سکے گا۔

جیسا کہ یہ بات واضح اور روشن ہے کہ دعویٰ محبت کی سچائی کا معیار یہ ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کی کتنی بات مانتا ہے۔ وگرنہ ہمارے آئمہ اہل بیتؑ سے تو کافر بھی محبت کرتے ہیں، بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ فقط محبت کرتے ہیں کہ جس میں وہ آئمہؑ کی بات پر عمل نہیں کرتے، لہٰذا ان کی محبت کھوکھلی ہے اور اگر ہمیں اپنی محبت کو ثابت کرنا ہے تو ہمیں اپنے اماموںؑ کی اطاعت کرنی چاہیے۔ ہمارے آئمہؑ نے ہمیں نادان شخص جیسی محبت سے روکا ہے کہ جو اپنے آئمہؑ موحد عبودیت سے بڑھا کر ان کو ربوبیت و معبودیت کے مقام تک لے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے آئمہؑ خدا کی مخلوق ہیں۔

اس طرح اپنے اماموں میں سے کسی کو نبی کہنا بھی غلط ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ ''میں محمدؐ کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں''۔ آئمہؑ کی محبت و معرفت ہمیں خدا کی اطاعت کرنے سے بے نیاز نہیں کرتی۔ چونکہ خود ہمارے آئمہؑ ہمیں اطاعت خداوندی کا حکم دیتے ہیں۔

حضرت علی فرماتے ہیں: ''میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہو جائیں گے حالانکہ اس پر ہمارا کوئی قصور نہیں ہوگا۔ ایک محبت میں حد سے بڑھ جانے والا اور دوسرا دشمنی میں حد کر دینے والا اور وہ لوگ جو ہمیں حد سے بڑھاتے ہیں ہم ان سے اس طرح بیزار ہیں جس طرح حضرت عیسیٰ قوم نصاریٰ سے بیزار تھے (جو حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے)۔

حضرت امام زمانہ علیہ السلام کی غیبت صغریٰ کی کے زمانے میں ان کے نائب خاص محمد بن عثمانؓ کے جواب میں حضرتؑ نے فرمایا:

خداوند کریم نے ہی جسموں کو پیدا کیا اور اس نے ہی ان کا رزق تقسیم کیا۔ کیونکہ نہ تو وہ جسم ہے اور نہ ہی کسی جسم میں حلول کرتا ہے۔ تحقیق وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ آئمہؑ اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں پس وہ خلق فرماتا ہے، اور جب وہ سوال کرتے ہیں تو خدا رزق عطا فرماتا ہے، اور خدا ان کے سوال کو پورا کرتے ہوئے ان کے شان و شوکت اور عظمت کو بڑھاتے ہوئے ان کے سوال کو مسترد نہیں فرماتا۔

سبق 14

عقیدہ توسل

وسیلہ اور توسل کا مطلب یہ ہے کہ جس کے ذریعے کسی دوسری چیز تک پہنچا جائے۔ وسیلہ بنانا اور توسل کرنا ایک اسلامی عقیدہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان مشکلات میں گر جائے تو اولیاء اللہ اور خدا کے مقرب بندوں کا دامن پکڑ لیتا ہے تا کہ وہ خدا کی اجازت سے ان لوگوں کی مشکلات حل کروائیں۔ اسی طرح گناہ گار انسان بھی معصوم افراد کو وسیلہ اور واسطہ قرار دیتا ہے تا کہ خدا ان معصوم ہستیوں کے صدقے ان کے گناہ معاف کرے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهِ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ جَاهِدُوا فِي سَبِيْلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہنا اور خدا کے قرب کے لیے وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں کوشش کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاو۔

پس اس آیت میں واضح طور پر ایمان والوں کو وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اگر توسل کرنا، وسیلہ بنانا غیر شرعی اور غیر اسلامی فعل ہو تو قرآن مجید میں اس کا حکم کیوں دیا جاتا ہے؟ اس طرح مسند احمد، صحیح بخاری و دیگر کتب اہل سنت میں یہ معتبر حدیث موجود ہے کہ آپ نے فرمایا جو شخص اذان سنے اور اس کے بعد اذان والی دعا پڑھے جس میں ہے:

آتِ مُحَمّداً الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ جَلَّتْ لَهٗ شَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ

محمد کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما۔ تو اس کے لیے قیامت کے دن میری شفاعت ہو گی۔

اس حدیث میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ جو کوئی آپ ﷺ کے وسیلہ کی دعا کرے تو اسے آپ کی شفاعت نصیب ہو گی۔

اسی طرح حضرت عمر کی یہ دعا مشہور ہے کہ جب رسول خدا ﷺ کی زندگی میں قحط ہو جاتا تو صحابہ کرامؓ آپؐ کے پاس آتے تھے اور آپؐ دعا فرماتے تو بارش ہو جاتی۔ اسی طرح آپؐ کی وفات کے بعد قحط پڑا۔ تو حضرت عمر

نے اس طرح دعا کی: اے اللہ جب ہم نے تیرے نبی کے ذریعے توسل کیا۔ تو تو نے ہمیں بارش سے سیراب کیا۔
حضرت عمر کی اس دعا سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ نہ فقط حضرت کی ذات اقدس سے توسل جائز ہے بلکہ آپؐ کے رشتہ داروں اور اقرباء سے بھی توسل کرنا جائز ہے۔

عیون اخبار رضاؑ میں روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: آئمہؑ دین کی مضبوط رسی ہیں اور اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ روایات کے علاوہ قرآن مجید میں بہت سارے مقامات پر ہمیں توسل کے نمونے نظر آتے ہیں۔ جن میں سے چند ایک نمونے ذکر کرتے ہیں: وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا اور جب انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا (اور گناہ کا ارتکاب کیا) اس وقت اگر وہ تیرے پاس آتے اور خدا سے استغفار طلب کرتے اور رسول خدا بھی ان کے لیے مغفرت طلب کرتے تو وہ خدا کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر وہ گناہگار لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر یعنی رسول سے توسل کر کے توبہ کرتے تو پھر خدا ان کی توبہ قبول کرتا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے واقعہ میں دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے باپ کو وسیلہ بنایا اور کہا:

قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ

اے ہمارے بابا جان! ہمارے لیے خدا سے مغفرت طلب کریں کیونکہ ہم خطا کار ہیں۔

ان کے بوڑھے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے فرمایا: قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي میں تمہارے لیے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کروں گا۔

یہ آیت اس بات پر شاہد ہے کہ گزشتہ امتوں میں بھی توسل کا عقیدہ پایا جاتا تھا۔

توسل میں فقط آئمہؑ کی رہنمائی کے مطابق چلنا چاہیے۔ اور انہیں خدا کی اجازت کے بغیر مستقل طور پر مؤثر نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ خدا کی اجازت اور اذن کے بغیر وہ کسی فائدے اور نفع کے مالک نہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللهُ

اے رسول کہہ دو! میں اپنے لیے کسی قسم کے نفع ونقصان کا مالک نہیں مگر یہ کہ جو خدا چاہے۔

پس آئمہ مشکلات کو خدا کی اجازت واذن سے حل کرتے ہیں۔

سبق15

شفاعت

دوستو! ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی لمحہ مایوسی کا ضرور آتا ہے۔لیکن اسلام میں مایوسی کو کفر قرار دیا گیا ہے یعنی جب ایک گناہگار انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ بس میں تو بہت زیادہ گناہگار ہوں اور اب نیکیاں کریں بھی تو کیا فائدہ؟ تو اس طرح وہ مزید کھلم کھلا گناہ کرتا ہے اور کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے لیکن اسلام میں شفاعت کا عقیدہ ہے کہ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جن سے گناہ سرزد ہوگئے ہوں وہ پریشان اور مایوس نہ ہوں بلکہ مکمل اعتماد کے ساتھ اپنی زندگی کا دوبارہ آغاز کریں۔ چونکہ قیامت کے روز خدا کی مقرب ہستیاں گناہگاروں کی شفاعت اور سفارش کریں گی۔ کچھ ذوات مقدسہ ایسی ہیں جو بروز قیامت خداوند متعال کی بارگاہ میں صحیح العقیدہ گناہگاروں کی شفاعت وسفارش کر کے انہیں عذاب خداوندی سے نجات دلائیں گی۔مگر یہ شفاعت خدا کی اجازت سے ہوگی۔اس دن فقط اسی شخص کی شفاعت ہوسکے گی کہ جس کی خدا تعالی شفاعت وسفارش کا اذن دے۔یہی بات ہمیں قرآن کریم کی درج ذیل آیات سے سمجھ میں آتی ہیں۔

مَنْ ذَا الَّذِی یَشْفَعُ عِندَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ

کوئی ہے جو خدا کے اذن کے بغیر سفارش کرے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

وَلَا یَشْفَعُونَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضَی

یعنی یہ بزرگ ہستیاں فقط اس شخص کی شفاعت کریں گے جس کے متعلق خدا چاہے گا۔

شفاعت فقط ان لوگوں کی ہوگی جن میں درج ذیل شرائط ہوں گی۔

۱۔صحیح العقیدہ ہو، یعنی اس شخص کا ایمان صحیح ہو۔

۲۔نماز چھوڑنے والا نہ ہو۔

بلکہ امام صادقؑ نے فرمایا:

لَا تَنَالُ شَفَاعَتُنَا مَنِ اسْتَخَفَّ الصَّلٰوۃ

جو نماز کو ہلکا سمجھتا ہے اسے ہماری شفاعت نصیب نہیں ہوگی۔

اس حدیث کے مطابق نماز کو ہلکا بھی نہ سمجھتا ہو۔

۳۔ زکوۃ دیتا ہو۔

۴۔ حج چھوڑنے والا نہ ہو۔

۵- ظالم نہ ہو کیونکہ ظالم لوگوں کے لیے کوئی مہربان اور سفارش کرنے والا نہیں ہوگا۔

۶- معاشرہ میں محروم لوگوں کی طرف توجہ دیتا ہو۔

پس جو شخص مکمل کوشش کرتا ہو کہ خدا کی اطاعت کرے لیکن شیطان اور نفس امارہ کی وجہ سے گناہ کر بیٹھے تو آئمہؑ اور خدا کی مقرب ہستیاں اس کی شفاعت کریں گی۔ اور ان شاء اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے اہل بیت ہماری شفاعت کریں گے۔

اس کے علاوہ شہدا علماء دین، اور خالص مؤمنین کرام بھی کچھ لوگوں کی شفاعت کر سکیں گے۔ لہٰذا جب یہ ہستیاں شفاعت کریں گی تو انسان کوشش کرتا ہے کہ ان ہستیوں سے معنوی رابطہ قائم رکھے، ان سے محبت کرے اور ان کی باتوں پر عمل کرے۔

عقیدہ شفاعت کی وجہ سے ہمارے دلوں میں آئمہ اہل بیتؑ اور علماء دین اور شہداء سے محبت بڑھتی ہے۔

سبق 16

مہدویت

تاریخ مذاہب عالم کا مطالعہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہب یہود ہو یا نصاریٰ ہو یا ہندو یا زرتشت غرض یہ کہ تمام مذاہب وادیان میں کسی نہ کسی شکل میں ایک عظیم مصلح کے آنے کا نظریہ موجود ہے۔ خصوصاً اہل اسلام کا حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور کے عقیدہ پر اتفاق ہے کہ قیامت سے پہلے جب دنیا ظلم وستم سے بھر جائے گی تو حضرت مہدی علیہ السلام ظہور فرمائیں گے اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ جس مذہب کی بنیاد خدا کی قدرت اور عدالت پر ہے اس پر ایک ایسا وقت دنیا میں آنا چاہیے کہ جب ظالموں ستم گروں اور باطل پرستوں کا قتل عام کیا جائے اور باطل کو صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے اور عدل وانصاف کا دور دورہ ہو اور یہ مقصد ظہور امام زمانہؑ ہی سے کما حقہ پورا ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اگر عمر دنیا کا فقط ایک ہی دن رہ جائے تو خدوندعالم اسے اس قدر لمبا کردے گا کہ میرے اہل بیت میں سے ایک شخص قیام کرے گا جو میرا ہم نام ہوگا جو زمین کو عدل و انصاف سے اس طرح بھر دے گا جس طرح وہ پہلے ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔

دنیا کو ہے اس مہدی ؑ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلہ عالم افکار

ہر زمانے میں حجت خدا کا ہونا ضروری ہے

اللہ تعالیٰ نے موجودہ عالم کو ایسے قانون اور نظام کے تحت بنایا ہے کہ اس کی ہر چیز علل واسباب کی پابند ہے صحت و مرض موت و حیات، فقر و امیری میں یہی قانون جاری ہے کہ ہر چیز اپنے مخصوص علت اور سبب کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ اور یہ سلسلہ تمام مادیات و غیر مادیات کو شامل ہے۔ لہٰذا اس سنت کے تحت خدائے حکیم نے اس عالم کی بقاء کی خاطر اپنی حجت (یعنی نبی اور امام) کے وجود کے ساتھ منحصر کر دیا ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی حجت خدا زمین سے اٹھ جائے تو نظام کائنات درہم برہم ہوجائے۔

اس طرح کی متعدد روایات اس مطلب پر شاہد ہیں جیسا کہ اصول کافی میں حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے حدیث منقول ہے کہ اگر حجت خدا کا وجود نہ ہو تو دنیا اپنے اہل سمیت دھنس جائے۔ اسی طرح آپ کا فرمان ہے: میرے اہل بیت زمین والوں کو ہلاکت سے بچانے کا سبب ہیں جس طرح ستارے اہل آسمان کے لیے باعث امان ہیں۔

اسی طرح صادق آل محمد فرماتے ہیں:

اگر بالفرض تمام روئے زمین پر صرف دو ہی شخص رہ جائیں تو ان میں ضرور ایک حجت خدا ہوگا کیونکہ حجت خدا کے بغیر کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا۔ حجت خدا کا وجود مخلوق سے قبل مخلوق کے ساتھ اور مخلوق کے بعد ہونا ضروری ہے۔

اور بالاتفاق وہ بابرکت ہستی جناب حضرت مہدی دوراں صاحب العصر والزمان عجل اللہ فرجہ الشریف کی ہے اور کوئی نہیں ہے۔ جس طرح کہ حدیث میں وارد ہے اس کے صدقے سے ہی رزق مل رہا ہے۔

اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ امام نظر کیوں نہیں آتے؟ تو جواب یہ ہوگا کہ ہر موجود چیز کے لیے نظر آنا ضروری نہیں ہے۔ خدا نظر نہیں آتا کیا توحید کا انکار کردیں؟ نہیں بلکہ غیب پر تو ایمان رکھنا متقیوں کی علامت ہے۔ اسی طرح انسان اپنی عقل نہیں دیکھ سکتا مگر اسے یقین ہے کہ اللہ نے اسے عقل کی نعمت عطا کی ہے۔ ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔

اسی طرح یہ سوال بھی ہوسکتا ہے کہ جب امام غائب ہیں تو ان کے وجود کا کیا فائدہ؟ سوال کا بہت ہی سادہ

جواب ہے کہ امام کے وجود کا فائدہ فقط یہ نہیں کہ وہ دینی مسائل کو بیان کریں۔ بلکہ امام کے وجود کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انہی کے وجود اقدس سے یہ ساری کائنات باقی ہے۔اس لیے امام کا وجود بہت ضروری ہے۔

جب اعتراض کرنے والا یہ اعتراض کرتا ہے کہ امام غائب ہو کر ہماری ہدایت نہیں کر سکتے ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ ہدایت دینے والا آپ کو نظر بھی آ رہا ہو، جیسے خدا ہدایت دیتا ہے لیکن نظر نہیں آتا، اسی طرح گمراہ کرنے والے کے لیے بھی نظر آنا ضروری نہیں، جیسے شیطان گمراہ کرتا ہے اور ہمیں نظر نہیں آتا۔ پس امام مخفی اور غائب رہ کر بھی ہماری ہدایت کر سکتے ہیں۔ جب خود امام العصرؑ سے پوچھا گیا کہ آپؑ کی غیبت کے زمانہ میں آپؑ کے وجود مبارک سے لوگ کس طرح استفادہ کریں گے؟ تو امامؑ نے فرمایا: جس طرح لوگ سورج سے فائدہ حاصل کرتے ہیں جبکہ وہ بادلوں کے پیچھے غائب ہوتا ہے۔

سبق 17

رجعت

عقیدہ رجعت کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت امام زمانہ علیہ السلام ظہور فرمائیں گے تو اس وقت خداوند کریم بعض انبیاء اور اماموں اور بعض مؤمنین کو دوبارہ دنیا میں بھیجے گا۔ تا کہ آئمہؑ اور انبیاء کے قاتلوں اور ظالموں سے آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا میں بدلہ لیا جائے گا۔ اور اس عقیدہ کا اقرار کرنا ضروری اور واجب ہے اور اس کے بارے میں بہت ساری آئمہ معصومینؑ سے کافی روایات نقل کی گئی ہیں:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يُقِرْ بِرَجْعَتِنَا

جو شخص ہماری رجعت کا اقرار نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

رجعت کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ مظلوموں کو اسی دنیا میں انصاف مل جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ

الورثین اور ہم یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو اس سرزمین پر کمزور کر دیئے گئے ہیں احسان کریں ان کو پیشوا بنائیں اور وارث قرار دیں۔

تاریخ کے اوراق اس بات کے گواہ ہیں کہ جس قدر کمزور و ناتوان ہمارے آئمہ اہل بیتؑ کو سمجھا گیا ہے اتنا

کسی اور شخص کو نہیں سمجھا گیا ہے۔

پس جو خدا نے کمزور و ناتواں کو زمین کا وارث بنانے کا وعدہ کیا ہے وہ ابھی تک پورا نہیں ہوا اور خدا اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے۔ خدا کا یہ وعدہ رجعت کے ذریعے پورا ہوگا۔

قرآن میں ایک اور جگہ اللہ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ

اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ وعدہ ابھی تک پورا نہیں ہوا۔ قرآن کریم کی ایک اور آیت سے کہ جو کہ رجعت پر واضح طور پر دلالت کرتی ہے۔:

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُكَذِّبُ بِاٰيَاتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ

اور جس روز ہم امت میں سے ایک ایک جماعت کو جمع کریں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتی تھیں۔

پس قیامت کے دن تمام لوگوں کو محشور کیا جائے گا لیکن اس آیت میں خدا فرماتا ہے۔ کہ ہر امت سے ایک جماعت کو ہم محشور کریں گے پس وہ دن رجعت کا دن ہوگا۔

عقلی طور پر بھی یہ چیز ناممکن نہیں ہے کیونکہ ایک مثالی دور آئے گا کہ جب سرکار آل محمد علیہ السلام کی الٰہی سلطنت قائم ہوگی۔ اور کفر و شرک مٹ جائے گا۔ اسلام کا بول بالا ہوگا اور ایسے تمام ادیان عالم پر غلبہ ہوگا۔ اس وقت شیعیان علیؑ و موالیان آل عباؑ کی آنکھیں یہ ایمان افزاء مناظر دیکھ کر ٹھنڈی ہوں گی اور اسلام کی سربلندی کا ایک شاندار نمونہ قائم ہوگا۔ خدا کے لیے ایسا کرنا ممکن بھی ہے اور خدا کی قدرت میں یہ کام کوئی مشکل نہیں ہے۔

بہت ساری روایات موجود ہیں کہ جن میں امام حسینؑ اور امیر المؤمنینؑ کی رجعت کا کہا گیا ہے۔ لیکن رجعت کی تفصیل میں کہ کون، کون سے انبیاء آئیں گے؟، کتنے امام آئیں گے؟ کون سے مؤمنین آئیں گے؟ اور کیا نظام ہوگا؟ ان ساری تفصیلات میں اختلاف ہے۔ بس اجمالاً یہ جانا اور یہ عقیدہ رکھنا کافی ہے کہ رجعت ہوگی اور کچھ آئمہؑ اور انبیاء و مؤمنین کا دوبارہ بھیجا جائے گا۔

سبق18

قیامت

موت کے بعد تمام انسان ایک دن زندہ ہوں گے اور ان کے اعمال کا حساب ہوگا نیک اور صالح لوگ بہشت جاویداں میں جائیں گے جب کہ گناہگار اور برے لوگ دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ط

یقیناً وہ تم سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں ہے۔[1]

قیامت کے عقیدہ پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے بلکہ تمام سماوی ادیان اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ جس میں پروردگار تمام مخلوقات کو جمع کرے گا اور نیک لوگوں کو ان کی نیکیوں کی جزا اور برے لوگوں کو ان کی برائی کی سزا دے گا۔

قیامت پر عقلی دلیلیں

پہلی دلیل:

جس طرح کسی حکومت اور معاشرہ کے چلانے کے لیے اس حکومت کا بادشاہ کچھ قوانین وضع کرتا ہے اور اس کے ساتھ عدالت کا بھی انتظام کرتا ہے تاکہ لوگ قوانین کی پابندی کریں اور لوگوں کے ذہن میں اس بات کا خوف رہے کہ اگر قانون کی پابندی نہ کی تو سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اسی طرح جب ایک حکومت اور معاشرہ بغیر عدالت کے نہیں چل سکتا تو پوری دنیا بغیر قانون کے کیسے چل سکتی ہے؟ اس لیے اللہ تعالی جو حقیقی بادشاہ ہے اس نے قانون بنانے کے بعد لوگوں کو بتا دیا ہے کہ ایک دن عدالت قائم کرنی ہے جس میں اسلام کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے کو سزا اور اسلام کے قوانین کی پابندی کرنے والوں کو جزاء دی جائے گی۔

دوسری دلیل

دنیا میں ہر کسی کو انصاف نہیں ملتا یہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون ہے۔مظلوم بیچارے روتے اور

دوہائیاں دیتے ہیں۔ جبکہ ظالم دندناتے پھرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ بھی ان کے ساتھ انصاف نہ کرے تو پھر اس کو عادل کون کہے گا۔ اور مالک حقیقی کون کہے گا لہٰذا ماننا پڑے گا کہ ایک دن ضرور آئے گا جب تمام لوگوں کو انصاف ملے گا۔

قیامت قرآن مجید کی روشنی میں

قرآن کا زیادہ تر حصہ قیامت کے بارے میں ہے کیونکہ یہ قرآن ان کے سامنے اترا کہ جن کے تصور میں بھی یہ نہیں تھا کہ مرنے اور جسم کی ہڈیوں تک کے مٹی ہو جانے کے بعد پھر دوبارہ اسی دنیا میں زندہ کیا جائے گا۔ لہٰذا قرآن بار بار اس چیز کو مختلف انداز میں بیان فرماتا ہے کہ تمہیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ

اور وہی وہ ہے جو خلقت کی ابتداء کرتا ہے اور پھر دوبارہ بھی پیدا کرے گا اور یہ کام اس کے لیے بیحد آسان ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وَجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ كَمَا بَدَاكُمْ تَعُودُونَ

اس نے جس طرح تمہاری ابتدا کی ہے اسی طرح تم پلٹ کر بھی جاؤ گے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَيَقُولُ الإِنْسَانَ وَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ الحَرَج حَيًّا أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانَ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا

اور یہ انسان کہتا ہے کہ کیا ہم جب مر جائیں گئے تو دوبارہ زندہ کر کے نکالے جائیں گے کیا وہ اس بات کو یاد نہیں کرتا ہے کہ پہلے ہم نے اسے خلق کیا ہے جب یہ کچھ نہیں تھا۔

ارشاد ہوتا ہے:

فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ

عنقریب یہ لوگ کہیں گے کہ ہم کو کون دوبارہ واپس لاسکتا ہے تو کہہ دیجیے جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا ہے۔

ایک صحرائی عرب کو ایک انسان کی بوسیدہ ہڈی کا ٹکرا ملا۔ وہ اس کو لے کر دوڑتا ہوا شہر کی جانب آیا اور پیغمبر

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر چیخ کر کہنے لگا: کون اس پرانی ہڈی کو دوبارہ زندہ کون کرے گا؟ ارشاد ہوا:

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ

آپ کہہ دیجیے کہ جس نے پہلے خلق کیا ہے وہی زندہ بھی کرے گا اور وہ ہر مخلوق کو بہتر جاننے والا ہے۔[1]

مذکورہ آیات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ خداوند کریم کے لیے انسانوں کو دوبارہ پلٹانا بہت ہی آسان ہے یعنی قادر مطلق خدا کے لیے یہ ساری چیزیں بہت آسان ہیں۔ یعنی تخلیق کی ابتدا اور دوبارہ قیامت میں واپس پلٹانا ایک ہی چیز ہے۔

سبق 19

حساب و کتاب

اس سبق میں ہم قیامت کے ذیل میں چند چیزیں ذکر کریں گے۔

۱۔ حساب و کتاب

حساب کا مطلب ہے کہ ایک دن اللہ تعالی تمام انسانوں کے اعمال کا جائزہ لے گا نیک اعمال والوں کو جنت اور برے اعمال والوں کو جہنم میں ڈالے گا۔ اور ہر شخص اپنے امام زمانہ یا نبی کے ساتھ محشور ہوگا جس جس آدمی کے ایمان کی گواہی دیں گے وہ نجات پا جائیں گے اور جس کے ایمان کی گواہی نہیں دیں گے وہ جہنم چلا جائے گا۔

دو چیزوں کا حساب ہوگا ایک حقوق اللہ یعنی وہ حقوق جو اللہ کے ہیں مثلاً نماز، زکواۃ وغیرہ اور دوسرے حقوق الناس، یعنی وہ حقوق جو بندوں کے ہیں مثلاً صلہ رحمی، کے ساتھ پیش آنا، گالی نہ دینا غیبت نہ کرتا، وغیرہ اور ان تمام اعمال کی شرط قبولیت محبت اہل بیتؑ ہوگی۔ اگر محبت اہل بیتؑ ہوگی تو باقی اعمال کام آئیں گے جیسا کہ عیون اخبار رضا میں معصوم سے حدیث نقل ہے کہ سب سے پہلے ہم اہل بیتؑ کی محبت کا سوال ہوگا۔

دوسری جگہ پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کا ارشاد گرامی ہے کہ مومن کے صحیفہ اعمال کا عنوان ہی ولایت علیؑ ہوگا۔

2۔ قبر میں سوال و جواب

سوال قبر کے بارے میں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ یہ برحق ہیں اور یقیناً ہوں گے۔ جو شخص ان سوالات کا صحیح جواب دے گا اسے قبر میں راحت اور خوشی و خوشبو اور آخرت میں جنت نعیم حاصل ہوگی او جو شخص صحیح جواب نہ دے سکے

گا اس کی قبر میں آگ نازل ہوگی اور بروز محشر سے آتش جہنم میں ڈالا جائے گا (اکثر عذاب قبر کا باعث چغل خوری، بد خلقی اور نجاست کے خیال نہ رکھنے کی وجہ سے ہوتا ہے)

قبر میں پوچھے جانے والے سوال:

۱۔ مَنْ رَبُّكَ؟ تیرا رب کون ہے

۲۔ مَا دِينَكَ؟ تیرا دین کیا ہے؟

۳۔ مَنْ نَبِيُّكَ؟ تیرا نبی کون ہے؟

۴۔ من امامك؟ تیرا امام کون ہے؟

پس اگر ان چاروں سوالوں کا ٹھیک جواب دیدے گا تو اس کے لیے راحت وسکون ہوگا اگر جواب نہ دے سکا تو عذاب ہوگا۔

۳۔ برزخ

موت کے بعد قیامت تک کی زندگی کا جو درمیانی زمانہ ہے وہ برزخ ہے۔ یہ عالم برزخ والا مرحلہ بہت سخت ہے آئمہ طاہرینؑ نے اس کے مصائب وشدائد سے نجات حاصل کرنے کے لیے اعمال صالحہ جمع کرنے کی تاکید کی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

بخدا مجھے تمہارے متعلق جس چیز پر خوف ہے وہ عالم برزخ ہی کے متعلق ہے۔ لیکن جب قیامت کا دن ہوگا اور معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوگا تو اس وقت ہم تمہاری شفاعت کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔

۴۔ اعراف

شیخ صدوقؒ نے اعراف کو یوں بیان کیا ہے کہ: ''وہ جنت اور جہنم کے درمیان ایک دیوار ہے جس پر چند مقدس بزرگوار تشریف فرما ہوں گے جو ہر شخص کو اس کی نشانیوں سے پہچان لیں گے اور یہ حضرات جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اوصیاء برحق ہوں گے۔

جنت میں وہی شخص داخل ہوگا جس کو یہ بزرگوار پہچانتے ہوں گے اور وہ انہیں پہچانتا ہوگا۔ اور جہنم میں وہی لوگ جائیں گے جو ان کی معرفت نہیں رکھتے اور نہ یہ بزرگوار ان سے واقف ہوں گئے''۔

۵۔ پُل صراط

صراط اس پل کا نام ہے جو بروز قیامت دوزخ کے اوپر قائم کی جائے گی جس کا ایک سرا میدان محشر میں اور

دوسرا اسرا جنت کے ساتھ ملا ہوا ہوگا جو بال سے زیادہ باریک اورتلوار سے زیادہ تیز ہوگی۔ ہر نیک و بد کو اسے عبور کرنا پڑے گا۔اہل ایمان کے لیے کشادہ ہوجائے گی۔

۶۔حوض کوثر

پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حوض کوثر کے اوصاف یوں بیان فرمائے کہ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا اور گھی سے زیادہ نرم ہوگا اور اس کے کنکر زبرجد، یاقوت اور مرجان ہیں اور اس کا گھاس زعفران اور مٹی مشک اذفر ہے۔آپ نے اپنا دست مبارک جناب امیر المؤمنینؑ کے پہلو پر رکھا اور فرمایا یا علیؑ! یہ نہر مجھ سے اور تم سے محبت کرنے والوں کے لیے ہے۔ یہ حوض خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے اس پر آسمان سے ستاروں کے برابر کوزے رکھے ہوئے ہیں۔ بروز قیامت حضرت علیؑ اس کے ساقی ہوں گے آنجنابؑ اپنے شیعوں اور دوستوں کو سیراب کریں گے اور اپنے دشمنوں کو اس سے دور ہٹائیں گے۔ جو شخص اس کے پانی کا ایک گھونٹ پیے گا اسے کبھی پیاس نہ لگے گی۔

قرآنیات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سبق 1

قرآن مجید کا تعارف

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام اور انسانیت کی حدیث کے لیے اس طرف سے آخری کتاب ہے۔ اس عظیم اور مقدس کتاب کو عربی زبان میں نازل کیا گیا۔ یہ کائنات کی وہ واحد کتاب ہے کہ جسے دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ جب قرآن مجید پڑھا جارہا ہو تو سامعین پر اس کا سننا واجب ہوجاتا ہے۔

وَاِذَا قُرِئَ الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ وَاَنۡصِتُوۡا لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۲۰۴﴾

اور جب قرآن پڑھا جائے تو پوری توجہ کے ساتھ اسے سنا کرو اور خاموش رہا کرو شاید تم پر رحم کیا جائے۔[۱]

یہ اعزاز بھی صرف اسی کو حاصل ہے کہ اس کو صرف پاکیزہ لوگ ہی چھو سکتے ہیں

وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عَظِيۡمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌ ﴿۷۷﴾ فِىۡ كِتٰبٍ مَّكۡنُوۡنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ ﴿۷۹﴾

اور اگر تم سمجھو تو یہ یقیناً بہت بڑی قسم ہے کہ یہ قرآن بڑی تکریم والا ہے، جو ایک محفوظ کتاب میں ہے، جسے صرف پاکیزہ لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔[۲]

خداوند متعال نے اپنی آخری آسمانی کتاب ''قرآن مجید'' میں کچھ ایسی خاص اور شیرینی رکھی ہے کہ مسلسل اس کو تلاوت کرنے کے باوجود بھی اس سے انسان تھکتا ہے نہ اکتاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی عمر بھر بھی اس کو پڑھتا رہے تو اس کے اندر ذرہ برابر بھی اکتاہٹ و بیزاری کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔

قرآن مجید قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہدایت اور سعادت کی کتاب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ''یاایھا الناس'' کے لفظ سے تمام انسانوں کو مخاطب کیا گیا ہے بلکہ بعض اوقات تو ''الناس'' سے بھی جامع ترین لفظ ''العالمین'' استعمال کیا ہے۔ قرآن مجید عالمین کے لیے ذکر ہے اور خداوند عالم نے اسے عالمین کے لیے نازل فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۷۱﴾

یہ تو (قرآن خدا کی طرف سے) عالمین کے لیے تذکرہ اور موعظہ ہے۔

للہ تعالیٰ نے اپنی یہ مقدس کتاب حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے اپنے پیارے نبی سید المرسلین صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر ۲۳ سال کے عرصے میں نازل کی ۔ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب تیس پاروں پر مشتمل ہے اس میں ۱۱۴ سورتیں ۶۲۳۶ آیات اور ۳۲۳۶۷۱ حروف ہیں کل ۱۱۴ سورتوں میں چھیاسی ۸۶ مکی (یعنی مکہ میں نازل ہونے والی سورتیں) ہیں ۔جبکہ ۲۸ مدنی (یعنی مدینہ میں نازل ہونے والی سورتیں) ہیں ۔

قرآن مجید کی تمام سورتوں میں سے یہ امتیاز صرف سورہ حمد کو حاصل ہے کہ نبی مرسل صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر اس کو دوبار نازل کیا گیا۔ایک بار مکہ میں جبکہ دوسری بار مدینہ منورہ میں ۔قرآن مجید کی کل سات قرائتیں ہیں ۔اور سات ہی منزلیں ہیں ۔قرآن مجید کے نکتے لگانے کا کام ۸۶ھ میں حضرت علی علیہ اسلام کے شاگرد ابواسود دوئلی نے انجام دیا ۔مجموعی تور پر قرآن مجید میں دو طرح کی آیات موجود ہیں ۔محکم اور متشابہ ،محکم آیات کی تعداد متشابہ کے مکابلے میں زیادہ ہے ۔اور انہیں ''ام الکتاب'' کا نام دیا گیا ہے ۔

هُوَالَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ

وہی ذات ہے جس نے آپ پر وہ کتاب نازل فرمائی جس کی بعض آیات محکم (واضح) ہیں وہی اصل کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں

۔کتاب مقدس کی آیات سمجھنے کے لیے متعدد تفاسیر لکھی گئی ہیں ۔قرآن مجید کی آیات کی تفسیر کرنے کے مختلف طریقے ہیں ۔جن میں سے بہترین طریقہ ''تفسیر القرآن بالقرآن'' یعنی قرآنی آیات کے ذریعے قرآن کی تفسیر کرنا ہے ۔للہ تعالیٰ کی اس مقدس کتاب کے ایک سے زیادہ نام خود قرآن مجید میں ذکر ہوئے ہیں ۔(ہدی،قرآن، عظیم ،مبین، رحمت، شفا، کتاب، ذکر، فرمان، حکیم، مجید، تبیان، عزیز، امام اور نور)

قرآن مجید کا سب سے بڑا سورہ ''سورہ بقرہ'' ہے اور سب سے بڑی آیت ''سورہ بقرہ'' کی آیت نمبر ۲۸۲ ہے ۔جبکہ سب سے چھوٹا سورہ ''سورہ کوثر'' ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے پسندیدہ اور ناپسندیدہ دونوں طرح کے لوگوں کا ذکر کیا ہے ۔اپنے نیک اور پسندیدہ لوگوں کے لیے جنت کی خوش خبری سنائی ہے جبکہ برے کرداروں کے لیے جہنم کی بدترین اور خوفناک سزا سنائی ہے ۔

سبق2

فضائل قرآن

فضائل قرآن بزبان قرآن

قرآن مجید خداوندمتعال کی طرف سے نازل کی گئی آخری الہامی کتاب ہے اور اس کو باقی تمام آسمانی کتابوں پرفوقیت حاصل ہے۔جتنی بھی آسمانی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے وہ قرآن مجید کے مرتبے کو ہرگزنہیں پہنچ سکتے ۔آیئے قرآن کے فضائل کوقرآن مجید ہی سے جانتے ہیں۔

نور

يَآَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

اے اہل کتاب ہمارے رسول تمہارے پاس کتاب (خدا) کی وہ بہت سی باتیں تمہارے لیےکھول کر بیان کرنے کے لیے آئے ہیں جن پر تم پردہ ڈالتے رہے ہواور بہت سی باتوں سے درگزربھی کرتے ہیں۔بتحقیق تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نوراورروشن کتاب آچکی ہے جس کے ذریعے اللہ ان لوگوں کوامن وسلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی رضا کے طالب ہیں اوراپنے اذن سے انہیں ظلمتوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اورانہیں راہ راست کی رہنمائی فرماتا ہے۔

کتاب ہدایت

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کوگمراہ انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ہر بھٹکے ہوئے فردکواس کی منزل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یہ قرآن یقیناً اس راہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھی ہے اوران مؤمنین کو جونیک اعمال بجالاتے ہیں یہ بشارت دیتاہے کہ ان کے لیے بڑااجر ہے

شفا

قرآن حکیم ہرطرح کے روحانی نقائص اوردل کی تمام بیماریوں کے لیے باعث شفاہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوۡرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ۝۵۷

اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ قرآن تمہارے پاس نصیحت اور تمہارے دلوں کی بیماری کے لیے شفا اور مؤمنین کے لیے ہدایت ورحمت بن کر آیا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۙ وَلَا يَزِيۡدُ الظّٰلِمِيۡنَ اِلَّا خَسَارًا۝۸۲

اور ہم قرآن میں سے ایسی چیز نازل کرتے جو مؤمنین کے لیے شفا اور رحمت ہے۔

باعظمت کتاب

ارشاد قدرت ہے: اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌ۝۷۷ فِىۡ كِتٰبٍ مَّكۡنُوۡنٍ۝۷۸ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ۝۷۹

اور اگر تم سمجھو تو یہ یقیناً بہت بڑی قسم ہے کہ یہ قرآن بڑی تکریم والا ہے، جو ایک محفوظ کتاب میں ہے، جسے صرف پاکیزہ لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ (سورۃ الواقعہ)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اسے اللہ کے خوف سے جھک کر پاش پاش ہوتا ضرور دیکھتے۔

فضائل قرآن بزبان معصومینؑ

ظاہری بات ہے کہ جس گھرانے پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے ان کے علاوہ اور کون ہے جو اس کے فضائل اور حقیقی مقام سے آگاہ ہو۔ اس گھرانے نے جس انداز سے قرآن مجید کے احکامات پر عمل کیا اور اس کی تلاوت کی ہے اس انداز سے بھلا کون قرآن مجید کا حق ادا کر پائے گا۔ فضائل قرآن سے متعلق پیغمبر گرامیؐ اور آئمہ معصومینؑ سے بہت زیادہ احادیث وارد ہوئی ہیں۔ جن میں سے کچھ ہم یہاں بیان کررہے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

فضل القرآن علیٰ سائر الکلام کفضل اللہ علی خلقه

یعنی قرآن مجید کو باقی تمام کتابوں پر وہی فضیلت حاصل ہے جو اللہ کی ذات کو تمام مخلوقات پر ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: یاد رکھو! (فہم وادراک) قرآن مل جانے کے بعد کوئی فاقہ سے نہیں رہ سکتا۔ اور قرآن سے پہلے مستغنی ہوجانا ناممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے ذریعے اپنی بیماریوں کا علاج کرو اور سختیوں میں اس سے مدد حاصل کرو کیونکہ اس میں سب سے بڑی بیماریوں کی شفا ہے اور وہ یہ ہیں ''کفر، نفاق، بغاوت اور گمراہی''۔

انّ القلوب تصدأ کما یصدأ الحدید، فقیل یارسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم

وما جلائوھا ؟فقال: تلاوۃ القرآن وذکر الموت

یعنی دل بھی اسی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ کہا گیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم !اس کو صاف کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: قرآن کی تلاوت اور موت کو یاد رکھنا۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: **اذا احب احد کم ان یحدث ربہ فلیقر أالقرآن** تم میں سے جب کوئی شخص اپنے رب سے بات کرنا چاہے وہ قرآن مجید کی تلاوت کرلیا کرے۔

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے: **من انس بتلاوۃ القرآن لن تو حشہ مفار قۃ الاخوان** جو شخص تلاوت قرآن سے مانوس ہوجائے اسے دوستوں کی جدائی وحشت زدہ نہیں کرتی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے: تم ضرور بہ ضرور قرآن کی تلاوت کیا کرو چونکہ جنت کے درجات قرآنی آیات کے درجات کے برابر ہیں جب قیامت کا دن ہوگا تو قرآن کی تلاوت کرنے والے سے کہا جائے گا کہ پڑھ اور اپنے درجات میں اضافہ کرتا جا، پس جب وہ ایک آیت کی تلاوت کرتا ہے تو اسکا ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔

جس گھر میں قرآن کی تلاوت اور ذکر خدا ہوتا ہے اس گھر میں وافر برکتیں ہوتی ہیں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور شیاطین بھاگ جاتے ہیں۔ آسمان والوں کے لیے یہ گھر اس طرح چمکتا ہے جیسے زمین والوں کے لیے درخشندہ ستارے اور جس گھر میں قرآن کی تلاوت نہیں ہوتی اور اللہ کا ذکر نہیں ہوتا وہاں سے فرشتے بھاگ جاتے ہیں اور یہ گھر شیطانوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

سبق3

قرآن مجید کی تلاوت کے آداب وثواب

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری الہامی کتاب ہے۔ یہ مقدس کتاب دوسری تمام کتابوں سے ممتاز ہے جس کی تلاوت کے مخصوص آداب اور اصول ہوتے ہیں۔ ضروری ہے تلاوت کرتے وقت ان آداب کا حتی الامکان لحاظ کیا جائے تا کہ کتاب اللہ کا احترام ملحوظ خاطر رہے اور قرآن مجید کی تلاوت کا مقصد اور ہدف بھی حاصل کیا جا سکے۔ قرآن مجید کی تلاوت کے دوران مندرجہ ذیل آداب کا خیال رکھنا چاہیے۔

۱۔ **طہارت:** قرآن مجید کی تلاوت ہمیشہ طہارت کے ساتھ کریں، یعنی جسم، لباس وغیرہ پاک ہو۔ نیز وضو کر کے تلاوت قرآن کریں۔ وضو کے بغیر قرآن کو ہاتھ لگانا حرام ہے۔

۲۔ **قبلہ:** بہتر ہے کہ تلاوت قرآن قبلہ رو ہو کر کی جائے۔

۳۔مسواک: حدیث ہے کہ مسواک کر کے قرآن پڑھا جائے تاکہ منہ سے بدبو نہ آئے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

نظفوا طريق القرآن، قيل: يا رسول الله! وما طريق القرآن؟ قال: افواهكم. قيل: بماذا؟ قال: بالسواك

قرآن کریم کے رستوں کو صاف ستھرا رکھو۔ پوچھا گیا: یا رسول اللہ! قرآن کے رستے کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: تمہارے دہن (منہ)۔ پوچھا گیا: انہیں کس طرح صاف رکھیں؟ فرمایا: مسواک کے ذریعے۔[1]

۴۔خوشبو: تلاوت قرآن سے قبل خوشبو لگانا یا ماحول کو معطر کرنا مستحب ہے۔ البتہ خاتون کا اس طرح خوشبو لگانا حرام ہے کہ نامحرم کو محسوس ہو۔

۵۔دعا: قرآن کی تلاوت سے قبل دعا کرنا اور تلاوت ختم کر کے دعا کرنا مستحب ہے۔

۶۔استعاذہ: تلاوت قرآن سے قبل استعاذہ یعنی **اعوذ بالله من الشيطن الرجيم**۔ (میں اللہ کی پناہ مانگتا/ مانگتی ہوں شیطان مردود سے) پڑھنا چاہیے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ اسلام کا ارشاد ہے: **اغلقوا ابواب المعصية بالاستعاذة** ''(تلاوتِ قرآن سے قبل) اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم'' پڑھ کر گناہوں کے دروازے بند کر لو ''

۷۔بسم اللہ: شیطان پر لعنت کے بعد ''بسم للہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھنی چاہیے۔ بلکہ ہر کام کا آغاز بسم للہ سے کرنا چاہیے۔

حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام جب کبھی کسی آیت سے استدلال کرتے تھے۔ تو آیت پڑھنے سے پہلے ''اَعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم، بسم للہ الرحمٰن الرحیم'' ضرور پڑھتے تھے اس کے بعد کسی آیت کی تلاوت فرماتے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے: **افتحوا ابواب الطاعة بالتسمية** تسمیہ (بسم للہ) سے اطاعت کے دروازے کھول دو

۸۔ترتیل: قرآن مجید کو ترتیل کے ساتھ یعنی ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا چاہیے۔ اتنی رفتار سے پڑھنا کہ جس سے کچھ سمجھ میں نہ آئے کہ کیا پڑھ رہا ہے، قرآن کی توہین ہے۔

۹۔تجوید: قرآن کو صحیح پڑھنے کے طریقے کو تجوید کہتے ہیں۔ صحیح تلاوت کے لیے تجوید سیکھنا اور اپنے مخارج (تلفظ) کو درست کرنا بھی ضروری ہے۔

۱۰۔لحن: قرآن کو اچھے لحن اور دلنشین آواز میں پڑھنا چاہیے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: زینو القرآن باصوا تکم قرآن مجید کو اپنی آوازوں سے آراستہ کرو
۔

ایک اور جگہ پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ان لکل شئی حلیة ،واحلیة اقرآن الصوتُ الحسن
ہر چیز کی ایک زینت ہوتی ہے اور قرآن مجید کی زینت اچھی آواز ہے۔

۱۱۔ **بہترین جگہ کا انتخاب:** قرآن مجید کی تلاوت کے لیے بہتر سے بہتر جگہ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ بیت الخلا یا حمام جیسے جگہوں پر تلاوت قرآن کرنا آداب قرآن کے منافی ہے۔ احادیث میں گھروں کے اندر تلاوت قرآن کے اہتمام کے بے شمار فوائد ذکر ہوئے ہیں۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: یعنی اپنے گھروں کو تلاوت قرآن سے نورانی بناؤ اور یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح انہیں قبر نہ بناڈالو۔ یہودی اور عیسائی اپنے گرجا گھروں اور اپنی عبادت گاہوں میں نماز پڑھتے تھے اور گھروں میں کوئی عبادت نہیں کرتے تھے۔ جان لو! کہ گھر میں جتنی زیادہ تلاوت قرآن کی جائے گی اس لیے اتنی ہی بھلائی ہوگی اور اس سے اہل خانہ کے لیے آسانیاں پیدا ہوں گی اور وہ گھر اہل آسمان کو اسی طرح چمکتا دکھائی دے گا جس طرح اہل زمین کو ستارے دکھائی دیتے ہیں[1]

۱۲۔ **تواضع اور حزن:** جب قرآن مجید اچھی قرات اور لحن سے پڑھنا آجائے تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور عاجزی وانکساری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ علاوہ ازین قرآن مجید کو دلسوز آواز کے ساتھ پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اتلو االقرآن وابکوا، فان کم تبکو افتبا کوا ''قرآن مجید کی تلاوت کرتے وقت گریہ کیا کرو اور اگر گریہ نہیں کرسکتے تو رونے والی شکل بناؤ۔''

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

مامِن عین فضت مِن قرائة القرآن الاقرّت یوم القیامة
یعنی جو آنکھ بھی تلاوت قرآن مجید سے اشکبار ہوگی وہ روز قیامت پرسکون رہے گی۔[2]

۱۳۔ **توجہ اور تدبر:** تلاوت قرآن کے وقت پوری توجہ قرآن کے مطلب پر ہونی چاہیے اور اس میں غور وفکر کرنی چاہیے، کیونکہ تلاوت قرآن کا اصل مقصد اس کو سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: اَلا لا خیرَ فی قراَئةٍ لا تدبّر فیه ''یاد رکھو! جس قرائت میں تدبیر نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔''

۱۴۔ **استماع:** جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سننا چاہیے اور کوئی اور بات نہیں کرنی چاہیے۔

۱۵۔ **تلاوت کی کم سے کم مقدار:** ویسے تو قرآن مجید کی جتنی زیادہ تلاوت کی جائے اتنا ہی بہتر ہے لیکن امام جعفر صادقؑ سے مروی روایت کے مطابق ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم از کم قرآن کی پچاس آیات کی تلاوت کیا کرے۔

۱۶۔ رمضان المبارک میں تلاوت قرآن کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

ثوابِ تلاوت قرآن مجید

کس قدر سعادت کا مقام ہے کہ انسان قرآن کے کلمات اپنی زبان پر جاری کرلے۔ جنہیں اللہ نے اپنی زبان قدرت پر جاری فرمایا، اور پھر اس میں غور و فکر بھی کرے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے: جو اللہ کی کتاب کے ایک حرف کی تلاوت کرلے، اسے ایک نیکی کا ثواب دیا جائے گا اور ایک نیکی کا دس گنا ثواب ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ الم اک حرف ہے، بلکہ الف، ایک حرف، لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو ایک رات میں دس آیات کی تلاوت کرلے اسے غافلین میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ اور جو پچاس آیات کی تلاوت کرے اُسے ذکر خدا میں مشغول رہنے والوں میں شمار کیا جائے گا اور جو ایک سو آیات کی تلاوت کرے اسے عبادت گزاروں میں شمار کیا جائے گا۔ جو تین سو آیات کی تلاوت کرے اسے کامیاب لوگوں میں شمار کیا جائے گا اور جو پانچ سو آیات کی تلاوت کرے اسے (راہ خدا میں) جہاد کرنے والوں میں سے شمار کیا جائے گا اور جو ایک ہزار آیات کی تلاوت کرے وہ ایسا ہے جیسے اس نے کثیر مقدار میں سونا راہ خدا میں دیا ہو۔

قرآن کریم میں رب کریم پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝١ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝٢ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝٣ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝٤

رات کو اٹھا کیجیے مگر کم، آدھی رات یا اس سے بھی کم کرلیجیے یا اس پر کچھ بڑھا دیجیے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کیجیے۔

سبق 4

جمع قرآن

دشمنان اسلام نے قدیم زمانے سے ہی اپنی سازشیں اس بات پر مرکوز رکھی تھیں کہ قرآن کو مخدوش اور متنازعہ بنائیں۔ نہ صرف دشمنان اسلام بلکہ بدقسمتی سے خود امت مسلمہ کے بعض افراد فرقہ وارانہ تعصب کے باعث اس پروپیگنڈہ کو ہوا دینے میں دشمنوں کے ہمراہ ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں بنیادی طور پر دو متفق علیہ چیزوں کے بارے میں شکوک وشبہات اور اختلاف عوام الناس میں پیدا کر دیے گئے۔ اور وہ دو موضوعات ''تحریف القرآن'' اور ''قرآن کی جمع بندی'' ہیں۔ آج کے سبق میں ہم قرآن کی جمع بندی کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔

جمع قرآن

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو ۲۳ سال کے عرصے میں رسول نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اس بات میں تو کسی کو کوئی شک وشبہہ نہیں ہے۔ البتہ بحث اس بارے میں ہے کہ جو قرآن مجید ۲۳ سال میں نازل ہوا اور آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اس کو موجودہ کتابی شکل کب اور کس نے دی؟ بالفاظ دیگر! قرآن قلب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امت کی طرف کس طرح منتقل ہوا؟

جواب

جب قرآن کی کوئی بھی آیت نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی تھی تو آپؐ فوراً دو قسم کے اہتمام فرماتے تھے:

حفظ آیات قرآنی

پہلا کام ان آیات کے امین یعنی حفاظ کرام کی تربیت تھا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید کو امت کے سینوں میں منتقل کرنے کے لیے حافظان قرآن کی وسیع پیمانے پر تربیت فرمائی تاکہ قرآن ان کے سینوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے۔ چنانچہ عصر رسولؐ میں ہی حافضان قرآن کی تعداد اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ نام بنام انہیں شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔ آپؐ نہ صرف حفاظ کرام کی تربیت کا اہتمام فرماتے بلکہ بذاتِ خود بھی نزول وحی کے وقت، وحی کے مکمل نازل ہونے سے قبل ہی اُن آیات کی تلاوت شروع کر دیتے تھے تاکہ آیت رہ نہ جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بشارت نازل ہوئی کہ آپ اس قدر پریشان نہ ہوں ہم آپ کو پڑھائیں گے تو پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يُّقۡضٰٓى اِلَيۡكَ وَحۡيُهٗ ۚ وَقُلۡ رَّبِّ زِدۡنِىۡ عِلۡمًا ﴿۱۱۴﴾

اور آپ پر ہونے والی اس وحی کی تکمیل سے پہلے، قرآن پڑھنے کی عجلت نہ کریں اور کہہ دیا کریں: پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما۔

(اے نبی) آپ وحی کو جلدی (حفظ) کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقیناً ہمارے ذمہ ہے۔

۲۔کتابت آیات قرآنی

آیات قرآنی کی حفاظت کا دوسرا اہتمام اس کی کتابت (لکھوائی) تھی۔جب سرزمین عرب میں قرآن کا نزول ہو رہا تھا تو وہاں جہالت کا یہ عالم تھا کہ مکہ میں صرف سترہ افراد کتابت جانتے تھے۔اور جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے انہیں آج کی طرح کاغذ قلم میسر نہ تھے۔بلکہ زیادہ تر کھجور کی کھال، چمڑا، سفید باریک پتھر، ریشمی کپڑا اور لکڑی کے تختے کاغذ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ان حالات میں جب قرآن کا نزول شروع ہوا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حفاظت قرآن کی خاطر کتابت کے مندرجہ بالا تمام تر وسائل بروئے کار لائے۔

ا۔کتابت قرآن عصر رسول اکرمؐ میں

یہ بات قطعی و یقینی طور پر ثابت ہے کہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کاتب کو بلا لیتے اور لکھنے کا حکم فرماتے تھے۔نہ صرف یہ بلکہ املا کروانے کے بعد کاتب سے فرماتے تھے کہ جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھ کر سنائے کاتب سنا دیتا ہے۔اور اگر کوئی غلطی سرزد ہوئی ہوتی تو آپؐ اس کی اصلاح فرما دیتے۔مشرکین مکہ بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کی آیات کے نزول کے فوراً بعد اپنے اصحاب کو لکھا دیا کرتے تھے۔جس کا ثبوت اہل مکہ کی وہ باتیں ہیں جنہیں قرآن مجید نے نقل کیا ہے۔

وَقَالُوۡۤا اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ اكۡتَتَبَهَا فَهِىَ تُمۡلٰى عَلَيۡهِ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا ﴿۵﴾

اور کہتے ہیں: (یہ قرآن) پرانے لوگوں کی داستانیں ہیں جو اس شخص نے لکھ رکھی ہے اور جو صبح شام اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

قرآن کی کتابت کا آغاز وحی کے ساتھ ہی مکہ میں شروع ہو جانے پر خود قرآنی شواہد کے علاوہ بے شمار تاریخی شواہد بھی موجود ہیں۔حضرت عمر نے اپنی بہن کے گھر میں دو صحیفے پائے جن پر قرآن لکھا ہوا تھا۔ان صحیفوں کو کسی سے پڑھوایا اور انہیں سن کر اسلام قبول کیا۔قرآن مجید کی آیات لکھنے والے دو طرح کے لوگ تھے۔کچھ لوگ وہ تھے جو ذاتی طور پر اور اپنے لیے قرآن مجید کی آیات ساتھ ساتھ لکھتے رہے۔جبکہ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

لیے کتابت کیا کرتے تھے یعنی نسخہ محمدیؐ کی تدوین کی ذمہ داری انہی لوگوں کو دی گئی تھی۔ اور یہی لوگ جو کہ مورخین کے نزدیک یہ تعداد ۴۳ سے ۴۵ تک پہنچ جاتی ہے۔ (جو کہ قابل تحقیق ہے)۔

نہایت اہمیت کا حامل امر یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تبان وحی کو صرف آیات کی کتابت کا حکم نہیں دیتے تھے بلکہ ساتھ ہی ترتیب بھی بتادیتے تھے کہ اس آیت کو کس سورہ میں کس آیت کے بعد اور کس آیت سے پہلے رکھا جائے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ آیات کی موجودہ ترتیب بحکم خدا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مقرر ہوئی۔ البتہ قرآن کی سورتوں کی موجودہ ترتیب کے بارے میں اختلافات ہے کہ آیا ان سورتوں کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی ترتیب سے رکھوایا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اصحاب نے انہیں یہ ترتیب دی تھی؟

جمع وتدوین قرآن عصر رسول اکرمؐ میں

یہ بات تو واضح ہوگئی کہ قرآن مجید کی تمام آیات کی کتابت (لکھوائی) کا کام عصر رسالتؐ میں ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی نگرانی میں بطریق احسن انجام دیا گیا جس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا موجودہ قرآن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ہی جمع کر کے کتابی شکل میں تیار ہو گیا تھا یا پھر بعض لوگوں کے مطابق یہ کام عصر حضرت ابوبکر میں یا عصر عثمان میں انجام دیا گیا۔

جواب: اس بات پر بے شمار دلائل موجود ہیں کہ قرآن مجید عصر رسولؐ میں ہی کتابی شکل میں مدون ہو گیا تھا، ہم صرف چند ایک دلائل پر اکتفاء کرتے ہیں۔

۱۔ فضائل قرآن، تلاوت قرآن، آداب تلاوت قرآن، احکام ملحق اور دیگر قرآنی موضوعات کے بارے میں روایت کی گئی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عصر رسالت میں ہی کتابت کی شکل میں مدون ہو گیا تھا۔ اور ہر شخص کی دسترس میں تھا۔ بعض احادیث نبویؐ میں قرآن مجید کا نسخہ اپنے پاس رکھنے کی تاکید کی گئی ہے، تو بعض میں قرآن مجید کو دیکھ کر تلاوت کرنے میں رغبت دلائی گئی ہے۔ جبکہ بعض دیگر روایات میں مشرکین کے علاقوں میں قرآن مجید ہمراہ لے جانے سے منع کیا گیا ہے۔ ان تمام احادیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت قرآن مجید کتابی شکل میں موجود تھا۔ تبھی یہ احادیث وارد ہوئی ہیں۔

۲۔ سورۃ طور میں قرآن کے لیے ''کتاب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ وَالطُّوْرِ ۝۱ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝۲ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝۳ قسم ہے کوہِ طور کی اور لکھی ہوئی کتاب کی، ایک کشادہ ورق میں۔

۳۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات کے آخری لمحات کے دوران حضرت علی علیہ السلام کو جو وصیت فرمائی اس میں بھی قرآن مجید کے لیے ''کتاب'' کا استعمال کیا ہے۔

یاعلی ھذا کتاب اللہ خذھا الیك، فجمعه علی فی ثوب فمضیٰ الی منزله

اے علی! یہ اللہ کی کتاب ہے اسے اپنے پاس لے جاؤ۔ چنانچہ حضرت علیؑ اسے ایک کپڑے میں جمع کر کے اپنے گھر لے گئے۔ لہذا معلوم ہوا کہ قرآن مجید حیات رسولؐ ہی میں مدوّن کتابی شکل میں موجود تھا اور یہ کام کسی اور بشر نے انجام نہیں دیا۔

سبق 5

عدم تحریف قرآن

گذشتہ سبق میں تو واضح ہو گیا کہ موجودہ قرآن کو کب اور کس نے کتابی شکل دی۔ اس سبق میں ہماری بحث اس بارے میں ہے کہ جو قرآن اس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔ آیا یہ بعینہ وہی قرآن ہے جو حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا؟ یا اس میں کچھ کمی یا زیادتی ہوگئی ہے؟ ہمارا عقیدہ ہے کہ آج دنیا کے مسلمانوں کے پاس جو قرآن مجید ہے یہ وہی قرآن ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا، اس میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے نہ کسی چیز کا اضافہ کیا گیا ہے۔

ابتدائی دنوں سے ہی کاتبان وحی کی ایک بہت بڑی جماعت نزول قرآن کے بعد آیات کو لکھ لیتی تھی۔ مسلمانوں کی ذمہ داری تھی کہ دن رات اس کی تلاوت کریں اور اپنی پنجگانہ نمازوں میں اسے دہرائیں۔ بہت سے لوگوں نے قرآن کو حفظ کر لیا تھا۔ اسلامی معاشروں میں قرآن کے حفاظ اور قاریوں کو ہمیشہ خصوصی مقام حاصل رہا، ان باتوں اور دیگر وجوہات کے باعث قرآن ہر قسم کے تغیر و تبدیل اور تحریف سے محفوظ رہا۔ اس میں کوئی تبدیلی کیوں کر ہو سکتی تھی جب کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے خاتمے تک اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ضمانت کے باعث اس میں تغیر و تحریف محال ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝۹ اس ذکر یعنی قرآن کو یقیناً ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اس معروف قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن موجود بھی نہیں ہے، یہ بات بالکل واضح ہے۔ اور تحقیق کا راستہ سب کے لیے کھلا ہے کیونکہ آج تمام گھروں، تمام مساجد اور لائبریریوں میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ صدیوں پہلے لکھے گئے قلمی نسخے ہمارے عجائب گھروں میں بھی موجود ہیں۔ یہ سب بانگ دہل اعلان کر رہے ہیں کہ یہ وہی قرآن ہے جو باقی اسلامی ممالک میں موجود ہے اگرچہ قبل ازیں ان مسائل پر تحقیق کے وسائل فراہم نہ تھے۔ لیکن آج تو تحقیق کا دروازہ سب کے لیے کھلا ہے۔ تھوڑی سی تحقیق سے ہی اس طرح کی غلط نسبتوں کا بے بنیاد ہونا ثابت ہو جائے گا۔

قرآن کریم رسول کریم ﷺ کی نبوت کی حقانیت پر اللہ کی طرف سے ایک معجزہ ہے۔

باطل نہ اس کے سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے، یہ حکمت والے اور لائق ستائش کی نازل کردہ ہے۔

بعض کوتاہ فکر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ قرآن مجید میں تحریف اور تبدیلی واقع ہوچکی ہے۔ دلیل کے طور پر وہ کچھ ایسی روایات پیش کرتے ہیں جن میں تحریف کا لفظ موجود ہے اگرچہ ان روایات میں تحریف کا لفظ صریحاً موجود ہے لیکن ان میں تحریف سے مراد تحریف معنوی ہے۔ تحریف معنوی کا مطلب یہ ہے کہ مفاد پرستوں نے آیات قرآنی کے مطالب کو ان کے حقیقی مفہوم و معنی سے ہٹا کر اپنی رائے اور ذاتی یا گروہی خواہشات کے مطابق استعمال کیا ہے۔ ان لوگوں سے متعلق حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ''لا یعرفون الا خطه'' یعنی وہ لوگ قرآن کے صرف خطوط اور نقوش کو پہچانتے ہوں گے۔ اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ لوگ قرآن میں معنوی تحریف تو کریں گے لیکن الفاظ قرآن محفوظ رہیں گے۔ تحریف قرآن ناممکن ہے۔ قرآن میں تحریف اس لیے ناممکن ہے کہ اس کی معجزاتی ترکیب اپنے اندر کسی قسم کی تحریف کو قبول نہیں کرتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔

۱۔ **اصول وکلیات:** گزشتہ امتوں پر نازل شدہ کتاب میں تحریف واقع ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ تھا کہ آسمانی کتب میں جو دستور حیات دیا گیا تھا وہ حکمرانوں اور مفاد پرستوں کے مفادات کے خلاف ہوتا تھا لہٰذا کچھ لوگوں نے ان کی مخالفت کی۔ کچھ نے ان کے حقائق کو چھپانے کی کوشش کی اور کچھ نے تحریف کر ڈالا۔ لیکن خاتم الانبیا ﷺ کے ابدی معجزے قرآن کو تحریف سے محفوظ رکھنے کا انتظام خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صرف اصول وکلیات ہی بیان کئے اور تفسیر وتشریح کا کام سنت پر چھوڑ دیا۔ اس لیے قرآن میں اس دور کے لوگوں میں سے کسی کا نام مذکور نہیں۔ نہ برگزیدہ ہستیوں کے نام مذکور ہے نہ قابل مذمت لوگوں کے نام درج ہیں۔ صرف ابولہب اور اس کی بیوی کی مذمت نام لے کر کی گئی ہے۔ کیونکہ ابولہب کی کھلی عداوت اور خود حضور اکرم ﷺ کا رشتہ دار ہونا ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے ان کا نام صریحاً لیا گیا، کیونکہ مستقبل میں رسول اکرم ﷺ کے خاندان کی طرف سے کسی تحریف کا خطرہ نہیں تھا۔

۲۔ **تدریجی نزول:** قرآن کو ضیاع اور تحریف سے بچانے کے لیے دوسرا انتظام اس کا تدریجی نزول تھا ایک متوسط حجم کتاب ۲۳ سالوں کی مدت میں تدریجاً نازل ہوتی رہی اور کتاب بھی ایسی جس کا اندازِ کلام دوسرے کلاموں سے مختلف ہے اور جس میں روح اور سماعت دونوں کی تسکین کا سامان ہے۔ تدریجی نزول کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ قرآن نہایت آسانی کے ساتھ امت کے حوالے ہوگیا۔ جس طرح نزول قرآن تدریجی تھا، اسکی تعلیم اور امت کی طرف اس کی منتقلی بھی تدریجی تھی۔ جس روز نزول کا کام مکمل ہوا اسی روز قرآن کی امت کی طرف منتقلی بھی ہوئی۔

سبق6

قرآن مجید کی جاذبیت

وہ اس شہر میں نو وارد تھا۔مگر اس بار اس کو شہر کی فضا پہلے سے مختلف دکھائی دے رہے تھی۔ وہ جونہی مکہ میں داخل ہوا۔تو اس کے دوست اس کی ملاقات کو آ گئے تھے، ان سب کے چہرے اترے ہوئے تھے اور نہایت پریشانی اور اضطراب کے عالم میں اسے مکہ کی تازہ ترین خبر سنا رہے تھے۔ ''تم شاید محمد ﷺ امین کو نہیں پہچانتے ہو، وہ کہتا ہے کہ بتوں میں کوئی قدرت ہی نہیں، بتوں کی پرستش چھوڑ دو اور ظالموں کے سامنے نہ جھکو، وہ کہتا ہے کہ تم سب کے سب اللہ کی مخلوق ہو، صرف اسی کی پرستش کرو، تمہارا مالک خدا ہے اور تم اپنے آپ کو دوسروں کے اختیار میں نہ دو، یہ ظالم لوگ تم پر کوئی فضیلت نہیں رکھتے آنکھ بند کر کے ان کی اطاعت کیوں کرتے ہو اور کیوں ان کی غیر معقول باتوں کو کیوں سنتے اور مانتے ہو۔۔؟ یہی وجہ ہے کہ اب غلام ہمارے حکم نہیں مانتے اور ہماری اطاعت نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں اور حضرت محمد ﷺ کے پیروکار ہیں ظلم و ستم کے سامنے نہیں جھکیں گے''۔

طفیل ابن عمرو شیریں بیان شاعر اور مفکر تھا، اپنے قبیلہ میں ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا، ان کا اسلام لانا قریش کے لیے بڑا ہی ناگوار تھا، وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ طفیل جیسا مدبر انسان اسلام کی آغوش میں چلا جائے، اس لیے قریش کے روساء اور سیاست کے مداریوں نے اُسے چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ کچھ دیر سے محفل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ آخری کونے سے ایک شخص بول اٹھا: ''دیکھو طفیل! یہ شخص جو خانہ کعبہ کے پہلو میں نماز پڑھ رہا ہے۔ یہی ہے وہ محمد ﷺ جس نے نیا دین کھڑا کر کے ہمارے اتحاد و اتفاق کے شیرازہ کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس نے جادوئی انداز میں ہمارے اندر افتراق و انتشار پھیلا دیا ہے، مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں آپ کے قبیلے میں بھی اس کے سبب انتشار نہ پھیل جائے، کتنا ہی اچھا ہو کہ آپ اس سے بات کریں نہ اس کی آواز تک سنیں''۔ وہ سب باری باری طفیل کو سمجھا رہے تھے: ''اے بڑے عقلمند اور دانشمند انسان! تم ہرگز اس سے بات نہ کرنا اور اس کی گفتگو نہ سننا، ہمیں ڈر ہے کہ تجھے بھی گمراہ نہ کر دے، یہ لو! روئی، اسے اپنے کانوں میں ڈال لو اور اس کے بعد ہی مسجد الحرام کا رخ کرنا''۔ اس کے دوستوں کی باتیں طفیل کے دل و روح میں بیٹھ چکی تھیں، وہ دل ہی دل میں اپنے دوستوں سے خوش بھی تھا اور ان کا شکر گزار بھی۔

وہ ہر روز جب خانہ کعبہ کے طواف کے لیے جاتا تو اپنی جیب سے روئی نکالتا کانوں میں ڈالتا، طواف کرتے ہوئے محمدؐ پر ایک ترچھی نگاہ ڈالتا اور جلدی جلدی طواف کر کے گھر کو لوٹ جاتا۔ ایک روز صبح سویرے طفیل اس حال میں

مسجد الحرام میں داخل ہوا کہ اس نے روئی اپنے کانوں میں ٹھونس رکھی تھی۔ طفیل کہتا ہے کہ: ''میرا دل ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بات بھی کروں، میں طواف میں مشغول ہو گیا، اچانک میرے دل کے اندر سے مجھے ایک آواز سنائی دی۔ طفیل! تیری ماں تیرے غم میں روئے، تو ایک سخنور اور سمجھ بوجھ والا آدمی ہے۔ اے نادان! ان کی بات سن اور دیکھ تو سہی وہ کہتے کیا ہیں۔ اگر ان کی بات اچھی ہو تو مان لینا اور اگر وہ بری ہو تو رد کر دینا''۔

یہ آواز سن کر طفیل نے اپنے کانوں سے روئی تھوڑی سی سرکائی، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز کانوں کے راستے سے طفیل کی روح میں اتر گئی، جب اس نے غور کیا تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوش لحنی سے قرآن مجید کے عمدہ کلمات کی تلاوت کر رہے تھے، طفیل متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلاوت ختم کی اور گھر کی جانب چل پڑے۔ مگر اب طفیل کی روح تڑپ چکی تھی، اپنی بے چین روح کی تسکین کے لیے طفیل فوراً اٹھا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے چلنے لگا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر پہنچ گیا۔ کہنے لگا: ''اے محمدؐ! میں نے ان کلمات کی بھنبھناہٹ سنی تھی جن کی آپ تلاوت کر رہے تھے، میرا دل چاہتا ہے کہ کچھ دیر اور وہ کلام سنتا رہوں، کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میرے لیے کچھ دیر مزید اُن کلمات کی تلاوت فرمائیں؟''۔

آپ نے جو اس کی بات کو غور سے سن رہے تھے، تبسم فرمایا اور کہا: ''وہ کلام میرا نہ تھا، بلکہ میرے خدا کا تھا۔ تم سب جانتے ہو کہ کسی سے درس نہیں پڑھا، مگر کیا تم اور علما اور دانشور جو سالہا سال درس پڑھتے رہے ہیں، اس طرح کا کلام لا سکتے ہو؟ اگر ذرا سا غور کرو تو سمجھ جاؤ گے کہ یہ کلام میرا نہیں بلکہ میرے خدا کا ہے، جس نے مجھے نبوت کے لیے چن لیا ہے، یہ عمدہ اور پُرمطلب کلام اللہ کا پیغام ہے اور میں تو صرف اس کے لانے والا ہوں، یہ تمہاری آزادی اور سعادت و خوش بختی کا پیغام ہے طفیل!''، طفیل نے کہا آپ کی قرآن خوانی کی جاذبیت و کشش نے مجھے آپ کی طرح کھینچ لیا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ قرآن کی تلاوت فرمائیں اور اپنے دین کی حقیقت سے مجھے آشنا کریں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دین اس کے سامنے پیش کیا اور قرآن کی تلاوت بھی کی، طفیل کہتا ہے:

خدا کی قسم! اس سے زیادہ حسین کلام میں نے ہرگز نہیں سنا تھا۔ نہ اس سے زیادہ معتدل دین میں نے دیکھا تھا۔

طفیل ابن عمرو اسی موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام قبول کرتے ہیں اور اپنے قبیلہ میں دین اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں کوشاں رہنے کا وعدہ کر کے اپنے وطن واپس لوٹ جاتے ہیں۔ جنگ خیبر تک وہ اپنے قبیلے میں دین اسلام کی تبلیغ کرتے رہے اور اسی موقع پر اپنے قبیلے کے ستر، اسّی کنبوں کے ہمراہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آ ملے۔ اعجاز قرآن سے متاثر ہو کر اسلام لانے والا یہ جانباز اسی طرح اسلام میں ثابت قدم رہا یہاں تک کہ جنگ یمامہ میں جام شہادت نوش کر گیا۔

سبق 7

قرآن اور اہل بیتؑ

ویسے تو اللہ تعالیٰ کو اپنی ساری مخلوقات ہی اچھی لگتی ہیں مگر انسان کے ساتھ خالق کو خاص پیار ہے یہی وجہ ہے کہ اسے خلیفۃاللہ فی الارض یعنی کائنات میں اپنا نائب بھی بنایا ہے۔اور جب پہلی بار اس کی خلقت فرمائی تھی تو ڈھانچہ بنانے کے بعد اس کے اندر اپنی روح ڈالی تھی۔یہ اپنی اس مخلوق سے محبت کا اظہار ہی تو تھا کہ سب سے پہلے اپنا نمائندہ (یعنی حضرت آدمؑ)، ہادی کے روپ میں بھیجا اور پھر اس کے بعد انسانی نسل چلائی تا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی بھی انسان ہادی کی ضرورت محسوس کرے مگر اس کی ہدایت کرنے والا کوئی نہ ہو۔صرف یہی نہیں بلکہ حضرت آدمؑ کے بعد ''ہدایت'' کے اس سلسلے کو یکے بعد دیگرے اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو بھیج کر جاری رکھا۔جب بات سید المرسلین تک پہنچی تو یہ اعلان بھی کر دیا کہ یہی ''خاتم المرسلین'' بھی ہیں۔یعنی نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ اب یہیں روک دیا گیا ہے۔مگر تم پریشان نہیں ہونا کیونکہ ہدایت کا سلسلہ تو ہمیشہ جاری رہے گا۔مگر کیسے۔۔۔؟

انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اهل بیتی

رحلتِ رسولؐ سے قبل ہی ''ہدایت'' کے تمام اسباب مہیا کر دیئے گئے تھے۔صرف اعلان کرنا باقی تھا۔اور بالآخر وہ وقت بھی آن پہنچا تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد جاری رہنے والے سلسلہ ہدایت کا اعلان کرتے ہوئے کہہ رہے تھے:

''لوگو! میں تمہارے دمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، (جو تمھاری ہدایت کی ضامن ہیں) ایک قرآن مجید اور دوسری میرے اہل البیتؑ۔اور ہاں یاد رکھو! اگر تم ان دونوں سے ہدایت پاتے رہے تو پھر کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے، (تمھیں یہ بھی بتاتا ہوں کہ) قرآن اور میرے اہل بیتؑ ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پہ مجھ سے آملیں گے''۔

اس بات سے بڑھ کر روشن تر حقیقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن اور اہل البیتؑ میں جدائی کا اصلاً امکان ہی نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ دنیا نے دیکھا کہ جب احکام الٰہی قرآن مجید کی آیات کی صورت میں نازل ہوتے ہیں تو میدان عمل میں ان احکام پر اہل بیتؑ پر سبقت لے جانے ولا کوئی نہیں ہے۔یعنی آیات قرآنی کی عملی تفسیر دیکھنا ہو تو اہل بیتؑ سے بڑھ کر کوئی نہیں ملے گا۔دوسری جانب یہی قرآن مجید اہل بیتؑ رسول کے خلوص کی تعریف کرتا ہے اور ان کے بے مثل و بے نظیر کارناموں کو اپنی آیات میں سراہتا ہے یہی وجہ ہے کہ نہ صرف قرآن مجید کی آیات بلکہ قرآن کی پوری سورتیں ان کے نام سے موسوم ہوئی ہیں۔

سورہ محمد، محمد و آل محمد کا آئینہ قرار پائی، سورہ دہر انہی حضرات کی قصیدہ خواں ہے، اور سورہ کوثر میں انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند نے رسولؐ کے دشمن کو ابتر قرار دے کر اپنے نبی کو ''خیر کثیر'' کی خوشخبری سنائی۔اور جس طرح حضرت امام حسینؑ کو باقی آئمہ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے اسی طرح سورہ فجر کو حسینؑ ابن علیؑ کا سورہ ہونے کا

اعزاز حاصل ہوا۔قرآن مجید کی بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں صراحتاً یا اشارتاً اہل بیتؑ رسول ﷺ کا تذکرہ ہوا ہے، ان آیات میں سے آیت تطہیر کو اہل بیتؑ کا نام لے کر انہیں خصوصی طور پر نوازے جانے کا صریحاً اعلان کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ارشاد قدرت ہے: اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُذۡهِبَ عَنۡكُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ وَيُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِيۡرًا ۞۳۳ اللہ کا بس یہی ارادہ ہے، ہر طرح کی ناپاکی کو اہل بیتؑ آپ سے دور رکھے اور آپ کو ایسے پاکیزہ رکھے جیسے پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

احادیث کی معتبر کتابیں جیسے صحیح مسلم، صحیح ترمذی، مسند احمد ابن حنبل، المستدرک، احکام القرآن اور دیگر بیسیوں بنیادی کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تصریح فرمائی ہے کہ اس آیت میں ''اہل البیتؑ'' سے مراد علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔اس حدیث کو اہل سنت نے چالیس طرق سے اور امامیہ نے تیس طرق سے نقل کیا ہے۔ یوں مجموعاً ستر طرق سے یہ حدیث ہم تک پہنچی ہے کہ قرآن میں جن اہل بیتِ رسولؐ کی پاکیزگی کی گواہی دی گئی ہے ان سے مراد علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ ہیں۔ آیہ تطہیر کے نزول کے وقت رسول اکرم ﷺ نے اپنے ''اہل بیتؑ'' کا صرف اعلان کیا تھا مگر واقعہ مباہلہ سے متعلق آیات کے بعد عملاً بتادیا تھا کہ ان کے اہل البیتؑ سے مراد کون لوگ ہیں۔

ترجمہ: آپ کے پاس علم آجانے کے بعد بھی اگر یہ لوگ (عیسیٰ کے بارے میں) آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دیں: آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی بیٹیوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنی بیٹیوں کو بلاؤ، ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے نفسوں کو بلاؤ، پھر دونوں فریق اللہ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

خدا کی طرف سے عیسائیوں کے ساتھ حکم مباہلہ آجانے کے بعد رسول اکرم ﷺ کو اپنے بیٹوں، اپنی عورتوں اور اپنے نفوس کو میدان میں لے کر جانا تھا، مگر آپ صرف حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، امام حسنؑ اور حضرت حسینؑ کو لے کر گئے، اور جب عیسائیوں نے شکست تسلیم کی تو آپ نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور کہا: اللھم ھؤلاء اھل بیتی خدایا یہی (علی، فاطمہ، حسن، اور حسین) میرے اہل بیتؑ ہیں۔ ان دونوں آیات سے یہ تشخیص ہو جاتی ہے کہ اہل بیت سے مراد کون لوگ ہیں۔

محمدؐ و آل محمدؐ پر درود بھیجنا

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوۡنَ عَلَى النَّبِىِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَيۡهِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا ۞۵۶

اللہ اور اس کے فرشتے یقیناً نبی پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو جیسے سلام بھیجنے کا حق ہے۔ [1]

جب آیت صلوٰۃ نازل ہوئی تو متعدد اصحاب نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ پر درود بھیجنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ جواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درج ذیل طریقے سے درود بھیجنے کا حکم دیا۔

اللّٰھم صل علی محمد و آل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم و علیٰ آل ابراھیم وبارك علیٰ محمد و آل محمد کما بارکتا علیٰ ابراھیم و علیٰ آل ابراھیم انك حمید مجید

اس روایت کو بھی متعدد طرق سے نقل کیا گیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دم بریدہ صلوٰۃ بھیجنے سے سختی سے منع فرمایا جب پوچھا گیا کہ دم بریدہ صلوٰہ سے آپ کی مراد کیا ہے؟ تو فرمایا: دم بریدہ صلوات یہ ہے کہ مجھ پر تو درود بھیجو مگر میری آل پر نہ بھیجو۔

لہٰذا ضروری ہے کہ جو کوئی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوات بھیجے ان کی ذریت پر بھی صلوات بھیجے۔

سبق 8

اجر رسالت

ارشاد رب العزت ہے: قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کہہ دیجیے: میں اس (تبلیغ رسالت) پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا سوائے قریب ترین رشتہ داروں کی محبت کے۔

اس آیت قرآنی میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو یہ باور کرایا ہے کہ اگر تم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی زحمتوں کا صلہ دینا چاہتے ہو۔ تو وہ صرف تبھی دیا جا سکتا ہے کہ جب ان کے اہل بیتؑ تم سے راضی ہو جائیں۔ اور تم ان سے اپنی محبت کا ثبوت پیش کرو۔ شعیہ سنی دونوں مکاتب فکر کی بنیادی کتابوں میں یہ روایت موجود ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ کے وہ قرابت دار کون ہیں کہ جن کی محبت ہم پر واجب ہوگئی ہے؟ فرمایا، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔ لہٰذا جو کوئی رسالت کا حق ادا کرنا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ اہل بیت رسولؑ سے محبت کا حق ادا کرے۔

اہل بیتؑ اصحاب اعراف ہیں

قیامت کے روز خداوند متعال اپنی مخصوص برگزیدہ ہستیوں کو جنت اور جہنم کا نظارا کروانے کا اہتمام کرے گا۔ اور اس نظارے کے لیے جنت اور جہنم کے درمیان ایک مخصوص جگہ بھی بنائی گئی ہے جس کا نام مقام اعراف ہے۔ سورہ اعراف آیت ۴۶ کے مطابق جب ان مخصوص شخصیات کو مقام اعراف حاصل ہوگا تو یہ اہل جنت اور اہل دوزخ سے گفتگو بھی کریں گے۔ ارشاد رب العزت ہے:

ترجمہ۔اور(اہل جنت اوراہل جہنم) دونوں کے درمیان ایک حجاب ہوگا اور بلندیوں پر کچھ ایسے افراد ہوں گے جو ہرایک کوان کی شکلوں سے پہنچان لیں گے اوراہل جنت سے پکار کرکہیں گے: تم پر سلامتی ہو یہ لوگ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے مگرامیدوار ہوں گے اور جب ان کی نگاہیں اہل جہنم کی طرف پلٹائی جائیں گی تو وہ کہیں گے: ہمارے پروردگار ہمیں ظالموں کے ساتھ شامل نہ کرنا اوراصحاب اعراف کچھ ایسے لوگوں کو بھی پکاریں گے جنہیں وہ ان کی شکلوں سے پہنچانتے ہوں گے اور کہیں گے: آج نہ تو تمہاری جماعت تمہارے کام آئی اور نہ تمہارا تکبر۔ [1]

اصحاب اعراف کے بارے میں متعدد آیات میں آیا ہے کہ پل صراط پر موجود اعراف نامی بلند مقام پر جو اصحاب جنت اور جہنم کا نظارہ کرنے آئیں گے، ان سے مراد'' آئمہ اہل بیتؑ '' ہیں۔مجمع البیان میں ہے کہ اہل سنت عالم ابوالقاسم جسکانی نے اسبغ بن نباتہ سے اورانہوں نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے ابن الکواء کو بتایا کہ ہم ہی اصحاب اعراف ہیں۔

اہل بیت علیہ السلام اہل ذکر ہیں

عقلاء کی یہ روش ہے کہ وہ جس بات سے لاعلم ہوتے ہیں اس کے لیے ان لوگوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جواس بات سے کاملاً باخبر ہوں۔ جیسے جاہل عالم کی طرف اور مریض ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتا ہے۔خداوند متعال نے اپنی کتاب قرآن مجید میں لاعلمی کی صورت میں اھل الذکر کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے۔

ارشاد قدرت ہے۔فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝۴۳ اگر تم لوگ نہیں جانتے ہو تو اہل ذکر سے پوچھ لو۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اہل ذکر سے مراد کون لوگ ہیں؟

حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے روایت ہے: **نحن اهل الذ کر و نحن مسؤلون** ہم اہل بیتؑ ہی اہل ذکر ہیں اور ہم سے سوال کیا جانا چاہیے۔

مستضعفین سے مراد اہل بیتؑ

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَي الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ۝۵

اورہم یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ جنہیں زمین میں بے بس کردیا گیا ہے ہم ان پر احسان کریں اورہم انہیں پیشوا بنائیں اورانہی کو وارث بنائیں۔

یہ آیت ایک طرف آئمہ اہل بیتؑ کی مظلومیت کو بیان کرتی ہے تو دوسری طرف نظام ولایت وحکومت کو ان کا حق بھی بتاتی ہے۔ بہت ساری روایات میں اس آیت سے اہل بیتؑ مراد لیا گیا ہے کہ مستضعفین (یعنی جنہیں

بے بس کر دیا گیا ہے) سے مراد آئمہ اہل بیتؑ ہیں۔اور **نجعلهم الوارثين** (یعنی جنہیں ہم وارث بنائیں گے) سے مراد امام زمانہ علیہ السلام ہیں۔حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ یہ دنیا اپنی منہ زوری دکھانے کے بعد پھر ہماری طرف جھکے گی۔جس طرح سرکش اونٹنی اپنے بچوں کی طرف جھکتی ہے۔اس کے بعد آپؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔[1]

سبق 9

خدا پسند تمنائیں

بہت سارے معاملات ایسے ہیں جن میں انسان بے بس و لاچار واقع ہوا ہے۔اگر چہ وہ کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش میں ہے اور دوسری جانب زمین کی وسعتوں سے نکل کر چانداور مریخ پر زندگی بسانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔مگر اس سب کچھ کے باوجود اس کی روزمرہ زندگی میں بارہا ایسے مراحل آتے ہیں کہ جب اس کو مجبوراً بے انتہا اختیارات کی مالک اور ہر چیز پر قادر ذات کی طرف التجائیہ نگاہوں سے سر اٹھا کر دیکھنا پڑتا ہے۔

جب بھی کبھی ایسا مرحلہ آتا ہے کہ تمام تر کوشش کے بعد بھی انسان اپنی مشکل کو اپنے سے دور نہیں کر پاتا تو وہ ہمیشہ قادر مطلق ذات کا سہارا مانگتا ہے۔اپنی کوئی بھی تمنا، مراد، خواہش یا دل کی حسرت پوری کرنے کی غرض سے وہ خداوند متعال کی ذات سے لولگاتا ہے۔اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کرتا ہے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان تمناؤں اور دعاؤں کا ذکر کیا ہے جو اس کی ذات کو بہت پسند ہیں انسان کو چاہیے کہ اپنے رب سے ہر وقت ان چیزوں کی تمنا اور دعا کرتا رہے۔آیئے خداوند متعال کی ذات سے ان تمناؤں کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے خالق سے وہ دعائیں مانگ لیتے ہیں جو اس کو پسند ہیں۔

دنیا و آخرت کی کامیابی

قرآن مجید میں خداوند متعال ارشاد فرماتا ہے کہ جو لوگ اپنے اللہ سے صرف دنیا کی اچھائی مانگتے ہیں وہ اسے سخت ناپسند ہیں، بلکہ فرمایا کہ تم مجھ سے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی مانگا کرو اور یوں دعا کیا کرو۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴿۲۰۱﴾ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں اچھائی عطا فرما اور آخرت میں اچھائی عطا فرمانا۔اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچانا۔

شرح صدر

---

[1] ان آیات کے علاوہ بھی قرآن مجید میں دسیوں آیات ایسی ہیں جن میں صریحاً اہل بیتؑ کی مدح سرائی کی گئی ہے مگر ہم نے اس مختصر کتاب میں انہی آیات پر اکتفاء کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ کو فرعون اور اس کی قوم کے پاس جانے اور انہیں تبلیغ کرنے کا حکم دیا تو اس مشکل گھڑی میں حضرت موسیٰؑ نے اپنے خدا سے ایک دعا مانگی تھی۔ہمیں بھی کوئی مشکل درپیش ہو تو خدا کی ذات سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمارے دل کو کشادہ کردے اور ہماری مشکل کو آسان بنادے۔آیئے! دعا مانگتے ہیں

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ﴿۲۵﴾ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ﴿۲۶﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ﴿۲۷﴾ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ﴿۲۸﴾ (موسیٰ) نے کہا: میرے پروردگار! میرا سینہ کشادہ فرما، اور میرے کام کو میرے لیے آسان کردے، اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری بات سمجھ جائیں۔

کائنات کے راز دیکھ کر دست بدعا ہونا

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کی دعا کی قبولیت کا ذکر کیا اور بتایا ہے کہ وہ لوگ دعا سے قبل کیا کام کرتے ہیں۔اور پھر دعا کن الفاظ میں مانگتے ہیں۔ان کی دعا کا اثر کس طرح ہوتا ہے اور وہ کس طرح منزل قبولیت تک پہنچی ہے۔اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو اٹھتے بیٹھتے اور اپنی کروٹوں پر لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور وفکر کرتے ہیں۔اس کے بعد اپنے ہاتھ بارگاہ ایزدی میں اٹھا کر یوں گویا ہوتے ہیں۔ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے بے حکمت نہیں بنایا، تیری ذات ہر عبث سے پاک ہے پس ہمیں عذاب جہنم سے بچالے۔اے ہمارے پروردگار! تو نے جسے جہنم میں ڈالا اسے یقیناً رسوا کیا پھر ظالموں کا کوئی مددگار بھی نہ ہوگا۔

اے ہمارے رب! ہم نے ایک ندا دینے والے کو سنا جو ایمان کی دعوت دے رہا تھا: اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے،تو اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں سے درگزر فرما اور ہماری خطاؤں کو دور فرما اور نیک لوگوں کے ساتھ ہمارا خاتمہ فرما۔پروردگار! تو نے اپنے رسولوںؑ سے مغفرت کا ہم سے جو وعدہ کیا ہے وہ ہمیں عطا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا، بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

طلبِ عفو

انسان خطا کا پتلا ہے۔غلطی، کوتاہی اور سستی اس کا معمول ہے۔گناہ اور معصیت سرزد ہو جانے کے بعد فوراً خدا کی بارگاہ میں جھک جانا چاہیے۔اور اپنے رب کو یوں پکارنا چاہیے۔

ترجمہ پروردگار ہم سے بھول چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ فرما، پروردگار ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم سے پہلوں پر ڈال دیا تھا۔پروردگارا! ہم جس بوجھ کے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے وہ ہمارے سر پر نہ رکھ۔پروردگارا! ہمارے گناہوں سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو ہمارا مالک ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری نصرت فرما۔

مفاہیم اسلامیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

[سبق 1]

اتحاد بین المومنین

دنیا کے ہر میدان میں شیعانِ اہل بیتؑ کی کامیابی کا راز صرف ایک ہے اور وہ اُن کا اتفاق واتحاد اور مشکل اوقات میں ایک صف میں کھڑے ہونا۔ آیۃ اللہ شیخ محمد الیعقوبی ہمیشہ شیعہ مومنین کو ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق واتحاد کے ساتھ رہنے اور آپس میں دوریاں پیدا کرنے سے اجتناب کی تاکید کرتے ہیں۔ لہذا شیعہ مومنین کے درمیان کسی قسم کے نزاع کو ہوا دینا درست نہیں۔ کیونکہ یہ اُن کی کمزوری کا سبب بنتا ہے۔

اہل بیتؑ اتحاد کا مرکز

خدا نے اہلبیتؑ کی محبت کو مومنین کے مابین اتحاد کا ذریعہ بنایا ہے۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجودِ مبارک، قرآن کریم اور خانہ کعبہ تمام مومنین کے لیے رموزِ وحدت ہیں۔ اِسی طرح اہل بیت اطہارؑ کی محبت بھی مومنوں کے لیے اتحاد کا محور اور اُن کے دلوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنے کا ذریعہ ہے۔

محبت، ایمان ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل ہوئی ہے:

وَدّ المؤمن للمؤمن فی الله، من أعظم شعب الإیمان، ألا ومن أحبّ فی الله، وأبغض فی الله، وأعطی فی الله، ومنع فی الله، فهو من أصفیاء الله

ایک مومن کا خدا کی خاطر دوسرے مومن سے محبت کرنا ایمان کا عظیم ترین شعبہ ہے۔ جان لو کہ جو شخص خدا کے لیے کسی سے محبت کرے، خدا کے لیے کسی سے نفرت کرے، خدا کے لیے کسی کو دے اور خدا کے لیے کسی کو دینے سے ہاتھ روک لے۔ تو وہ خدا کے نیک اور منتخب بندوں میں سے ہوتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ خدا کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والے قیامت کے دن نوری تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔ اُن کے چہروں، اجسام اور منبروں کے نور سے ہر چیز روشن ہو جائے گی حتی کہ وہ اُسے دیکھ لیں گے۔ پھر کہا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو خدا کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ محبت رکھتے تھے۔

مومنین کے مابین اُخوت

احادیثِ معصومینؑ میں آیا ہے کہ مومن مومن کا بھائی، اُس کی آنکھ اور اُس کا راہنما ہوتا ہے۔ وہ نہ اُس کے

ساتھ خیانت کرتا ہے، نہ اُس پر ظلم کرتا ہے، نہ اُسے دھوکہ دیتا ہے اور نہ ہی اُس کے ساتھ ایسا وعدہ کرتا ہے جسے پورا نہ کر سکے۔

اہل بیتؑ بھی ہم سے یہی چاہتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کریں اور محض فقہی وثانوی عقائد کے اختلاف کی بنیاد پر ایک دوسرے کو برا نہ سمجھیں۔ کیونکہ ہمارا یہ عمل جہاں دشمنان اہل بیتؑ کو خوش کرتا ہے وہاں امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کے لیے دکھ اور اذیت کا باعث بنتا ہے۔ اگر ہم حقیقی شیعہ اور مولا امیرؑ کے چاہنے والے ہیں۔تو ہم پر واجب ہے کہ ہر اُس کو دل سے چاہیں کہ جو امیر المومنین علیہ السلام کا چاہنے والا ہو۔ اور اپنی آراء میں متشدد نہ بنیں ۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے جس میں ہمیں دشمنوں اور عالم نما جاہلوں نے مبتلا کیا ہے۔

اخوت وایمان کے درمیان تعلق

اہل بیت اطہارؑ نے برادران ایمانی کے درمیان تعلق کی بہت سی تفاصیل بیان فرمائی ہیں۔اُن میں سے چند یہ ہیں:

امام جعفر صادق علیہ السلام سے وارد ہوا ہے کہ اُخوت کے لیے تین چیزیں ضروری ہوتی ہیں:۔(۱) ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کرنا۔(۲) باہمی ہمدردی وشفقت۔(۳) حسد سے بچنا۔

ایک دوسری روایت میں آپؑ سے مروی ہے:

المؤمن أخو المؤمن عينه ودليله، لا يخونه ولا يظلمه، ولا يغشّه ولا يعده عدة فيخلفه

مومن، مومن کا بھائی، اُس کی آنکھ اور اُس کا راہنما ہوتا ہے۔ وہ نہ اُس سے خیانت کرتا ہے، نہ اُس پر ظلم کرتا ہے، نہ اُسے دھوکا دیتا ہے اور نہ ہی اُس کے ساتھ وعدہ خلافی کرتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

خير إخوانك من أعانك على طاعة الله وصدّك عن معاصيه وأمرك برضاه

تمہارا سب سے اچھا بھائی وہ ہے کہ جو خدا کی اطاعت کے معاملہ میں تمہاری مدد کرے، تمہیں گناہوں سے روکے اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی ترغیب دے۔

مولائے متقیان حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے روایت نقل ہوئی ہے کہ تمہارا سب سے بہترین بھائی وہ ہے کہ جو خیر واچھائی کی طرف سبقت کرے اور تجھے اُس کی طرف مائل کرے۔ تجھے نیکی کی ترغیب دلائے اور اُس پر تمہاری مدد کرے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: تمہارا سب سے اچھا بھائی وہ ہے کہ جو ہدایت کی طرف تمہاری راہنمائی کرے، تمہیں تقوی اختیار کرائے اور ہوائے نفس کی پیروی سے روکے۔

آخر میں ہم اپنے تمام مومن بھائیوں اور دوستوں کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ ہمیشہ محبت واتحاد کے ساتھ رہیں اور کسی بھی قسم کے فتنہ وانتشار کا حصہ نہ بنیں۔ جو بھی تمہیں ایک دوسرے سے لڑانے کی کوشش کرے، سمجھ لو کہ وہی تمہارا دشمن ہے اور تمہیں اکٹھا نہیں دیکھ سکتا۔ ہم پاکستان کے شیعہ مومنین کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ آپ کے لیے بالکل بھی درست نہیں کہ ایک دوسرے کو غالی اور اس جیسے القابات سے یاد کریں۔ حالانکہ تم میں سے ہر ایک کے دل میں محمدؐ وآل محمدؐ کی محبت موجود ہے۔ اِس لیے تمہیں سطحی اختلافات کو نظر انداز کر کے ہمیشہ ایک دوسرے کے لیے محبت واحترام کا جذبہ رکھنا چاہیے۔

جب فتنہ کھڑا ہوتا ہے کہ تو وہاں نہ کوئی مددگار ہوتا ہے اور نہ ہی نکلنے کی راہ نظر آتی ہے۔ لہذا فتنہ سب اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس لیے آپ سب کو چاہیے کہ اپنے اندر انتشار کی فضا پیدا نہ ہونے دیں۔ کیونکہ اِس کے اثرات نسلوں تک جاتے ہیں اور اس میں دنیا وآخرت دونوں کا خسارہ ہے۔ ہم سارے مذہب اہل بیتؑ کے ماننے والے ہیں، ہم سب فقہ جعفری پر عمل کرنے والے ہیں، ہم سب غم حسینؑ مناتے ہیں۔ ہم سب کو عشق علیؑ میں قتل کیا جاتا ہے اور کافر کہا جاتا ہے ۔تو پھر کیا بہتر نہیں کہ ہم خود سے الجھنے کی بجائے اکٹھے ہو کر اپنے دشمن کا سامنا کریں۔

کیونکہ یہ فتنہ روحِ ایمانی کا دشمن ہے۔ اور اس میں دنیا وآخرت دونوں کا خسارہ ہے۔

[سبق2]

اِسلام میں علماء کا مقام

اِسلام میں علماء کرام کو خاص مقام حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

فضل العالم علی غیرہ کفضل النبی علی أمته

ایک عالم کی دوسرے شخص پر فضیلت وہی ہے کہ جو ایک نبیؑ کی اپنی اُمت پر ہوتی ہے۔

جب ہم شہید محمد باقر صدر، السید امام خمینی جیسی شخصیات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس حدیث کی عملی تصویر نظر آتی ہے۔ اِسی طرح مرجع یعقوبی کے نزدیک علماء کی اہمیت کئی اعتبار سے ظاہر ہوتی ہے۔

مثلاً جب مرجع عالی قدر شیخ محمد یعقوبی (دام ظلہ) اپنی کتابوں میں علماء کا حوالہ دیتے ہیں۔ تو اُن کا ذکر نہایت

ادب واحترام کے ساتھ کرتے ہیں۔آپ علماءِ اسلام کے لیے ایسے ایسے خوبصورت القابات استعمال کرتے ہیں کہ جو دوسری شخصیات کے متعلق استعمال نہیں کرتے۔جیسے آپ شیخ کلینیؒ کا ذکر کرتے ہوئے کبھی اُنہیں ثقۃ الاسلام والمسلمین کہتے ہیں، کبھی اُنہیں حجۃ الفرقہ، کبھی ثقۃ الفرقہ، کبھی شیخ المحدثین اور کبھی افضل المحدثین کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

شیخ نصیرالدین طوسی (قدس سرہ) کو افضل المتاخرین اور اکمل المتقدمین کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔شیخ بہائی رضوان اللہ علیہ کو الشیخ الجلیل العارف اور علامہ مجلسی (طاب ثراہ) کو محقق و مدقق کہہ کر یاد کرتے ہیں۔یہ آیۃ اللہ شیخ محمد یعقوبی (دام ظلہ) کا علماء ومحدثین کی تعظیم وتجلیل کا انداز ہے۔

شیخ یعقوبی کی عملی سیرت میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نجفِ اشرف میں نظامِ مرجعیت کی قیادت میں علماءکرام کو تمام مؤسساتِ حوزوی اور اِسلامی سرگرمیوں میں اپنی آنکھ اور ہاتھ کی طرح خدمت کا موقع فراہم کرتے ہیں۔آپ نے تمام اداروں میں اپنی زیرسرپرستی علماء کو مامور کیا ہوا ہے۔اور کسی بھی ادارے کو علماء کی نگرانی کے بغیر نہیں چھوڑا۔

جہاں تک آپ کے آراء وافکار کی بات ہے۔تو اُس میں بھی ہمیں علماء کے احترام اور اُن سے محبت وعقیدت کی ایک خوبصورت جھلک نظر آتی ہے۔علماء کے چندایک خصائص حسبِ ذیل ہیں:

1 انبیاءؑ کے وارث

علماء انبیاءؑ کے وارث ہیں۔مگر وہ مال ومتاع کے اعتبار سے انبیاءؑ کے وارث نہیں۔ بلکہ علم اور اُمت کی قیادت کے اعتبار سے وارث ہیں۔جیسا کہ روایات میں بھی اِس حقیقت کی طرف اِشارہ کیا گیا ہے۔

چنانچہ سرکارِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

العلماء ورثة الأنبياء، يحبهم أهل السماء، ويستغفر لهم الحيتان في البحر إذا ماتوا إلى يوم القيامة

علماء انبیاءؑ کے وارث ہیں۔آسمان والے اُن سے محبت کرتے ہیں۔اور جب وہ دنیا سے جاتے ہیں کہ تو سمندر میں مچھلیاں قیامت تک اُن کے لیے طلبِ مغفرت کرتی رہتی ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: عالم ينتفع بعلمه افضل من سبعين الف عابد ''جس عالم کے علم سے استفادہ کیا جائے وہ ستر ہزار عبادت گزاروں سے افضل ہے۔'' (الکافی: جلد ۱ ص ۸۶)

امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے:

من تعلم العلم و عمل به و علم لله، دعي في ملكوت السماوات عظيما، فقيل: تعلم لله، و عمل لله، و علم لله

''جو شخص علم سیکھے، اُس پر عمل کرے اور خدا کی خوشنودی کے لیے اُس کی تعلیم دے تو اُسے آسمانوں میں'' عظیم'' کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اِس شخص نے خدا کی رضا کے لیے علم سیکھا، خدا کے لیے اُس پر عمل کیا اور خدا کے لیے ہی دوسروں کو سکھایا۔''

ایک دوسری روایت میں آپؐ سے مروی ہے کہ

العلماء مصابيح الأرض، وخلفاء الأنبياء، وورثتي ورثة الأنبياء".

علماء زمین کے چراغ، انبیاء کے خلفاء، میرے اور باقی تمام نبیوںؑ کے وارث ہیں۔

ہمیں اِس بات سے آشنا ہونا چاہیے کہ علماء کرام کا اختیار ایک مخصوص دائرہ تک محدود نہیں ہے۔ مثلاً ڈاکٹر کا کام انسانی بدن کی بیماری وصحت سے متعلق ہے، انجینیر صرف ہندسی اَشکال کو دیکھتا ہے، الیکٹریشن بجلی سے متعلقہ کاموں کو انجام دیتا ہے۔ لیکن علماء کرام چونکہ انبیاءؑ کے وارث ہوتے ہیں۔

اِس لیے بدیہی ہے کہ اُن کا دائرہ ایک خاص حد تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی علماء کو صرف ایک خاص شعبے تک محدود سمجھ کر اُن کے ساتھ تعامل کرے تو وہ غلط تصور کیا جائے گا۔ کیونکہ جہاں جہاں اِسلام کی ضرورت ہے وہاں وہاں علماء کی ضرورت ہے۔ اور دنیا میں کوئی ایسا مقام نہیں کہ جہاں اِسلام کا عمل دخل نہ ہو۔ اِسلام ایک نظامِ حیات کا نام ہے کہ جو فرد، معاشرہ، اقتصاد، سیاست اور عسکریت وغیرہ تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔

شیخ یعقوبی (دام ظلہ) فرماتے ہیں:

''علماء وہ قلعہ ہیں کہ جس کے ذریعہ اُمت کے عقائد کا تحفظ کیا جاتا ہے اور اُنہیں گمراہ کن فتنوں سے بچایا جاتا ہے۔ فقیہِ مرجع امامِ معصومؑ کا نائب ہوتا ہے۔ اِس سلسلہ میں آئمہ اہل بیتؑ کی بہت سی روایات موجود ہیں۔ اُنہی میں سے ایک روایت یہ ہے کہ جو امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف سے مروی ہے:

وأما الحوادث الواقعة فارجعوا فيها إلى رواة أحاديثنا فأنهم حجتي عليكم وأنا حجة الله

درپیش مسائل میں ہماری حدیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو کہ بے شک میری طرف سے تم پر حجت ہیں اور میں خدا کی طرف سے حجت ہوں۔''

2۔ اِسلام کے مظہر وقائدین

اِسلام کی حقیقی معرفت علماء کے بغیر ممکن نہیں۔ اُنہی کے ذریعہ سے علمی وعملی ارتقاء کا حصول ممکن ہے۔ علماء سے ہٹ کر کسی کے پاس جا کر اِسلام کا پوچھنا وہم اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں مولا امیر المومنین

علیہ السلام سے مروی ہے: **العلماء، هم الادلاء علی الله** ''علماء ہی خدا کی معرفت کرانے والے ہیں۔''

اس حوالہ سے آیۃ اللہ السید خمینیؒ کے ارشادات بھی موجود ہیں کہ جو اِس معنی کی تاکید کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

المعمم یعنی الإسلام فالعلماء اندمجوا فی الإسلام

''صاحب عمامہ اسلام کی شناخت ہے۔لہذا علماءِ اسلام کا حصہ ہیں۔''

شیخ یعقوبی فرماتے ہیں: علماءِ اسلام کا مضبوط ومحکم قلعہ ہیں۔اور عادل مجتہد آئمہ معصومینؑ کا نائب ہوتا ہے۔ اِسی نیابت کی وجہ سے اُس کا حکم نافذ اور اطاعت واجب ہوتی ہے۔

3۔اِسلام کے اہداف کا اظہار

کلمہ حق اور فرمان عالم ایک خاص معنی رکھتا ہے اور اُمت پر اُس کا بہت گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔ایک عالم کی طرف سے جاری ہونے والا فرمان لوگوں کیلئے صحیح سمت متعین کرتا ہے۔اور اُمت اُس پر عمل پیرا ہو کر اُن الٰہی اہداف کو پالیتی ہے کہ جو خداوند متعال نے انسان کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔علماء اپنے فرمان کے ذریعہ اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ نوعِ انسانی کو امان اور نجات کے ساحل پر پہنچا دیں۔

4۔اِسلام کے حقیقی خدام

شیخ یعقوبی فرماتے ہیں کہ ہمارے اُستادِ بزرگوار السید شہید صدر ثانی (قدس سرہ) نے اپنے عمل کے ذریعہ مثال پیش کی ہے کہ ایک نائبِ امام فتوی دینے، رسائلِ عملیہ کی تالیف اور حوزاتِ علمیہ کے اُمور کی دیکھ بھال کے علاوہ کیسے کیسے قائدانہ کردار ادا کرسکتا ہے۔مثلاً امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کے ظہورِ پرنور کی راہ ہموار کرنا، اِسلامی شعور بیدار کرنا، معارفِ قرآنی کو عام کرنا، فسادات وانحرافات کا خاتمہ کرنا، ظالم حکومتوں کے خلاف قیام کرنا، اُمت کو کمال عطا کرنا، لوگوں کے اُمور کی دیکھ بھال اور اُن کی خوشحالی و بہتری کے لیے کام کرنا۔جیسا کہ آپ کے اعمال اور فکری موسوعات اِس کے گواہ ہیں۔

علماء کے اِس کردار کی طرف بہت سی روایات میں اِشارہ موجود ہے۔مثلاً ایک روایت میں ہے:

إن مثل العلماء کمثل النجوم فی السماء یهتدی بها فی ظلمات البر والبحر، فإذا انطمست النجوم أوشك أن تضل الهداة

بے شک علماء کی مثال آسمان کے ستاروں جیسی ہے۔جن سے خشکی وتری کی تاریکیوں میں راہنمائی لی جاتی ہے۔جب ستارے ڈوب جائیں تو قریب ہے کہ سیدھی راہ پر چلنے والے گمراہ ہوجائیں۔

امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کے دورِ غیبت میں علماء کا کردار بہت اہم ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں امام علی نقی علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

لو لا من يبقى بعد غيبة قائمنا عليه السلام من العلماء الداعين إليه، والدالين عليه، والذابين عن دينه بحجج الله، والمنقذين لضعفاء عباد الله من شباك إبليس ومردته، ومن فخاخ النواصب، لما بقي أحد إلا ارتد عن دين الله

''اگر ہمارے قائم عجل اللہ فرجہ الشریف کی غیبت کے بعد ایسے علماء موجود نہ ہوں کہ جو آپؑ کی طرف دعوت دینے والے، آپؑ کی طرف راہنمائی کرنے والے، خدائی دلیلوں سے آپؑ کے دین کا دفاع کرنے والے اور خدا کے کمزور بندوں کو ابلیس کی چالوں وسرکشیوں اور نواصب کے پھندوں سے بچاتے ہیں۔ تو سب کے سب دینِ خدا سے مرتد ہوجاتے۔''

5۔ علماء کی صحبت

علماء کی طرف دیکھنا بھی عبادت اور سببِ موعظہ ہے۔ چنانچہ روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد ہوا ہے کہ عالم کا چہرہ دیکھنا عبادت ہے۔

ایک دوسری روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

من استقبل العلماء فقد استقبلني، ومن زار العلماء فقد زارني ومن جالس العلماء فقد جالسني ومن جالسني فكأنما جالس ربي

جس نے علماء کا استقبال کیا اُس نے میرا استقبال کیا۔ جس نے علماء کی زیارت کی اُس نے میری زیارت کی۔ جو علماء کے پاس بیٹھا وہ میرے پاس بیٹھا۔ اور جو میرے پاس بیٹھا وہ گویا خدا کے جوارِ رحمت میں رہا۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء کے پاس بیٹھنا بھی عبادت ہے۔

6۔ علماء کی سیاہی

علماء کے قلم کی سیاہی شہداء کے خون سے افضل ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ شہید کو خدا کے یہاں خصوصی مقام ومرتبہ ملتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادِ رب العزت ہے :

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ١٦٩

''اور جو لوگ خدا کی راہ میں مار دیے جائیں اُنہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں۔'' (سورۃ آل عمران)

روایاتِ معصومینؑ میں بھی شہداء کا مقام واضح ہے اِسی طرح شہداء کے خون سے قوم میں جو بیداری آتی ہے ۔وہ بھی اپنی جگہ حق ہے۔لیکن جب ہم علماء کی عظمت کے بارے میں روایات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ علماء جس سیاہی سے لکھتے ہیں اُس کے آثار شہداء کے خون سے کہیں بڑھ کر ہیں۔جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے:

یوزن یوم القیامة مداد العلماء ودم الشهداء فیرجح علیهم مداد العلماء علی دم الشهداء

قیامت کے دن علماء کی سیاہی کو شہداء کے خون کے ساتھ تولا جائے گا۔تو علماء کی سیاہی شہداء کے خون سے بھاری ہوجائے گی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا اور موازین نصب کیے جائیں گے۔شہداء کے خون کو علماء کی سیاہی کے ساتھ تولا جائے گا۔تو علماء کی سیاہی بھاری ہوجائے گی۔

[سبق3]

علماء کرام کی خدمات

اسلام میں علماء کی حیثیت کا سرسری اور مختصراً جائزہ لینے کے بعد، پچھلے سبق میں روایات اور احادیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے۔ہمیں یہ پوچھنے کا حق ہے کہ علماء کو یہ مقام کیسے ملا اور امامؑ کی نظر میں اُن کی اہمیت اتنی زیادہ کیوں ہے؟ اور روایات میں اُن کے کردار پر اس قدر تاکید کیوں کی گئی ہے؟

اب ہم تاریخ میں علماء کرام کے کردار کے بارے میں تھوڑی بحث کرتے ہیں۔تاکہ اسلام اور آئمہ طاہرینؑ کی نگاہ میں علماء کا مقام مزید واضح ہوجائے۔

تاریخ میں ہمیں علماء کا کردار دو حوالوں سے ملتا ہے:

(۱) علمی پہلو۔(۲) مجاہدانہ پہلو۔

علمی پہلو

شیخ یعقوبی علماء کرام کے اِس کردار کو نہایت اہم اور کلیدی مانتے ہیں ۔اُنہوں نے ایک دفعہ اپنے خطاب میں فرمایا:

علم ہر چیز کی تعمیر کی بنیادی اساس ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی زندگی فقہ اور اسلامی علوم کے لیے وقف کر دی تھی۔ آپؑ نے تشیع اور اِسلام کو عظیم علمی تشخص عطا کیا۔"

ہم اِس علمی پہلو کو تین بنیادی ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ جو علماء، مدارس اور مدرسین سے متعلق ہیں۔

1۔ دینی میراث کا تحفظ:

علماء نے اس مذہب کو اس کی تاریخ، تصورات، عملی اور اخلاقی نقطہ نظر اور عقائد کے ساتھ ہمارے لیے محفوظ کیا ہے۔ بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اِن اُمور کی حفاظت بہت آسان ہے اور اِس کے لیے کسی خاص تگ ودو اور اہتمام کی ضرورت نہیں۔ جبکہ حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ بالخصوص اِس لحاظ سے کہ شیعہ طول تاریخ میں سلاطین و حکمرانوں کے ہاتھوں پستے رہے۔

مسئلہ صرف یہ نہیں کہ تھا کہ کوئی ایسی حکومت نہیں تھی کہ جو علماء کی کوششوں کی حمایت کرتی اور انہیں ان کے کام کی بنیادی تقاضے فراہم کرتی۔ بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ یہ حکومتیں تسیع اور شیعوں کے خلاف محاذ آراء تھیں۔ ان کی کتابوں کو تلف اور علماء کرام کو شہید کیا گیا۔ ایسے میں اگر علماء و بزرگان ملت کی زحمات اور قربانیاں نہ ہوتیں تو یہ دین ہم تک نہ پہنچ پاتا۔

تاریخ میں ایسے نوابغ کی قربانیوں کا تذکرہ سنہری الفاظ میں موجود ہے۔ مثلاً جناب محمد بن عمیر جو کہ امام موسیٰ کاظم اور امام علی رضا علیہما السلام کے اصحاب میں سے ہیں۔ وہ چار سال مامون کی قید میں رہے اور اُن پر اِس قدر سختی کی گئی ہے کہ اُن کی بہن کو اُن کی کتابیں زیر زمین دفنانا پڑیں۔ تاکہ مامون کے سپاہیوں کے ہاتھ نہ لگیں۔ اِس عمل سے ایک طرح کا تحفظ تو ہوا، مگر کتابیں مٹی میں رہنے کے باعث ضائع ہو گئیں۔ البتہ ابن عمیر نے وہ احادیث حفظ کی ہوئی تھیں۔ لہذا وہ اپنے حافظہ کی بنیاد پر اُنہیں آگے بیان کرنے لگے۔

اس ورثے کو محفوظ رکھنا ایک مشکل اور بھاری کام ہے جو اہل علم کے کندھوں پر ہے۔

علمائے کرام نے ہمیشہ اس مشن اور اس جہاد کو انجام دیا ہے اور ان میں سے بہت سے لوگ اس کے لیے شہید ہوئے، جیسے جبل عامل میں شہید سید عبدالحسین شرف الدین، شہید سید محمد باقر الصدر شہید سید محمد صادق الصدر اور دوسری جلیل القدر شخصیات مثلاً شہید شیخ مرتضی مطہری وغیرہ۔ (قدس اللہ ارواحہم)

آیۃ اللہ الشیخ محمد یعقوبی (دام ظلہ) اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قرآنی علوم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آثار واحادیث، سنت اور سیرت طیبہ کو جمع کرنا، اُن کی تالیف و اِشاعت آسان کام نہیں تھا۔ بالخصوص ایسے حالات میں کہ جب وسائل نہایت ہی محدود تھے اور وقت کی جابر حکومتیں اپنی پوری

طاقت کے ساتھ اُنہیں ضائع و نابود کرنے کے درپے تھیں۔

بحمداللہ! یہ اُن بزرگان کی مخلصانہ و مجاہدانہ کاوشیں ہی تھیں۔ جن کی بدولت آج ہمارے علمی سرمائے محفوظ ہیں۔ جیسے کتبِ اربعہ اور متقدمین و متاخرین کی فقہ، فلسفہ، ریاضی، علم نجوم، اصول، دینیات، حدیث، رجال، تفسیر، ادب، عرفان، لغت، اور دیگر تمام علوم وفنون کے شہ پاروں کی حفاظت جمع آوری اُنہی اجلہ کے کارہائے نمایاں میں سے ہیں۔ اِن خدمات کے اعتراف کے لیے جہاد فی سبیل اللہ سے کم تر لفظ کا استعمال مناسب نہیں ہے۔''

آپ مزید فرماتے ہیں:

یہ وہ دینی مراکز ہیں جنہوں نے اب تک اسلام کو محفوظ رکھا ہے۔ اگر علماء کا وجود نہ ہوتا تو اسلام کا ذکر ہی نہ ہوتا۔ بے شک علماء ہی ہیں جنہوں نے مشکل حالات اور کٹھن ادوار میں تعلیماتِ اِسلام کی حفاظت وترویج کا فریضہ انجام دیا۔ اُن کی خدمات شاہد ہیں کہ وہ اِسلام اور قرآن کے ساتھ کس قدر مخلص تھے۔'' (جزاہم اللہ عن الاسلام خیر الجزاء)

2۔ ترجمہ وشرح

کیونکہ حوزہ اور علماء کا کام صرف حدیث وسیرت نقل کرنا ہی نہیں۔ بلکہ اِن الفاظ کی صحیح ترجمہ اور شرح بھی علماء حوزہ ہی کے ذمہ داری ہے۔ جسے انجام دینا واجب ہے۔

ہر زبان الفاظ سے مل کر بنتی ہے جو اپنے اندر معانی اور معین مفاہیم رکھتے ہیں۔ جب وہ اہل ہوا و ہوس کے پاس آتے ہیں تو وہ اُنہیں توڑ مروڑ کر اُن معانی کی طرف پھیر لیتے ہیں۔ جو مرادِ باری سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ ہمارے سمجھنے کے لیے آیتِ وضو ہی کافی ہے جس میں صاف ذکر ہے کہ جب نماز کے لیے کھڑے ہو تو چہرے اور کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں کو دھولو اور اپنے سروں اور پیروں کا اُبھرے ہوئے مقام تک مسح کرلو۔ یہاں قرآن نے وضو کا طریقہ بالکل صاف اور واضح الفاظ میں ذکر کر دیا اور بتا دیا کہ سر اور پاؤں کا مسح کرنا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اِس کے باوجود بھی بعض مسلمان ارجلکم کو ایدیکم پر عطف کرتے ہیں اور پاؤں دھونے کے وجوب کا فتوی صادر کرتے ہیں!

مسلمانوں نے آیت کے متن میں اختلاف نہیں کیا کیونکہ یہ قرآن کریم ہے اور اس میں باطل اس کے آگے یا پیچھے سے نہیں آسکتا۔ بلکہ یہاں اختلاف تفسیر وتوضیح کا ہے۔ اور یہ اختلاف حقائق میں رد وبدل کا سبب بن سکتا ہے۔ اِس لیے دین کی حفاظت الفاظ کی حفاظت میں ہی پوشیدہ ومضمر ہے۔ بلکہ الفاظ کے ساتھ ساتھ اُن کے صحیح معانی و شروحات کی حفاظت اور اُنہیں اُسی حالت میں لوگوں تک پہنچانا بھی ضروری ہے۔

یہ بھی ایک قسم کا جہاد ہے۔ جو علماء کرام نے انجام دیا ہے۔ فقہاء ہی ہمیشہ ضامن رہے ہیں کہ کسی بھی طریقہ

سے اِن مفاہیم میں تحریف نہ کی جا سکے۔اور یہ ان مفاہیم کی نئے حوادث پر تطبیق کے علاوہ کام ہے۔

شہید باقر الصدر قدس سرہ نے علماء کے اِس کردار کو نہایت ہی عمدہ الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔اُنہوں نے اپنے ایک خطاب میں ارشاد فرمایا:

اگر فقہاءِ عظام کا وجود نہ ہوتا تو عام لوگوں کے لیے علومِ قرآن، اِسلام اور علومِ اہل بیتؑ سے آشنائی کا کوئی اور راستہ ہی نہ تھا۔

طول تاریخ میں ہمارے علماء نے اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دی ہیں۔جیسا کہ مرجع عالی قدر شیخ محمد یعقوبی دام ظلہ اس طرف اِشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر صدرِ اِسلام سے اب تک فقہاء کا وجود نہ ہوتا تو ہمیں اِسلام کے بارے میں کچھ خبر نہ ہوتی۔بے شک فقہاء نے ہی ہمیں اسلام سے آشنا کیا ہے۔اُنہوں نے فقہِ اِسلامی کو پڑھا اور اُسے لکھ کر محفوظ کیا۔اور اُنہوں نے اِس اہم ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے اِس امانت کو ہم تک پہنچایا۔

3۔دین کی نشرو تبلیغ

علماء کرام نے اِس دین کی حفاظت وتشریح کے ساتھ ساتھ اِسے لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی خود اُٹھائی۔اور اِس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کیا اور اِس مقصد کے حصول کے لیے بہت علماء حتی کہ مراجع عظام بھی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔جیسے صاحب لمعہ شہیدِ اول محمد بن مکی العاملی، جو کہ اپنے زمانے کے بزرگ مرجع اور معروف شیعہ عالم تھے۔اُنہیں پورا سال دمشق کے قلعہ میں محصور رکھا گیا اور اُس کے بعد اُنہیں شہید کر کے سر مبارک تن سے جدا کر دیا گیا۔

اُن کا قصور یہی تھا کہ وہ زمانے کے حاکم کے مذہب پر ہونے کی بجائے اہل بیتؑ کے شیعہ تھے۔اُن کے بعد شارح لمعہ شہید ثانی کو بھی اِسی جرم میں شہید کیا گیا۔اِسی طرح تاریخ میں بہت سے علماء وافاضل کو محبتِ اہل بیتؑ کی وجہ سے قتل کیا گیا۔لہذا یہ کہنا بجا ہے کہ علماءِ اِسلام نے دین کے احکام کی نشرو اشاعت میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے ہیں۔

آیۃ اللہ حضرت امام خمینیؒ نے اِس حقیقت کی طرف یوں اِشارہ کیا ہے:''علماءِ اِسلام نے خدا کے حلال و حرام کی ترویج میں اپنی عمریں صرف کر دیں اور اُنہیں ہر طرح کی کمی زیادتی سے محفوظ رکھا۔''

جہادی پہلو

علماءِ اِسلام نے صرف علم اور علمی مسئولیات کو ہی اپنے ذمہ نہیں لیا۔بلکہ اُنہوں نے اِس کے ساتھ ساتھ اپنے

وقت کے ظالموں بادشاہوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسلامی معاشرے کو اُن کی شرانگیزیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے جملہ وسائل صرف کیے۔ آیۃ اللہ یعقوبی علماء کے اس کردار کی اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہمارے علماء نے ایک طرف تو علمی اور ثقافتی جہاد کیا۔ جو کہ درحقیقت اپنے بعض جوانب کے اعتبار سے شہداء کے خون سے زیادہ مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے بزرگان نے مقدساتِ دینیہ اور وطن کے دفاع کی خاطر زمانے کی تلخیوں کا بھی سامنا کیا۔ کبھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں تو کبھی جلاء وطنی اور اپنوں کی جدائی کا دکھ سہنا پڑا۔ اور بہت سے علماء درجۂ شہادت پر بھی فائز ہوئے۔

جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ سید عبدالحسین شرف الدین، جو کہ ایک مجاہد عالم دین تھے۔ اُنہوں نے فرانسیسیوں کے اسلامی ممالک پر ناجائز اور ظالمانہ تسلط کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ ایران میں علامہ مدرسی نے ظالم حکومتوں کو للکارا اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ اسی طرح مرجع کبیر سید میرزا حسن شیرازی نے تنبا کو کے خلاف تحریک کو کامیاب بنا کر دنیائے ظلم و جبر کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ ہمارے علماء میدان جہاد میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

مرجع عالی قدر شیخ یعقوبی (دام ظلہ) فرماتے ہیں:

''حوزہ اور اس کے علماء شہادت کے حصول میں ہمیشہ سبقت رکھتے تھے۔ بہت سے علماء کو تختۂ دار پہ لٹکایا گیا۔ اُن کے پاکیزہ جسموں نے خونی سوانح میں سبقت کر کے شہادت کا درس دیا۔ کتنے ہی علماء شہید ہوئے اور اسلام و مقدسات دینی کے دفاع میں اپنے جانیں قربان کیں؟ کیا زمانہ بھول گیا ہے کہ شہیدِ اول کون تھا؟ شہید ثانی کون، شہید صدر کون تھا اور شہید مطہری کون تھا؟ (یہ سب علماء ہی تو ہیں۔)''

آپ مزید فرماتے ہیں: ''جو بھی تاریخ کا مطالعہ رکھتا ہے وہ بخوبی واقف ہے کہ طولِ تاریخ میں جن شخصیات نے ظالموں کے تسلط اور فساد کے خلاف قیام کیا وہ علماء ہی تھے۔''

ممکن ہے کہ کوئی یہ گمان کرے کہ یہ کچھ شخصیات خداداد صلاحیتوں کی مالک تھیں اور یہ اُن کا ذاتی عمل و کردار ہے۔ اس میں حوزہ کا کوئی کردار نہیں اور نہ ہی حوزہ ایسی فکر دیتا ہے۔ اسی لیے کچھ لوگ یہ مشہور کر دیتے ہیں کہ حوزہ ایسی شخصیات سے بالکل لاتعلق اور اُن سے اظہارِ برات کرتا تھا۔ اس تو ہم کے ازالہ کے لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امام خمینیؒ نے حوزہ کا منہج ہی یہی بتایا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

ان الحوزات العلمیة هی التی حفظت الاسلام حتی الآن

''بے شک حوزاتِ علمیہ نے ہی اب تک اسلام کی حفاظت کی ہے۔''

علماء کا کردار طاغوتوں اور متکبرین پر بھی مخفی نہیں۔ وہ ہمیشہ علماء ہی کو اپنا ہدف بناتے ہیں۔ ہمیشہ استعمار کے حملے علماء پر ہی ہوتے ہیں۔ اور صرف استعمار ہی علماء کو نشانے پر نہیں رکھتے، بلکہ اُن کے علاوہ بھی کچھ عوامل ہیں جو علماء کے استھداف اور اُنہیں ٹارگٹ کیے جانے کا سبب بنتے ہیں۔ یہاں ہم اُن عوامل پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

علماء و مراجع ہی نشانہ کیوں؟

جب استکباری اور استعماری قوتیں دیکھتی ہیں کہ علماء نے اُمت کو متحد کیا اور اُنہیں شعور و بیداری فراہم کر رہے ہیں۔ تو یہ اُن کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھتا ہے۔ لہذا وہ اپنا سارا زور اِس بات پر لگاتے ہیں کہ کسی طریقہ سے قلعہ اور حصار کو توڑا جائے۔ تاکہ وہ عوام اور اُن کے وسائل پر حکومت و تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔ لہذا آج کے دور میں علماء عالمی استکباری قوتوں کا سب سے بڑا ہدف ہیں۔ وہ کئی طریقوں سے علماء کو نشانہ بناتے ہیں۔ مثلاً لوگوں کو علماء کے خلاف اُکسانا، اُن کے تشخص کو خراب کرنا، اُن کے خلاف پروپیگنڈا کرنا اور اسلام کو وحشت و دہشت گردی کے مذہب کے طور پر متعارف کرانا۔

وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ اِسلام کا روشن چہرہ دنیا کے سامنے آئے اور لوگوں کو دینِ اِسلام کے اَمن و محبت کے پیغام کے بارے میں آگاہی ہو۔ وہ اِسلام کو دہشت گردی کے نام سے مشہور کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں دہشت گرد وہ خود ہیں۔ اُنہوں نے خود افغانستان، شام، عراق اور پوری دنیا میں دہشت گرد تنظیمیں بنائیں اور اُن کی سرپرستی کی۔

''تہذیب کا تصادم'' کتاب کے مصنف سیموئل ہنٹنگٹن نے کہا کہ اسلام اور چین مغرب کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ وہ سنی اسلام سے نہیں ڈرتے جو امریکہ اور اسرائیل کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ بلکہ وہ اَصل محمدی اور علوی اسلام سے ڈرتے ہیں۔ جو امام زمانہؑ کی غیبت کے دور میں فقہاء کے علاوہ کسی کی ولایت کو نہیں مانتا۔

بنی عباس کو بھی اپنی حکومت کے ادوار میں ہمارے آئمہؑ سے اسی بات کا کھٹکا رہتا، باوجود اس کے کہ حکومت ان کے ہاتھ میں ہے اور وہ آہنی ہاتھوں سے عوام پر حکومت کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اُنہیں برابر اِس بات کا خوف رہتا کہ کہیں لوگ اُنہیں چھوڑ آئمہ اہل بیتؑ کو اپنا حاکم نہ بنا لیں۔ یہ خوف ہمیشہ اُن کے جان کے درپے رہتا اور آج کے دور میں اُنہیں مرجعیت سے بھی یہی خوف ہے۔

وہ جانتے ہیں کہ شیعہ فقہاء اور مراجع خدا کی خاطر کسی ملامت کرنے والے کے الزام سے نہیں ڈرتے۔ وہ اسلام، قرآن اور اہل بیت (علیہم السلام) سے اپنی وفاداری میں مخلص ہیں۔ اس لیے اُمت کی ذمہ داری ہے کہ فقہاء کا ساتھ دیں اور جملہ اُمور میں اُن کی طرف رجوع کریں۔ یہی امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کے فرمانِ مبارک کا

مطلب ہے کہ جب آپؐ نے اُنہیں حجت کہا۔ آپؑ کا ارشاد گرامی ہے:

وأمّا الحوادثُ الواقعةُ فارجعُوا فيهَا إلى رُواةِ حديثِنَا، فإنّهُم حُجّتِي عليكُم وأنا حُجّةُ اللّهِ.

نئے پیش آنے والے مسائل میں ہمارے احادیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو، کیونکہ وہ تم پر میری حجت ہیں اور میں خدا کی حجت ہوں۔

[سبق 4]

تقلید اور مرجعِ تقلید

تقلید سے مراد مکلف کا حکمِ شرعی جاننے کے لیے جامع الشرائط مجتہد کی طرف رجوع کرنا ہے۔ زمانۂ غیبت میں جامع الشرائط مجتہد کی تقلید کے وجوب کی دلیل کے لیے امام حسن عسکری علیہ السلام کی روایت ہی کافی ہے۔ اُس میں ہے:

فأمّا من كان من الفقهاء صائناً لنفسه حافظاً لدينه مخالفاً لهواه مطيعاً لأمر مولاه فللعوام أن يقلدوه

''فقہاء میں سے جو بھی خود کو گناہوں سے بچانے والا، اپنے دین کی حفاظت کرنے والا، اپنے ہوائے نفس کی مخالفت کرنے والا اور اپنے مولا کی اطاعت کرنے والا ہو تو عوام کو چاہیے کہ اُس کی تقلید کریں۔''

عقلاء میں یہ بات عام فہم ہے کہ جاہل عالم کی طرف جوع کرتا ہے۔ مکلفین کے لیے احکامِ تقلید اِس لیے بیان کیے گئے ہیں کہ وہ احکامِ شرعیہ کی انجام دہی میں مخاطب و مسئول ہیں۔ جب ہم بذاتِ خود احکامِ شرعیہ کو اُن کے مصادر سے استنباط و اخذ نہیں کر سکتے تو ہمارے لیے امین فقہاء کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ تاکہ وہ ہمیں صحیح حکم کی جانب راہنمائی کریں۔ اِسی سے افتاء کی ذمہ داری سامنے آتی ہے کہ جو مراجع تقلید سے مربوط ہے۔

مرجع تقلید کی شرائط

1 **اجتہاد، یا فقاہت**۔ یعنی احکامِ شرعیہ کو اُن کے مصادر سے اخذ و استنباط کرنے کی صلاحیت کا حامل ہونا۔

2 **عدالت و تقوی**: یعنی مجتہد عادل و متقی ہو تاکہ اِس اَمر کا اطمینان ہو جائے کہ وہ جو فتوی دے رہا ہے درحقیقت وہی اُس کا اجتہاد ہے۔

3۔ **ضبط**۔ یعنی مجتہد کا حافظہ اور قوتِ یادداشت مضبوط ہو اور اکثر و بیشتر نسیان، سہو اور اشتباہ کا شکار نہ ہو۔

مرجع کی ذمہ داریاں

شیخ یعقوبی (دام ظلہ) نے اپنے رسالہ عملیہ جامع الشرائط فقیہ کی درج ذیل تین ذمہ داریاں ذکر کی ہیں:

1 افتاء: یعنی مکلفین کو پیش آنے والا مسائل کے بارے میں استنباط کے رائج طریقہ کار سے حکمِ شرعی نکال کر پیش کرنا۔

2 قضاوت: یعنی نزاعات واختلافات کا فیصلہ کرنا اور دیگر لوگوں کی فلاح کے اُمور انجام دینا۔

3 امت کے اُمور کی نگرانی کرنا۔

''آیۃ اللہ الشیخ محمد یعقوبی (دام ظلہ) کا مختصر تعارف''

آیۃ اللہ العظمی الشیخ محمد یعقوبی (دام ظلہ) ایسے فقہاء ومراجع میں شامل ہیں جن پر مذکورہ بالا صفات مکمل طور پر منطبق ہوتی ہیں۔ بلکہ نجف وقم کے حوزہ علمیہ کے بزرگان واَساتیذ کے بقول آپ کا وجود خدا کی بہت بڑی نعمت ہے ۔بندگان خدا کی خدمت آیۃ اللہ یعقوبی کی فطرت میں شامل ہے۔آپ اِسلام اور مسلمانوں بہت بڑے خیر خواہ ہیں۔ جیسا کہ عراق کے شیعوں کے لیے اُن کی خدمات پر تاریخ شاہد ہے۔آپ عراق کو اِس حوالہ سے بہت اہمیت دیتے ہیں کہ وہ امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کے دورِ حکومت میں آپؑ کا دار الخلافہ ہوگا۔ جیسا کہ آپ نے ایک دفعہ خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

العراق عاصمة الإمام المهدی (عج) فلا يجوز لأحد أن يعبث بالعراق

''عراق امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کی حکومت کا دار الخلافہ ہے۔ اور ہم ہرگز کسی کو اجازت نہیں دیں گے کہ وہ عراق کے ساتھ کھیلے۔''

فقاہت

آپ نے اپنے اُستاد آیۃ اللہ الشہید السید محمد صادق الصدر (قدس سرہ) کے ہاتھوں رتبۂ اجتہاد حاصل کیا۔ جیسا کہ آپ آیۃ اللہ سید علی السیستانی اور آیۃ اللہ الشیخ محمد اسحاق الفیاض (دام ظلہما) کے دروس میں بھی شریک ہوئے۔ شہید محمد صادق الصدر (قدس سرہ) نے اپنے جملہ شاگردوں میں سے آپ کی طرف خصوصی طور پر رجوع کرنے کی وصیت فرمائی۔

جب سید محمد صادق الصدر (قدس سرہ) صدام کے ہاتھوں شہید ہوئے تو شیعوں نے اپنے معاملات میں آپ

کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا۔ اور شرعی شہادتوں کی روشنی میں آپ کی مرجعیت ثابت ہوگئی۔ جن بزرگ شخصیات نے آپ کی مرجعیت کی شہادت دی اُن میں سماحۃ الشیخ محمد علی گرامی (دام ظلہ) اور سماحۃ آیۃ اللہ الشیخ محمد صادق طہرانی (قدس سرہ) سرفہرست ہیں کہ جنہیں 1386 ھ میں سید ابوالقاسم الخوئی (قدس سرہ) کی طرف اجازۂ اجتہاد حاصل تھا۔

آپ کی دقیق علمی ابحاث، بلند پایہ اخلاق اور مسلمانوں کو درپیش مسائل پر مشتمل فکر انگیز خطابات نے آپ کی مقبولیت میں بہت اضافہ کیا اور اس وجہ سے آپ کی طرف رجوع کرنے والے مومنین کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آج آپ کی مرجعیت سید علی السیستانی (دام ظلہ الشریف) کے بعد سب سے بڑی ہے۔

مرحوم مرجع السید محمود الہاشمی الشاہرودی (قدس سرہ) کہ جنہوں نے آیۃ اللہ العظمی سید علی خامنہ ای (دام ظلہ) کے اجتہاد کی شہادت دی، آیۃ اللہ یعقوبی (دام ظلہ) میں مضبوط اور اِسلام سے مخلص مرجعیت دیکھتے تھے۔

زہد و تواضع

آیۃ اللہ یعقوبی اپنے زہد و تقوی کے اعتبار سے اُسی معیار پر ہیں جس پر اہل بیتؑ اپنے چاہنے والوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو بھی آپ سے ملاقات کرتا ہے وہ آپ کو نہایت ہی سادہ اور عام سا انسان پاتا ہے۔ آپ کی زندگی اور لوگوں و مقلدین کے ساتھ میل ملاقات میں کوئی تکلف نظر نہیں آتا۔

آپ بلند علمی مرتبے پر فائز ہونے کے باوجود بھی دوسروں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ہنسی مزاح کرتے ہیں، جوانوں سے محبت کرتے ہیں اور جو بھی آپ کی زیارت سے مشرف ہوتا ہے اُسے دلی سکون و راحت محسوس ہوتی ہے۔ آپ نہایت سادہ اور متواضع زندگی گزارتے ہیں اور حوزہ کے عام طالب علموں جیسا لباس پہنتے ہیں۔

آپ کے متواضع اور منکسر المزاج ہونے کی دلیل یہ ہے کہ سید محمد صادق الصدر (قدس سرہ) کی شہادت کے بعد آپ نے اپنے اساتذہ آیۃ اللہ السید علی السیستانی اور آیۃ اللہ الشیخ اسحاق فیاض (دام ظلہما) کے احترام میں اپنے اجتہاد کا اعلان مؤخر رکھا۔ حتی کہ آپ کے شاگردوں اور حوزہ نجف کے بحثِ خارج کے اساتذہ نے بہت زیادہ اصرار کیا تو آپ نے صفر 1424 ھ بمطابق اپریل 2003ء میں کاظمیہ مقدسہ میں نمازِ جمعہ کے خطبات میں نہایت روحانی اور معنوی ماحول میں اپنے اجتہاد و مرجعیت کا اعلان کیا۔

علمی و عملی قابلیت

دور و نزدیک کے سب افراد آیۃ اللہ یعقوبی کی عظیم صلاحیتوں سے واقف ہیں۔ آپ نے کلیۃ الہندسہ جامعۃ بغداد سے 1982 میں سول انجینیرنگ میں گریجویٹ کیا۔ آپ مدیریت اور قیادت میں بھی کافی تجربہ رکھتے ہیں۔

آپ اپنی بصیرت، حکمت اور سیاسی وابلاغی اُمور میں فکر و درایت کے سبب آیۃ اللہ شہید محمد صادق الصدر (قدس سرہ) کے مقربین وخواص میں سے تھے۔ السید محمد صادق الصدر (قدس سرہ) اپنی شہادت سے قبل صدام حسین کی ڈکٹیٹر شب کے خلاف ایک نہایت ہی مؤثر تحریک چلا رہے تھے۔ جس سے صدام بہت زیادہ خائف تھا اور اُس آواز کو دبانا چاہتا تھا۔ اِسی راہ میں آپ کو 1999 میں المناک شہادت نصیب ہوئی۔

باوجودیکہ شیخ یعقوبی اصل نجفی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور آپ کا نسب انصار کے قبیلہ اَوس تک جاتا ہے۔ مگر 1968 اپنے خاندان کے ہمراہ بغداد تشریف لے آئے۔ کیونکہ آپ کے والد گرامی مرجع اَعلی السید محسن الحکیم (قدس سرہ) کے پوتے شہید السید مہدی الحکیم کی دینی، اجتماعی اور سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ مربوط تھے۔ سید مہدی بغداد میں دینی اور اجتماعی اعتبار سے بلند مرتبہ کے حامل تھے۔

شجاعت ومردانگی

آیۃ اللہ یعقوبی کی مجاہدانہ زندگی کے تمام حالات وواقعات آپ کی شجاعت ودلیری کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ کیسے آپ نے پوری زندگی اسلام اور تشیع کے دفاع میں گزاری۔

آپ نے صدام جیسے ظالم وجابر حکمران کے دور میں شہید جمعہ آیۃ اللہ السید محمد صادق الصدرؒ کی نصرت کی اور آپ کے غسل، کفن اور نمازِ جنازہ کی ذمہ داری اُٹھائی۔ جب کہ صدام کے فوجیوں کی بندوقوں کا رُخ جنازہ پڑھنے والوں کی طرف تھا۔ اُن حالات میں نجف اَشرف سے کوئی بھی السید محمد صادق الصدر کے جسمِ اطہر پر نمازِ جنازہ پڑھانے کا حوصلہ نہ رکھ سکا۔ لیکن ایسے مشکل ترین مرحلے میں شیخ یعقوبی نے آگے بڑھ کر ہمت کی شہید کی نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔ آپ کے ساتھ جنازہ پڑھنے والے نہایت کم تعداد میں تھے۔ بلکہ وہ ایک ہاتھ کی انگلیوں سے زیادہ تعداد میں نہ تھے۔

آپ کی شجاعت اور بہادری کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آپ نے سخت سے سخت حالات اور دشمنوں کی طرف سے ملنے والی مسلسل دھمکیوں کے باوجود بھی عراق کو نہیں چھوڑا اور خدا کی نصرت پر توکل کیا۔ خدا کا لطف ہے کہ اُس نے ایسے مشکل حالات میں آپ کو اشرار کے حملوں سے محفوظ رکھا۔ صدام کے کارندے اکثر آپ کا پیچھا کرتے اور آپ کو اُٹھانے کے لیے مختلف حربے اختیار کرتے۔ مگر آپ نے اِن حالات کی ذرا پرواہ نہیں کی اور عراق کے مومنین کے ساتھ ہی رہے۔ اگرچہ عراق سے باہر ایران وغیرہ میں موجود آپ کے اَقرباء مصر تھے کہ آپ عراق سے ہجرت کر کے کسی محفوظ جگہ منتقل ہوجائیں۔

آپ کے اہم ترین نظریات میں سے ایک نظریہ وہ ہے کہ جو آپ کی شجاعت اور بے باکی کی واضح دلیل ہے

۔اوروہ یہ کہ آپ نے پہلے دن سے ہی اَمریکی فوج کے ساتھ میل ملاقات اور ہر قسم کا راہ ورسم ممنوع قرار دیا تھا۔ کیونکہ آپ امریکیوں کو قابض اور ناجائز طور پر مسلط شدہ سمجھتے تھے کہ جب 2003ء میں متحدہ امریکی ریاستوں نے عراق پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہا۔آپ کا یہ موقف اُن مومنین کی معنوی طور پر ایک قسم کی تائید تھی کہ جو قابض امریکیوں کے خلاف اپنے حق پر ڈٹ گئے تھے۔

پدری شفقت

مرجعیت شیعہ مذہب کے لیے ایک بہت بڑا خیمہ، جائے پناہ، قلعہ اور اُن کی قوت وطاقت کا رمز ونشان ہے ۔آیۃ اللہ العظمی الشیخ محمد یعقوبی (دام ظلہ) اِس کی عملی مثال ہیں۔آپ عراق اور پوری دنیا میں اپنے وکلاء ونائبین کو اِسی بات کی تاکید کرتے ہیں۔ آیۃ اللہ یعقوبی نجف اَشرف میں اِس حوالہ سے بہت معروف ہیں۔ جو بھی آپ سے تعلق رکھتا ہے کہ وہ بخوبی واقف ہے کہ آپ شفقتِ پدری، بالانظری اور وسعتِ قلبی جیسی عظیم صفات کے حامل ہیں۔آپ پوری اُمت کو ایک نگاہ سے دیکھتے ہیں، اُن کے اُمور کا اہتمام کرتے ہیں اور اُن پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور اپنا موقف کھل کر پیش کرتے ہیں۔آپ مستکبرین کی طرف سے اِسلام اور تشیع کے خلاف ہونے والی ہر سازش کا قلعہ قمع کر کے استکباری قوتوں کو اُن کی اوقات یاد دلاتے ہیں۔

[سبق5]

مرجع کی صفات

امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف نے دورِ غیبت میں عادل فقہاء کو ولایت عطا کی۔اور لوگوں کو اُن کی اطاعت اور فیصلہ سازی، حکومت اور معاشرے کی قیادت کے جملہ اُمور میں اُن کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا۔امامؑ نے فقہاء کو ولایتِ مطلقہ عطا کی ہے۔لہذا وہ اِسلام کی مصلحت اور مفاد کے تمام اُمور میں کلی طور پر تصرف کا حق رکھتے ہیں۔

امام زمانہؑ کی توقیع میں آیا ہے:

وأما الحوادث الواقعة فارجعوا فيها إلى رواة حديثنا فإنهم حجتي عليكم وأنا حجة الله

''اور جہاں تک جدید درپیش مسائل کی بات ہے تو اُن کے بارے میں ہماری احادیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو۔بے شک میری طرف سے تم پر حجت ہیں اور میں اللہ کی حجت ہوں۔''

آیات وروایت کے مطابق امام عصرؑ نے یہ ولایت صرف اُسی شخص کو عطا کی ہے۔ جو صفات اور اہلیتوں کو مالک ہو۔ جو اُسے نیابت کا فریضہ مکمل طور ادا کرنے کے قابل بنادیں۔ اور یہ ایسے شخص کے لیے محال ہے کہ جو یہ منصب سنبھالنے کا اہل نہ ہو۔

آیۃ اللہ العظمی شیخ یعقوبی (دام ظلہ) اِس بابت فرماتے ہیں:

''اجتہاد کے درجہ علمیہ تک پہنچنے اور مرجعیت و قیادتِ اُمت کا استحقاق حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے ایک خاص عرصہ درکار ہوتا ہے۔ تاکہ انسان کے اندر ملکہ پیدا ہو اور مسلسل ممارست و معلومات کے وسیع ہونے سے اُس میں پختگی آجائے۔

ثانیاً اِس میں مدارج کمال، تہذیبِ نفس اور خدا کے ساتھ ارتباط کے لیے معنوی مراتب کو طے کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اُمت کی قیادت کی ذمہ لینے کے اہل ہو سکے۔ اور ثالثاً وہ اجتماعی طور پر اِس ذمہ کو اُٹھانے اور اُمت کے اُمور کی نگہداری کی لیاقت و قابلیت رکھتا ہو۔ تاکہ وہ اپنے استحقاقات، وظائف اور مسئولیات میں معصومؑ کی نیابت کا مستحق ہو سکے۔''

''مرجعیت اور قیادتِ اُمت کے لیے ضروری صفات''

پہلی صفت: فقاہت

ہر ذی شعور بخوبی جانتا ہے کہ جو شخص کسی کام کی ذمہ داری اُٹھانا چاہتا ہو۔ اُس کے لیے متعلقہ اَمر کے بارے میں مکمل معلومات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ تاکہ وہ اپنا فریضہ بطریقِ اَحسن انجام دے سکے۔ اب چونکہ ولی فقیہ کی ذمہ داری نظامِ اِسلامی کا اجراء کرنا ہوتا ہے۔ اِس لیے ضروری ہے کہ وہ مجتہد ہو اور احکامِ شرعیہ اور اُن کے مصادر کا علم رکھتا ہو۔

ارشادِ خدا ہے:

﴿أَفَمَن يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَن يُتَّبَعَ أَمَّن لاَّ يَهِدِّيَ إِلاَّ أَن يُهْدَى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ﴾ (یونس: 35)

تو کیا جو حق کی جانب ہدایت کرے وہ زیادہ حق رکھتا ہے کہ اُس کی اتباع کی جائے، یا وہ کہ جو خود ہی ہدایت نہیں پاتا، مگر یہ کہ اُسے ہدایت دی جائے؟ سو تمہیں کیا ہو گیا ہے، (یہ) کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

اِس آیت کریمہ کی روشنی میں اُسی شخص کی اتباع ممکن ہے کہ جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہو۔ اور یہ وہی کرسکتا

ہے کہ جوحق کی معرفت رکھتا ہو۔

جیسا کہ امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کی طرف ولایت بھی خصوصی طور پر ایسی شخصیت کے لیے وارد ہوئی ہے۔ جو احکام شرعیہ کا علم رکھتا ہو۔ توقیع میں آیا ہے کہ درپیش مسائل میں ہماری احادیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو۔ بے شک وہ تم پر میری طرف سے حجت ہیں اور میں خدا کی حجت ہوں۔

دوسری صفت: عدالت

یہ صفت اسلام اور ایمان کے ساتھ ساتھ حلال وحرام اور جملہ احکام دین کی پابندی کرنے سے عبارت ہے۔ یہ ایک عظیم مرتبہ ہے جو ولی فقیہ میں ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے:

﴿وَلَن يَجْعَلَ اللهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلاً﴾

خدا ہرگز کافروں کو مومنین پر (غالب آنے کی کوئی) راہ نہیں دے گا۔ (سورۃ النساء: 141)

اِس آیت کی رو سے مسلمانوں کے ولی فقیہ کا مسلمان ہونا بنیادی اور اولین شرط ہے۔

سورۃ الکھف کی آیت 28 میں ارشاد ہے:

وقال تعالی: ﴿وَلاَ تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا﴾

''اور ہرگز اس کی اطاعت نہ کرنا جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے محروم کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہشات کا پیروکار ہے اور اس کا کام سراسر زیادتی کرنا ہے''

لہذا کسی فاسق کا ولی فقیہ بننا جائز نہیں کہ جو خدا کے احکام یعنی حلال وحرام کی پابندی نہ کرتا ہو۔ جیسا کہ سورۃ النحل میں ارشاد ہے: ﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ ''بیشک اللہ عدل ,احسان اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے اور بدکاری ,ناشائستہ حرکات اور ظلم سے منع کرتا ہے کہ شاید تم اسی طرح نصیحت حاصل کرلو۔'' (النحل (90:

نہج البلاغہ میں ہے کہ مولا امیر المومنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

ولكنني آسى أن يلي أمر هذه الأمة سفهاؤها فيتخذوا مال الله دولاً وعباده خولاً والصالحين حرباً والفاسقين حزباً

''لیکن مجھے اس بات کا خوف ہے کہ کہیں اِس اُمت کا اختیار ایسے احمقوں کے پاس نہ چلا جائے۔ جو خدا کے مال کو ذاتی سرمایہ، اُس کے بندوں کو اپنا غلام، نیک وصالح لوگوں کو اپنا دشمن اور فاسقوں کو اپنی جماعت نہ بنالے۔''

ایک روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

لا تصلح الإمامة إلا لرجل فيه ثلاث خصال: ورع يحجزه عن معاصى الله وحلم يملك به غضبه، وحسن الولاية على من يلى حتى يكون لهم كالوالد الرحيم

امامت اُسی شخص کے لیے درست ہوتی ہے کہ جس میں تین صفات پائی جائیں: (۱) ایسا خوف جو اُسے خدا کی معصیت سے روکے رکھے۔ (۲) ایسا حلم کہ جس کے ذریعہ وہ اپنے غصے پر قابو رکھے۔ (۳) اپنے ماتحت افراد کی اچھی طرح نگرانی کرے حتیٰ کہ اُن کے لیے مہربان باپ کی مثل ہو۔

تیسری صفت: قابلیت ہونا

یعنی وہ اپنے سے متعلقہ فرائض و ذمہ داریوں کو کمال خوش اُسلوبی کے ساتھ انجام دے سکتا ہو۔ اِسے روایات میں حسنِ ولایت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مولا امیر المومنینؑ سے واردہ روایت بھی اِسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں: لوگوں میں سب سے زیادہ اِس اَمر کا حق دار وہ ہے کہ جو اُن سب سے زیادہ قابلیت رکھتا ہو۔ عقلاء کی نظر یہ شرط بالکل واضح ہے۔ کیونکہ جو بھی کسی کام کو اپنے ذمہ لے اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُس کام کو انجام دینے کی قدرت رکھتا ہو۔ بصورتِ دیگر اُس کی ولایت سے مطلوبہ ہدف حاصل نہیں ہوگا۔

قابلیت بہت سی اَہم اور بنیادی صلاحیتوں کا مجموعہ ہے۔ جیسے اُمور کی ادارت کے لیے شخصی استعداد، طریقہ کار سے آشنائی، زمان ومکان کی خصوصیات کا علم، شجاعتِ نفسیہ، قوتِ ارادہ، تصمیم اور عملی اقدام کرنے کی جرات وحوصلہ۔ جیسے طالوت کے قصہ میں خدا فرماتا ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ بے شک خدا نے اُنہیں تم پر منتخب کیا اور اُنہیں علم وطاقت بھی زیادہ عطا کی۔ (البقرة:247)

ایک روایت میں مولا امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے:

أنا أولى برسول الله... وأفقهكم فى الدين، وأعلمكم بعواقب الأمور، وأذربكم لساناً، وأثبتكم جناناً

''میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی ونیابت کا زیادہ حق دار ہوں۔۔۔ میں تم لوگوں سے بہتر دین کو سمجھتا ہوں، اُمور کے عواقب ونتائج کو تم سے بہتر جانتا ہوں، تم سے بڑھ کر فصیح گفتار ہوں اور تم سے زیادہ پختہ عقل رکھتا ہوں۔''

[سبق6]

زمانہ غیبت میں فقہاء کی ولایت

لفظِ 'ولایت'، قرآن وسنت اور علماء اعلام کے کلام میں وارد ہوا ہے۔اور اِسکے بہت سے معانی ہیں۔جیسے: نصرت، محبت اور اقتدار وغیرہ۔ یہاں ولایت حاکمیت اور اقتدار کے معنی میں ہے۔اصطلاح میں اِس سے مراد غیبتِ کبریٰ کے زمانے میں لوگوں پر فقیہ کی حاکمیت ہے۔

ولایتِ فقیہ کیا ہے؟

سورۃ مائدہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ * وَمَنْ يَتَوَلَّ اللهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللهِ هُمُ الْغَالِبُونَ﴾

''بے شک تمہارا ولی اللہ ہے، اور اُس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔اور جو شخص اللہ، اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ایمان والوں کو اپنا ولی بنائے تو بلاشبہ خدا کی جماعت ہی غالب آنے والی ہے۔'' (55،56)

اِن آیات سے واضح ہوتا ہے کہ حقیقت میں ولایت واختیار خدا کے پاس ہے۔ یہ ولایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ جسے قرآن نے اِس طرح بیان کیا:

﴿النَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ﴾

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مومنین کی جانوں پر اُن سے زیادہ حق تصرف رکھتے ہیں۔''

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مومنین کی جانوں پر اُن سے بڑھ کر حاکمیت کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ زندگی کے جملہ اُمور میں اُن پر اختیار رکھتے ہیں۔اسی طرح آپؐ اجتماعی، قضائی، حکومی اور دیگر مسائل میں بھی زیادہ حقِ ولایت رکھتے ہیں۔۔ لہذا آپؐ کا ارادہ اور فرمان ہر مومن کے ارادے اور رائے پر مقدم ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں اِس ولایت کو نافذ فرمایا اور اپنے بعد بارہ اماموںؑ میں اِس کے جاری رہنے کی توثیق کی۔ جیسا کہ نبیؐ واہل بیتؑ کی متعدد احادیث اِس ولایت کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں۔اُن میں

سب سے اہم ''غدیرخم'' والی حدیث ہے۔اُس میں ہے کہ حضورصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بھائی مولا امیرالمومنین علیہ السلام کا بازو فضا میں بلند کر کے پہلے صحابہ سے اقرار لیا کہ کیا میں مومنین کی جانوں پر اُن سے بڑھ کر حق نہیں رکھتا۔سب نے یک زبان ہوکر کہا: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسولؐ!

تو آپؐ نے اُسی لمحے فرمایا: اچھا، پھر سن لو کہ جس جس کا میں مولا ہوں اُس اُس کے علیؑ مولا ہیں۔

یہ ولایتِ الٰہیہ اِسی تسلسل کے ساتھ آئمہ اطہار علیہم السلام میں چلتی رہی۔حتیٰ کہ جب امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کی غیبتِ کبری کا دور آیا تو یہ ولایت فقہاء کو منتقل ہوگئی ہے۔جسے ولایتِ معصومؑ کے امتداد و تسلسل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ایسا اِس لیے ہوا کہ امامؑ کی غیبت کی وجہ سے سیاسی، اجتماعی اور قضاوت وغیرہ کے اُمور میں جو خلا آ گیا تھا اُسے کسی طریقے سے پر کیا جا سکے۔

اِس طرح ولایتِ فقیہ امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کی نیابت میں اُمت کی قیادت اور زمین پر حکم خدا کے نفاذ کا نام ہے۔اِس کی معصومؑ سے تائید موجود ہے بلکہ یہ آپؑ ہی کی ولایت کے آفتاب کی ایک کرن اور شجرۂ طیبہ کی ایک پرثمر شاخ ہے۔اِس بنا پر ولایت فقیہ کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ یہ امامؑ کے عصرِ غیبت میں جامع الشرائط مجتہد کی حاکمیت سے عبارت ہے۔

علماءِ اعلام کی آراء

جب ہم علماء کرام کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں۔تو ہم دیکھتے ہیں کہ امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کی غیبتِ کبری کی ابتداء ہی سے ولایتِ فقیہ کے بارے میں اُن کے اَقوال موجود ہیں۔اِس بارے میں علماء کے اَقوال کو دو مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔اور یہ تقسیم اُن کے کلام میں ولایتِ فقیہ کے بطورِ اصطلاح وارد ہونے کے اعتبار سے ہے۔

پہلا مرحلہ: شیخ مفید علیہ الرحمۃ سے لے کر شیخ نراقی قدس سرہ سے پہلے تک ہے۔

دوسرا مرحلہ: شیخ نراقی علیہ الرحمۃ سے ہمارے زمانے تک ہے۔

یہاں ہم بعض علماءِ اعلام کے کلام اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

1 شیخ مفید قدس سرہ (336 تا 413ھ)

آپؒ امر بالمعروف والجہاد کے باب میں لکھتے ہیں: ''حدود کا قیام ایسے اسلامی حاکم ذمہ داری ہے جو خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہو۔اور وہ آل محمدؐ میں سے آئمہ طاہرینؑ اور وہ امراء و حکام ہیں کہ جو اِس ذمہ داری پر آئمہؑ کی طرف سے مقرر تھے۔آئمہ طاہرینؑ نے ممکنہ حالت میں اِس ذمہ داری کا اختیار اپنے شیعہ فقہاء کو دیا ہے۔''

2الشیخ حلی(374 تا447ھ)

''فقیہ ولی امر(امام زمانہ) علیہ السلام کی طرف سے فیصلہ سازی میں نائب اور اہل ہوتا ہے۔ کیونکہ جس میں یہ صفات موجود ہوں اُسے امامؑ اور آپؑ کے آباءِ کرامؑ کی طرف سے اذن حاصل ہے۔لہذا اُس کے لیے اِن ذمہ داریوں سے غفلت جائز نہیں ہے۔''

3 محقق کرکی المعروف محقق ثانی(868 تا940ھ)

''ہمارے علماء کا اِس اَمر پر اتفاق ہے کہ وہ عادل امامی فتوی کی شرائط پہ پورا اُترنے والا فقیہ، جسے احکامِ شرعیہ میں مجتہد کہا جاتا ہے۔ وہ غیبت کے دور میں آئمہ ہدی علیہم السلام کا اُن تمام اُمور میں نائب ہوتا ہے کہ جن میں نیابت کا تصور ممکن ہے۔لہذا اُس سے فیصلہ کرانا اور اُس کے فیصلے کو تسلیم کرنا واجب ہے۔''

4 محقق نراقی متوفی1244ھ

''فقیہ عادل کی ولایت کے بارے میں دو قسم کی آراء ہیں۔

پہلی رائے یہ ہے کہ فقیہ اُن تمام اُمور کا اختیار رکھتا ہے کہ جن کا اختیار نبیؐ اور امامؑ کے پاس ہوتا ہے۔مگر کوئی ایسا مورد ہو کہ جو اجماع، یا نص، یا کسی اور دلیل کی وجہ سے اِس کے احاطہ میں نہ آئے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ فقیہ کو لوگوں کے ہر اُس امر میں ولایت حاصل ہے کہ جو اُن کے دین اور دنیا سے متعلق ہو۔جس کی انجام دہی ضروری ہو اور ترک نہ کیا جا سکتا ہو۔''

5 محقق نجفی متوفی1266ھ

''اگر عمومِ ولایت نہ ہو تو شیعوں کے بہت اُمور معطل ہو جائیں۔ اِس بارے میں بعض افراد کی طرف سے وسوسہ پیدا کیا جانا بہت ہی عجیب وغریب ہے۔ بلکہ لگتا ہے کہ ایسے شخص کو خبر ہی نہیں کہ فقہ کیا ہوتی ہے۔نہ ایسے شخص نے کلام معصومینؑ کے رموز کو سمجھا اور نہ اُن کے اِس فرمان کے مراد ومطلب میں کچھ غور کیا۔''میں نے اُسے(راوی حدیث کو) اُن لوگوں پر حاکم بنایا ہے۔''اِسی طرح کے دیگر الفاظ جیسے قاضی، حجۃ اور خلیفہ وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امامؑ اپنے شیعوں کے زمانِ غیبت کو منظم کرنا چاہتے تھے۔تاکہ آپؑ سے متعلقہ اُن کے اُمور(نیابت کے ذریعہ) انجام پا سکیں۔''

6۔الشیخ رضا الہمدانی(1240 تا1322ھ)

'' غور وتدبر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جو فقیہ اہل بیتؑ کی روایات سے متمسک ہو وہ اُن کے قائم مقام

ہوتا ہے۔اور شیعہ عوام اُن تمام اُمور میں اُس فقیہ کی طرف رجوع کرسکتی ہے کہ جن میں امامؑ مرجع ہوتے ہیں۔تا کہ شیعہ غیبت کے ادوار میں حیرت و پریشانی سے دو چار نہ ہوں۔''

7۔السید امام خمینیؒ

''ولایتِ فقیہ ایسے مقامات میں سے ہے کہ جن کا تصور ہی تصدیق کا موجب بنتا ہے۔اِس میں کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہے۔اِس کا معنی یہ ہے کہ جو بھی عقائد واحکام اِسلامیہ کی معرفت رکھتا ہو،خواہ اجمالی طور پر ہی سہی ۔وہ جیسے ہی ولایتِ فقیہ کا تصور کرتا ہے تو اُسے بلا تامل مان لیتا ہے اور اُسے واضح وروشن پاتا ہے۔''

8۔الشہید السید محمد باقر الصدرؒ

''خطِ شہادت کی مسئولیت مرجع کے ذمہ داریوں میں سے ہے۔اِس کی وجہ یہ ہے کہ مرجعیت اِسی راستے پر نبوت وامامت کا تسلسل ہے۔''

9۔آیۃ اللہ الشیخ محمد الیعقوبی (دام ظلہ)

''جس طرح جامع الشرائط فقیہ اپنے امتیازات وصلاحیات میں امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کا نائب ہوتا ہے۔اِسی طرح وہ امامؑ کی ذمہ داریوں اور فرائض کی انجام دہی میں آپؑ کا نائب ہوتا ہے۔جیسا کہ امامؑ کی کچھ ذمہ داریوں کا ذکر ہم نے اپنی کتاب دور الآئمة فی الحیاة الاسلامیة میں کیا ہے۔

زمانہ غیبت میں ولایتِ فقہاء پر دلیل روائی

آئمہ طاہرین علیہم السلام سے بہت سی نصوص وروایات وارد ہوئی ہیں ۔جن سے زمانِ غیبت میں فقیہ کی ولایت پر استدلال کرسکتے ہیں۔مگر یہاں ہم جناب اسحاق بن یعقوبؒ کے مکاتبہ پر ہی اِکتفاء کرتے ہیں۔

نصِ روایت:

جنابِ اسحاق بن یعقوبؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کے نائبِ خاص حضرت محمد بن عثمان العمریؒ سے درخواست کی کہ میرا خط امامؑ کی خدمت میں پہنچا دیں۔میں نے اُس میں امامؑ سے کچھ سوالات کیے جن کا جواب میرے لیے مشکل تھا۔تو اُس کے جواب میں امامؑ کے خطِ مبارک میں یہ توقیع وارد ہوئی:

اما الحوادث الواقعة فارجعوا فیھا الی رواة حدیثنا فانھم حجتی علیکم و انا حجة اللہ

''جدید پیش آنے والے مسائل میں ہماری حدیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو۔بے شک وہ میری

طرف سے تم پر حجت ہیں۔اور میں اللہ کی حجت ہوں۔۔"

سند:

اِس روایت کو مکاتبہ کہا جاتا ہے۔ یہ آج کے دور میں خط کے ذریعہ فتوی معلوم کرنے کی طرح ہے۔ کیونکہ اُس زمانے میں فقہاء اپنے مکاتیب وسوال نامے امامؑ کے خاص سفراء کے واسطہ سے آپؑ کی خدمت میں پہنچاتے۔ پھر امامؑ کی طرف سے جواب آتا اور اُس پر آپؑ کی مہر لگی ہوتی۔ بہت سے جلیل القدر فقہاء نے اِس مکاتبہ کو نقل کیا اور اِس کے ذریعہ استدلال کیا ہے۔

دلالت:

زمانِ غیبت میں اِس روایت کی ولایتِ فقہاء پر دلالت بالکل واضح ہے۔ یہاں حوادثِ واقعہ سے مراد وہ نئے پیش آنے والے مسائل ہیں۔جن میں عام طور پر لوگ اپنے آئمہ واکابرین کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ رجوع صرف احکام کی معرفت کے لیے نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر کسی چیز کے بارے میں حکم پہلے سے موجود ہوتو اُس کے متعلق پھر سے سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعید ہے کہ یہاں رجوع سے مراد اُن احکام کو جاننا ہو کہ جو ہم پہلے ہی جانتے ہیں۔ اِس سے ثابت ہوا کہ یہاں اُن اُمور کے بارے میں سوال کرنے کی بات ہورہی ہے کہ جو نئے سامنے آئیں۔

جیسا کہ "رواۃ حدیث" سے مراد بھی صرف روایت کو نقل کرنے اور دوسروں سے بیان کرنے والے نہیں۔ بلکہ یہاں رواۃ سے مراد وہ فقہاء ہیں کہ جو حدیث روایت کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے جدید موضوعات پر منطبق کرتے ہیں اور اُس سے احکام کا استنباط کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ نئے پیش آنے والے مسائل پر حکم لگانے کی صلاحیت رکھـتے ہیں۔

حدیث کے اِس جملہ فانهم حجتی علیکم و انا حجة الله سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہاں حجت کا معنی ایک ہی ہے۔ کیونکہ یہ ایک ہی سیاق میں وارد ہوا ہے۔ لہٰذا جس طرح آئمہ طاہرین علیہم السلام اپنے اوامر ونواہی اور سارے احکام میں حجت ہیں اِسی طرح فقہاء بھی اپنے اوامر ونواہی اور جملہ احکام میں حجت ہیں۔ کیونکہ وہ رواۃِ حدیث ہیں۔

[سبق7]

شمائل مومن

جس طرح اِسلام نفوس و بواطن کی تربیت، اُنہیں رذائل سے پاک اور اچھے اخلاق سے آراستہ کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اِسی طرح یہ انسان کے ظاہر کو بھی خوبصورت بنانے کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ تاکہ وہ ایسی صفات و آداب سے مزین ہو جو اِسے لوگوں کی نظر میں محبوب و پسندیدہ بنا دیں۔

بلاشبہ یہ بھی خدا کے نزدیک تقرب اور لوگوں کے درمیان رفعت و سربلندی کا سبب بنتا ہے۔ بے شک اِسلام انسان کے روحانی تکامل کے ساتھ ساتھ اُس کی ظاہری وضع قطع اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ربط و تعلق کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ شریعت میں اِس بارے میں خصوصی قیود و ہدایت وارد ہوئی ہیں۔ جو سب کے فائدے میں ہیں۔ یہاں ہم مومن کی ظاہری وضع کے متعلق کچھ تعلیماتِ اِسلام کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

1 جسم کو صاف ستھرا رکھنا

بلاشبہ ایک مسلمان کے لیے بدن کی صفائی نہایت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ اِسلام میں صفائی کو ایمان کا حصہ کہا گیا ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ صفائی ایمان کا جزو ہے۔

ایک دوسرے مقام پر آپؐ نے فرمایا:

تنظّفُوا بكلِّ ما استطعْتُم، فإنَّ الله تعالى بنى الإسلامَ على النّظافةِ ولنْ يدخلَ الجنّةَ إلّا كُلُّ نظيفٍ

''جس قدر ہو سکے صفائی ستھرائی سے رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے اِسلام کی بنیاد صفائی اور نظافت پر رکھی ہے ۔جنت میں وہی جائے گا جو صاف ستھرا رہتا ہو۔''

صاف ستھرا رہنا اِنسان کی طبعیت اور فطرت سے موافقت رکھتا ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے گندگی سے نفرت کرتا ہے اور اُس سے بچتا ہے۔ جو انسان صفائی کا خیال نہیں رکھتا لوگوں کے درمیان اُس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس سے دور بھاگتے ہیں۔ حدیث نبوی ﷺ ہے: إن الإسلام نظيف فتنظفوا، فإنه لا يدخل الجنة إلا نظيف ''بے شک اسلام صاف ستھرا ہے لہذا تم صفائی سے رہا کرو بے شک جنت میں وہی جائے گا جو صاف ستھرا رہتا ہو۔''

جس طرح دینِ اسلام میں صفائی ستھرائی کا حکم دیا گیا ہے۔ اِسی طرح سابقہ تمام انبیاءؑ نے بھی اپنی اُمتوں کو صفائی کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے: من أخلاق الأنبياء التنظف ''صفائی ستھرائی انبیاء کے اخلاق میں سے ہے۔''

صفائی کیوں ضروری ہے؟

اِسلام نے صرف صفائی کا حکم دینے پر ہی اِکتفاء نہیں کیا۔ بلکہ اِس کے بارے میں خاص تفصیلات بھی بیان کیں۔ جنہیں پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ دینِ اِسلام میں صفائی سے متعلقہ درج ذیل اُمور کی تاکید کی گئی ہے:

بدن کی صفائی

انسان کے بدن سے پسینہ بہتا ہے اور کام کرتے ہوئے اُس پر میل جم جاتی ہے۔ لہذا ضروری ہوتا ہے کہ اپنے بدن کی صفائی کی طرف متوجہ ہوں۔ تاکہ اُس سے گندگی اور میل کچیل دور کی جا سکے۔ کیونکہ ہم جن لوگوں کے ساتھ بیٹھتے ہیں وہ اِس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ہم اپنے آلود بدن اور پسینے وغیرہ کی بد بو سے اُنہیں اذیت نہ دیں۔

جیسا کہ ایک روایت میں مولا امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے:

تنظفوا بالماء من النتن الريح الذي يتأذى به، تعهدوا أنفسكم، فإن الله عز وجل يبغض من عباده القاذورة الذي يتأنف به من جلس إليه

''پانی سے صفائی وطہارت کر کے خود سے ایذاء دینے والی بد بو کو دور کرو۔ خود کو صفائی کا پابند بناؤ۔ بے شک خدا اپنے بندوں میں سے اُس شخص کو پسند نہیں کرتا کہ جس کے پاس بیٹھنے والے اُس کی بد بو کی وجہ سے اُس سے نفرت کریں۔''

بدن کا حق یہ بھی ہے کہ اِسے نجاستوں سے پاک رکھا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

طهّروا هذه الأجساد طهّركم الله، فإنه ليس عبد يبيت طاهراً إلا بات معه ملك في شعاره، ولا يتقلب ساعة من الليل إلا قال: اللهم اغفر لعبدك فإنه بات طاهراً

''خدا تمہیں پاک رہنے کی توفیق دے! اپنے جسموں کو پاک رکھو۔ جو بھی شخص پاک حالت میں رات گزارے تو ایک فرشتہ اُس کے لباس میں اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ رات میں جب بھی کروٹ بدلتا ہے تو وہ فرشتہ کہتا ہے: اے اللہ! اپنے اِس بندے کی مغفرت فرما۔ یہ پاک ہو کر سویا ہے۔''

دانتوں کی صفائی

اگر ہم دانتوں کی صفائی کے متعلق روایات کو شمار کرنا چاہیں تو اِس کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ لیکن

یہاں ہم دانتوں کی صفائی کے بارے میں چند آداب ذکر کرنے پر اِکتفاء کرتے ہیں ۔ بہت سی احادیث میں مسلمانوں کو لکڑی کی مسواک سے دانت صاف کرنے تاکید کی گئی ہے۔ جزیرۂ عرب میں زیادہ تر پیلو کی مسواک استعمال کی جاتی ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

ما زال جبرئیل یوصینی بالسواك حتی ظننت أنه سیجعله فریضة

''حضرت جبرائیل علیہ السلام مسلسل مجھے مسواک کے بارے میں فرمان الٰہی پہنچاتے رہے، یہاں تک مجھے گمان ہونے لگا کہ وہ اِسے فرض قرار دیں گے۔''

اِس حدیث مسواک کے مستحب ہونے پر بہت زیادہ تاکید موجود ہے۔یعنی مسواک کے بارے میں اِس قدر تکرار سے فرمانِ الٰہی آیا کہ قریب تھا کہ یہ واجب ہو جائے۔ واضح ہونا چاہیے کہ صرف پیلو کے درخت کی مسواک کرنا ہی ضروری نہیں، اگرچہ بعض روایات میں اِس کی مسواک کو سب سے افضل کہا گیا ہے۔ اِس لیے دانت صاف کرنے کے لیے جوٹوتھ برش استعمال کیا جاتا ہے۔ اُس پر بھی مسواک کرنا صادق آتا ہے۔

ایک اور روایت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

لو لا أن أشق علی أمتی لامرتهم بالسواك عند وضوء كل صلاة

''اگر میری اُمت کے لیے مشقت کا باعث نہ ہوتا تو میں اُنہیں ہر نماز کا وضو کرتے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔''

مولا امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے: السواك مطهرة للفم مرضاة للرب ''مسواک منہ کو پاکیزہ بناتی ہے اور خدا کی خوشنودی کا سبب بنتی ہے۔''

صادق آل محمدؑ کا فرمان ہے:

من سنن المرسلین السواك ''مسواک کرنا انبیاءؑ کی سنتوں میں سے ہے۔''

ناخن تراشنا

اِسلام میں ناخن تراشنے کو خصوصی اہمیت دی گئی اور اُنہیں کاٹنے کے بارے میں حکم آیا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ من السنة تقلیم الأظفار ناخن کاٹنا سنت افعال میں سے ہے۔

روایات میں ناخن کاٹنے کے بہت سے فوائد اور عظیم آثار وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تقليم الأظفار يمنع الداء الأعظم و يدر الرزق

''ناخن تراشنا خطرناک بیماریوں سے بچاتا ہےاور رزق میں اضافے میں سبب بنتا ہے۔''

اِسلام میں ہمیں ایک بری عادت پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اور وہ ناخنوں کا دانتوں سے کاٹنا ہے۔ جیسا کہ ممنوعہ چیزوں کے متعلق حدیث میں ذکر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناخنوں کو دانتوں سے کاٹنے سے منع فرمایا ہے۔

گھر کی صفائی

دوسری اہم بات کہ جس کی دینِ حنیف میں تاکید کی گئی ہے، وہ گھر اور اُس سے ملحقہ چیزوں کی صفائی ہے۔ گھروں کی صفائی سے متعلق درج ذیل باتوں کی خصوصی طور پر تاکید کی گئی ہے۔

1 جھاڑو لگانا۔

روایات میں گھروں میں جھاڑو لگانے اور گرد و غبار صاف کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ روایات میں اِشارہ ملتا ہے کہ گھر میں جھاڑو لگانے سے فقر و تنگدستی دور ہوتی ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

كنس البيوت ينفي الفقر ''گھروں میں جھاڑو لگانا فقر و تنگدستی کو دور کرتا ہے۔''

2۔ برتن دھونا۔

جو برتن انسان کے کھانے پینے اور دیگر کاموں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اُنہیں دھونے اور صاف ستھرا رکھنے کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں آیا ہے:

غسل الإناء و كسح الفناء مجلبة للرزق

''برتن دھونا اور صحن میں جھاڑو لگانا فقر و تنگ دستی کو دور کرتا ہے۔''

3۔ کوڑا نکالنا

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد ہوا ہے: ''اپنے گھروں میں کوڑا رات تک نہ رہنے دیا کرو، بلکہ دن کو ہی نکال دیا کرو۔ کہ وہ شیطان کی آماجگاہ ہوتا ہے۔

اِسی طرح کوڑا بیماریوں کے پھیلاؤ اور نقصان دہ حشرات اور جراثیم پیدا ہونے کا سبب بھی بنتا ہے۔

4۔ مکڑی کے جالے

روایات میں ملتا ہے کہ مکڑی کے جالے شیطان کا گھر ہوتے ہیں اور غربت و افلاس کا سبب بنتے ہیں۔ چنانچہ حدیثِ مبارکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

بيت الشياطين من بيوتكم بيت العنكبوت

''تمہارے گھروں میں شیطان کے گھر مکڑی کے جالے ہیں۔''

مولا امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے:

نظفوا بيوتكم من حوك العنكبوت، فإن تركه في البيت يورث الفقر

''اپنے گھروں کو مکڑی کے جالوں سے پاک رکھو۔ کیونکہ اُنہیں گھر میں رہنے دینا فقر وفاقہ کا موجب بنتا ہے۔''

لباس کی صفائی

ہر عاقل و سمجھدار انسان بخوبی جانتا ہے کہ صاف ستھرے لباس کی اہمیت کس قدر زیادہ ہے۔ اور اُس کا انسان کی شخصیت اور معاشرے پر کتنا اچھا اثر مرتب ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں مولائے متقیانؑ سے مروی ہے:

النظيف من الثياب يذهب الهم والحزن، وهو طهور للصلاة.

''صاف ستھرا لباس دکھ اور غم کو دور کرتا ہے۔ اور نماز کے لیے بھی پاک ہوتا ہے۔''

دینِ اسلام میں مسلمان کے لیے ہر وہ لباس پہننا جائز ہے کہ جو اُس کی خوبصورتی اور شخصیت میں نکھار لائے۔ لیکن کچھ لباس ایسے ہیں کہ جن کا پہننا مومنوں کے لیے حرام ہے۔

حرام لباس

۱۔ شہرت کا لباس

یہ وہ لباس ہے جسے انسان ٹھٹھا و مسخرہ کے طور پر پہنے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد ہوا ہے:

مَنْ لَبِسَ لِبَاسَ شُهْرَةٍ فِي الدُّنيا أَلْبَسَهُ اللهُ ثِيَابَ الذُّلِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

''جو شخص دنیا میں مسخرہ و شہرت کا لباس پہنے روزِ قیامت خدا اُسے ذلت کا لباس پہنائے گا۔''

۲۔ جنس مخالف کا لباس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد ہوا ہے: لَعَنَ اللهُ ... وَالْمُتَشَبِّهِينَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ ''خدا نے جن لوگوں پر لعنت کی ہے۔ اُن میں وہ مرد بھی ہیں کہ جو عورتوں سے شباہت اختیار کریں اور وہ عورتیں بھی کہ جو مردوں سے شباہت اختیار کریں۔''

۳۔ کافروں سے شباہت والا لباس

بعض جوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے لباس اور بالوں وغیرہ آرائش و نمائش میں کفار و بے دین لوگوں کے چال چلن کو اختیار کرتے ہیں۔ اِس عمل سے دشمن کی ثقافت ہمارے گھروں میں داخل ہوگئی ہے۔

اگر اِس ناسور کا سد باب نہ کیا گیا تو ہم رفتہ رفتہ اپنی ثقافت اور اَسلاف کے آثار سے محروم ہو جائیں گے۔ آغا رہبر نے اسے ثقافتی جنگ سے تعبیر کیا ہے۔

۴۔مردوں کا ریشم پہننا

شارع مقدس نے اِس سے نہی فرمائی ہے۔مردوں کے لیے ریشم کا لباس پہننا حرام ہے۔اگر کوئی شخص ریشم کا لباس پہن کر نماز پڑھے تو اُس کی نماز باطل ہے۔آقائے خمینی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ نماز کے علاوہ بھی مردوں کے لیے ریشم کا لباس پہننا جائز نہیں ہے۔

مسائل فقہیہ بمطابق فتاوی سماحۃ المرجع الشیخ محمد الیعقوبی (دام ظلہ)

۱۔ایسا لباس پہننا جائز نہیں جس پر شراب اور منشیات کے اشتہارات بنے ہوں۔

۲۔ایسے لباس کی خرید و فروخت جائز نہیں جس میں سلائی، رنگ یا ڈیزائننگ کے اعتبار سے مغربی ثقافت کی ترویج و تقلید پائی جائے، یا دشمن کی اقتصاد مضبوط ہو۔

۳۔اِسلام کے دشمنوں سے شباہت اور اُن کی ثقافت کی ترویج کے لیے اُن کی طرح بال کاٹنا جائز نہیں۔

۴۔مردوں کے لیے وہ لباس پہننا جائز نہیں کہ جو عورتوں سے مخصوص ہو۔

۵۔مردوں کے لیے سونا پہننا یا اُس کی چین گلے میں ڈالنا مطلقاً حرام ہے۔

۶۔اگر کوئی شخص حکم شرعی یا موضوعِ حکم سے لاعلمی یا بھول کر سونا پہن کر نماز پڑھ لے تو اُس کی نماز صحیح ہے۔ مگر یہ کہ اُس کا حکم سے جاہل ہونا اُس کی اپنی کوتاہی کی وجہ سے ہو۔جب کہ وہ نماز کی حالت میں اِس کی طرف متوجہ اور تردد کا شکار بھی ہو۔

دشمنان دین سے شباہت کا انجام

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے اہل بیتؑ نے پرچم اِسلام کو سربلند کرنے کے لیے اپنی مقدس جانیں قربان کیں، طرح طرح کی سختیاں جھیلیں، زندان سہے اور مظلومیت کی حالت میں وطن سے دور شہید کر دیے گئے۔اُن کا مقصد اور ہدف یہی تھا کہ خدا کی شریعت عام ہو تا کہ انسان سعادت کی راہ پر گامزن ہو سکے۔لہذا اہل بیتؑ کے طور طریقو کو اختیار کرنا گویا اِن قربانیوں کی بے قدری اور دینِ اِسلام کی سربلندی کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے والے شہدا کے خون کے ساتھ بہت بڑی خیانت ہے۔بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ اِس دین کا سب سے خطرناک دشمن وہ ہے جو آپ کو ایسی ثقافت کی طرف دعوت دے کہ جو اس دین کے برعکس لے جائے۔چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے ایک نبیؑ کی طرف وحی کہ مومنین سے کہیں:

لا تلبسوا لباس أعدائی، ولا تطعموا مطاعم أعدائی، ولا تسلكوا مسالك أعدائی فتكونوا أعدائی كما هم أعدائی

''میرے دشمنوں جیسا لباس نہ پہنیں، میرے دشمنوں کے دسترخوان سے نہ کھائیں اور میرے دشمنوں کی راہ پر نہ چلیں۔ پھر وہ (مومنین) بھی میرے دشمن ہو جائیں گے کہ جیسے وہ میرے دشمن ہیں۔''

[سبق 8]

اداءِ تکلیف

خداوند عالم اپنی کتاب میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾.

''ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو رسول اور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو جو تم ہی میں سے ہیں پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے ہو- یہی تمہارے حق میں خیر اور انجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے۔'' (سورۃ النساء:59)

انسان کی خلقت کا ہدف

بے شک اللہ تعالی نے انسان کو بے مقصد خلق نہیں کیا۔ بلکہ اُس کی تخلیق کا ایک خاص ہدف اور مقصد ہے۔ اور وہ خداوند متعال کی معرفت وعبادت ہے۔ جیسا کہ حدیثِ قدسی میں وارد ہوا ہے:

كنت كنزاً مخفياً فأحببت أن أعرف فخلقت الخلق لأعرف

''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں۔ اِس لیے میں نے ایک مخلوق پیدا کی تا کہ میری پہچان ہو سکے۔''

جب کوئی بندہ اللہ سبحانہ وتعالی کی معرفت حاصل کرتا ہے، اُس کی عظمت، قدرت اور سلطنت کو پہچانتا ہے اور اُس کی عظیم خلقت میں غور کرتا ہے تو اُسے ہر لحاظ سے کامل اور لائق عبادت پا کر اپنی جبینِ ناز اُس کے آگے جھکا دیتا ہے۔ جیسا کہ اُس نے اپنی کتاب میں بھی انسانوں اور جنات کی تخلیق کا مقصد یہی بیان کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾

میں نے جنوں اور انسانوں کو اِسی لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ میری عبادت کریں۔

تو اِس فرمانِ خدا کی روشنی میں معرفت، عبادت، حقِ اطاعت کی ادائیگی اور الٰہی احکام کی پابندی کرنا ہی انسان کی خلقت کا حقیقی مقصد ہے۔ اِن احکام کے ذریعہ انسان کی آزمائش کی گئی ہے۔ کیونکہ خدا نے اُسے عقل جیسی نعمت عطا کی ہے کہ جو اُس کے لیے حق و باطل اور فوائد و نقصانات میں تمیز کرتی ہے۔

اِسی مقصد کی بجا آوری کے لیے خدا کی طرف سے لوگوں، بلکہ ایمان والوں کو بھی یہ صدا آتی ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھیں اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے دین و شریعت کی پابندی کر کے احکامِ الٰہیہ کی پیروی کریں۔

تکلیف کا مطلب

تکلیف سے مراد خدا کے اوامر و نواہی ہیں۔ اور تکلیف کی پابندی سے مراد خدا کے احکام کو انجام دینا اور اُس کی منع کردہ باتوں سے باز رہنا ہے۔

تکلیفِ شرعی کا مصدر

جب ہم تکلیفِ شرعی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر حکم کا مصدر اِسلام ہے۔ اور جب ہم اِسے شرعی حکم کہتے ہیں تو اِس میں شرعیت پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ حکم انسان کی زندگی کے انفرادی، اجتماعی، سیاسی اور دوسرے تمام پہلوؤں کو شامل ہوتا ہے۔۔

جب ہم کہتے ہیں کہ اِسلام ہر زمان و مکان کے لیے ایک کامل اور موزوں نظامِ حیات ہے۔ تو اِس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے۔ آیۃ اللہ الشیخ محمد یعقوبی نے اِس حقیقت کو اپنی کتابوں اور خطابات میں کئی بار بیان فرمایا ہے۔ المختصر اِسلام ایک کامل ضابطۂ حیات اور انسان کی حقیقی اور ابدی سعادت کا ضامن ہے۔

تکلیفِ الٰہی کا تعیّن

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾.

''ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو رسول اور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو جو تم ہی میں سے ہیں پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے ہو۔ یہی تمہارے حق میں خیر اور انجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے۔'' (سورۃ النساء: 59)

اِس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اُن اشخاص کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جن کی اطاعت واجب ہے۔وہ پہلے درجہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں ۔آپؐ نے مخلوق کی ہدایت کا فریضہ انجام دیا۔اور اُنہیں دائمی عذاب سے بچنے کا نسخہ فراہم کیا۔آپؐ کے بعد مولا امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام خدا کے حکم سے اِس ذمہ داری کو اُٹھایا۔پھر ایک ایک کر کے آئمہ اہل بیتؑ کے ادوار آتے رہے۔اور اب امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کی غیبتِ کبریٰ کا دور ہے۔

یہ سب کے سب اِس اُمت کے والیانِ اَمر ہیں۔آئمہ اہل بیتؑ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کے دورِ غیبت میں جامع الشرائط علماء کی اتباع کریں اور اِسی کو ولایتِ فقیہ کہتے ہیں۔جب ہم جامع الشرائط فقیہ کی اِطاعت کرتے ہیں تو وہ درحقیقت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہوتی ہے۔

سرکارِ حجتؑ سے مروی ہے:

أما الحوادث الواقعة فارجعوا فيها إلى رواة حديثنا فإنهم حجتي عليكم وأنا حجة الله

''درپیش مسائل میں ہماری احادیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو۔بے شک وہ میری طرف سے تم پر حجت ہیں اور میں خدا کی حجت ہوں۔''

فقیہ کی اطاعت اُس کی طرف سے صادر ہونے والے فرامین پر عمل کے ذریعے ہوتی ہے۔چاہے وہ براہِ راست صادر ہوں، یا اُس کے چینلز، یا اُس کے نائب وغیرہ کے واسطہ سے پہنچیں۔جب ہمارے پاس ولی فقیہ کا کوئی حکم براہِ راست، یا اُس کے نائب و وکیل کے واسطہ سے پہنچے تو وہ حکم شرعی بن جاتا ہے جس پر عمل کرنا ہم پر لازم ہو جاتا ہے۔اور بلاشبہ یہ خدا کی عبادت اور اطاعت شمار ہوتی ہے۔بلاشبہ تکلیفِ شرعی سے ہمارا تعلق امر الٰہی کو تسلیم کرنے کی مانند ہے۔لہٰذا ہمارے عقیدہ کے مطابق حکم کی بجا آوری ہی خدا کی اطاعت ہے۔خدا نے اِس اطاعت میں اپنے ساتھ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شامل فرمایا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو۔

پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے اِس اطاعت کو مولا علیؑ اور اولادِ فاطمہؑ سے ہونے والے آئمہ طاہرینؑ کے لیے واجب قرار دیا۔اور اِس طریقہ سے اِسلام کے نظامِ قیادت کو محفوظ کیا گیا۔جو کہ نوع بشریت کی قیادت کا الٰہی نظام ہے۔اِس اعتبار سے اِسلام نظام اور حکومت کا دین ہے۔آئمہ طاہرینؑ کے بعد امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف نے زمانہ غیبت میں اِس اطاعت کو فقہاء کے لیے بھی لازم قرار دیا۔لہٰذا اگر آج ہم اپنے فقیہ کی اطاعت کریں

گے اور اُسے اپنا حاکم و راہنما تسلیم کریں گے۔تو یہ امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کی اطاعت اور آپؑ کی ولایت کو تسلیم کرنا شمار ہوگا۔

تکلیفِ شرعی کی انواع

احکام شرعیہ درج ذیل دو قسم کے ہوتے ہیں:

1۔احکام شرعیہ ثابتہ:

جیسے نماز، روزہ، حج اور دیگر احکام۔۔بلاشبہ اِن کی پابندی کرنا واجب ہے۔

2۔مصالح ومفاسد:

اِن اُمور میں ایسے جامع الشرائط مجتہد سے حکم لینے کی طرف رجوع کیا جاتا ہے کہ جو مسلمانوں کے اُمور کی ذمہ داری اُٹھاتا ہے اور مصالح ومفاسد کی تشخیص کی صلاحیت رکھتا ہے۔تا کہ اُس کا حکم شریعت کی تعلیمات کے موافق ہو۔

اِسی لیے اُس کی اطاعت واجب ہوتی ہے۔جیسے شیخ یعقوبی نے 2003 میں عراق پر قابض امریکیوں کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات کے حرام ہونے کا فتوی دیا۔پھر داعش کے ساتھ جنگ اور مقدسات کے دفاع کے وجوب اور اِسی طرح باصلاحیت شخص کے انتخاب کے لیے الیکشن میں شرکت کرنے کے وجوب کا فتوی دیا۔

''تکلیفِ شرعی کی صورتیں''

تکلیفِ شرعی چند صورتیں ہیں جو کہ حسبِ ذیل ہیں:

پہلی صورت: ایسے مجتہد کی طرف سے فتوی صادر ہو کہ جس کی تقلید انسان پر واجب ہو۔

دوسری صورت: ایسے فقہاء کی طرف حکم کے طور پر صادر ہو کہ جو مسلمانوں کے عمومی اُمور کے ذمہ دار و مسئول ہوتے ہیں۔ایسی شخصیات کے حکم کی اطاعت اُن کے مقلدین اور دوسرے تمام افراد پر واجب ہوتی ہے۔اور اُن کے حکم کو ٹھکرانا آئمہ طاہرینؑ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکم عدولی کرنا شمار ہوتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ''میں نے اُسے تم پر حاکم بنایا ہے۔لہذا جب وہ حاکم نافذ کرے اور (فریقین میں سے) کوئی اُس کے حکم کو تسلیم نہ کرے۔تو اُس نے خدا کے حکم کو کم تر جانا اور ہمارے حکم کی خلاف ورزی کی۔اور ہمارے حکم کو ٹھکرانا گویا خدا کے حکم کو نہ ماننا ہے۔''

اِس کی مثال وہ فتوی ہے کہ جو آیۃ اللہ العظمی السید علی السیستانی (دام ظلہ) اور آیۃ اللہ الشیخ محمد یعقوبی (دام ظلہ) کی جانب سے صادر ہوا کہ داعش کے خلاف جہاد اور مقدسات دینی کی حفاظت واجب ہے۔اِس فتوی کے نتیجے

میں ہم نے دیکھا کہ عراق میں آیۃ اللہ سیستانی اور آیۃ اللہ یعقوبی (دام ظلہما) کے مقلدین اور دیگر مراجع کے مقلد مومنین حتیٰ کہ غیر شیعہ اہل سنت مسلمانوں اور اکراد نے بھی مرجعیت کے حکم کو بسر وچشم تسلیم کیا۔

تیسری صورت: مجتہد یا ولی فقیہ کا حکم بالواسطہ، بلکہ تنظیمی سورسز کے ذریعہ صادر ہو۔ جیسے ولی فقیہ کا کسی خاص شہر میں کچھ افراد کو معین کرنا اور اُنہیں اپنی طرف سے کچھ اُمور میں اختیار دینا۔ کہ جن اُن افراد کی اطاعت فقیہ کی اطاعت شمار ہو اور اُن اختیارات کی حد میں اُن افراد کی مخالفت فقیہ کی مخالفت شمار ہو۔ پاکستان میں اِس کی مثال شوریٰ علماءِ جعفریہؑ ہے۔ اِس تنظیم کو آیۃ اللہ الشیخ محمد یعقوبی (دام ظلہ) کی طرف سے اُن اہداف کے مطابق کام کرنے کا اختیار حاصل ہے کہ جو خود مرجع عالی قدر کی طرف سے مقرر کردہ ہیں۔ اِس علمائی تنظیم کے سربراہ پاکستان میں آیۃ اللہ یعقوبی کے وکیل ہیں۔

تقلید

ہر شیعہ اثناعشری پر واجب ہے کہ اپنے فریضہ کی پابندی کرے اور اُسے پورے کمال کے ساتھ ادا کرے۔ اِس میں انسان کا اپنا ہی فائدہ ہے۔ کیونکہ خدا کو اطاعت کرنے والے کی اطاعت فائدہ دیتی ہے، نہ معصیت کرنے والے کی معصیت کچھ نقصان پہنچاتی ہے۔

انسان اُس وقت تک بندگی کا حق ادا نہیں کر سکتا کہ جب تک خدا، رسولؐ اور اولی الامرؑ کے حکم کو مطلقاً تسلیم نہ کرے۔ کیونکہ خدا اپنے بندوں پر حق اطاعت رکھتا ہے۔ شہید السید آیۃ اللہ محمد باقر الصدر (قدس سرہ) نے حق الطاعۃ للمولیٰ تعالیٰ پر نہایت دقیق اور علمی بحث کی ہے۔ اور علمِ اُصول میں اِسی پر اپنا نظریہ قائم کیا ہے کہ جو نظریۃ حق الطاعۃ کے عنوان سے مشہور ہے۔

نظامِ ولایت سے مربوط رہنے اور فقہاء کی اطاعت کے فوائد و برکات:

خداوند تعالیٰ اپنی کتاب میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَن يَتَوَلَّ اللهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللهِ هُمُ الْغَالِبُونَ﴾

اور جو بھی اللہ، رسولؐ اور صاحبانِ ایمان کو اپنا حاکم و سرپرست بنائے گا تو اللہ کی ہی جماعت غالب آنے والی ہے۔ (سورۃ المائدہ:56)

یہ آیت کریمہ ایک ایسی ولایتِ شرعیہ کی طرف اِشارہ کرتی ہے کہ جس کی بازگشت ولایتِ الٰہیہ کی طرف ہے۔ اور وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے بعد آئمہ اہل بیتؑ کی ولایت ہے۔ جو اِس زمانہ غیبت میں فقہاء کو حاصل ہے۔

اِس ولایتِ شرعی کے ساتھ منسلک و مربوط رہنے کے بہت سے فوائد و برکات ہیں۔ اُن میں سے کچھ یہ ہیں:

1۔نصرت:

مذکورہ بالا آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ خدا کی مدد اُن لوگوں کے شاملِ حال ہوگی کہ جو قیادت ِ شرعی کو قبول کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خدا کی غالب آنے والی جماعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ غلبہ ایسا ہے کہ جو سیاسی عسکری ،اقتصادی اور اِن کے علاوہ سب جہات کو شامل ہے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد خدا ہے جو اِس کی مکمل تائید کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾

ایمان والو اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم بنادے گا۔ (سورۃ محمد: 7)

اِس بنا پر جو بھی شخص اپنی تکلیفِ شرعی ادا کرے، اولیاء اللہ کو اپنا حاکم و سرپرست بنائے اور قیادتِ شرعیہ کے پرچم کے سایے میں جہاد کرے۔ تو یقینی اَمر ہے کہ وہ ضرور فتح و کامرانی حاصل کرے گا اور خدا اُس کی مدد و راہنمائی فرمائے گا۔

2 وحدت:

امام رضا علیہ السلام سے مروی روایت کے ذیل میں اِس طرف اِشارہ کیا گیا ہے۔ جس میں وحدتِ قیادت کی ضرورت کا سبب ذکر ہوا ہے ۔ اور وہ یہ کہ بلا شبہ واحد کی فعل و تدبیر میں اختلاف نہیں ہوتا۔ جب کہ دو افراد کا فعل اور ارادہ ایک نہیں ہوتا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ہر دو افراد کو مختلف سوچ اور ارادے کا حامل دیکھتے ہیں۔ لہذا اگر کوئی سے دو افراد مختلف فکر اور اردہ رکھتے ہوں اور اِس کے ساتھ اُن دونوں کی اطاعت واجب بھی ہو۔ تو اُن میں سے کوئی بھی دوسرے کی نسبت اطاعت کا زیادہ مستحق نہ ہوگا۔ ورنہ ایسی صورت میں لوگوں کے درمیان شدید قسم کا اختلاف، نزاع اور فساد کا ماحول بن جائے گا۔

بلا شبہ عادل ولی فقیہ اُمت کو متحد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب کہ دوسری طرف اِسلام دشمن عناصر اِس امت کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے لیے اپنا پورا زور صرف کررہے ہوں۔ کیونکہ اُنہوں نے ایک ہی سبق سیکھا ہے کہ تقسیم کردو اور حکمرانی کرو۔

3 عزت۔

جیسا کہ مذکورہ بالا آیت کریمہ میں ہے کہ جو بھی اللہ، رسولؐ اور ایمان والوں کو اپنا حاکم تسلیم کرے، تو بے

شک اللہ کی جماعت ہی غالب آنے والی ہے۔اِسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشادِ رب العباد ہے:

﴿مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا﴾

جوشخص عزت چاہتا ہے تو تمام عزت کا مالک اللہ ہی ہے۔

بلاشبہ عزت دینے والا خدا ہی ہے۔وہی حقیقی عزت،شرف اور کرامت کا مصدر ہے۔اور روح کو ایمان کے سایے میں اطمینان محسوس ہوتا ہے۔بے شک خدا کے دوستوں کو نہ کسی قسم کا خوف ہوتا ہے اور نہ ہی وہ کسی بات سے غم زدہ ہوتے ہیں۔اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا سے ہٹ کر کسی کے یہاں عزت تلاش کرنے سے انسان کو کامیابی نہیں ملتی۔لہذا مومنین خداوند متعال کی عزت کی شعاع سے عزت حاصل کرتے ہیں۔کیونکہ وہ ولی شرعی کی اطاعت کی پابندی کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر طے کرتے ہیں۔جو کہ خدا کی اطاعت کا سایہ ہے۔امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے روایت ہے:

إذا أردت عزّاً بلا عشيرة، وهيبة بلا سلطان، فأخرج من ذلّ معصية الله إلى عزّ طاعة الله

اگر تم بغیر خاندان کے عزت اور بغیر حکمرانی کے ہیبت چاہتے ہو تو خدا کی نافرمانی کی ذلت سے نکل کر اُس کی اطاعت کی عزات میں آجاؤ۔

المختصر حقیقی عزت خدا کی اطاعت میں پوشیدہ ہے۔جو کہ اُس کے اولیاء کے واسطہ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

''شوریٰ علماءجعفریہ''

شوریٰ علماءجعفریہ ایک ایسی جماعت ہے کہ جو آیۃ اللہ الشیخ محمد یعقوبی کے پرچم کے زیرسایہ قیادتِ شرعیہ کی پابند ہے۔یہ علماء کی جماعت ہے کہ جو ثقافتی،دینی اور اجتماعی کاموں کو شرعی ضوابط کے مطابق لے کر چلتی ہے۔اِسی لیے ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ پاکستان کے شیعی ماحول میں نہایت سرعت کے ساتھ اپنی کامیابی اور منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہے۔درحقیقت یہ سب فقیہِ عادل و جامع الشرائط آیۃ اللہ یعقوبی کی اتباع کی برکت سے ہے۔یہ جماعت فقیہِ عادل کی نیابت میں قیادتِ شوریٰ کو تسلیم کر کے خدا کا تقرب اور امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔اور جو اللہ،رسولؐ اور ایمان والوں کو اپنا حاکم مانے،تو بے شک خدا کی جماعت ہی غالب آنے والی ہے۔

[سبق9]

علماء سے متعلق اُمت کی ذمہ داریاں

علماء سے متعلق اُمت کی سب سے بڑی اور اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ علماء سے اتنا تعاون ضرور کریں۔تا کہ وہ معاشرے میں دین کی تعلیمات کو نافذ کرنے اور احکامِ اِسلامی کی حفاظت کے سلسلہ میں اپنا کردار بآسانی ادا کرسکیں ۔روایات میں علماء سے متعلق اُمت کی ذمہ داریوں کے حوالہ سے کچھ باتوں کا خصوصی طور پر بھی ذکر ملتا ہے۔جیسا کہ ایک روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

مَنِ اسۡتَقۡبَلَ العلماءَ فَقَدۡ استقبَلَنی، ومن زارَ العلماءَ فقد زارَنی، ومن جالس العلماء فقد جالسنی، ومن جالسنی فکأنّما جالس ربّی

''جس نے علماء کا استقبال کیا اُس نے میرا استقبال کیا۔جس نے علماء کی زیارت کی اُس نے میری زیارت کی ۔جو علماء کی صحبت میں بیٹھا وہ میری صحبت میں بیٹھا۔اور جو میری صحبت بیٹھا گویا وہ میرے رب کے قرب میں بیٹھا۔ ''

طولِ تاریخ میں علماء نے اِس دین کو محض صفحے پر پھیلائی ہوئی سیاہی، مسائل کی تشریح اور ادلہ و براہین قائم کرنے کی حد تک ہی محفوظ نہیں کیا۔ بلکہ اُنہوں نے مکمل طور پر اِس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر اُٹھایا، اِس کی حفاظت کی اور اُمت کے سامنے بیان کیا۔تا کہ اُنہیں زندگی گزارنے کے لیے ایک کامل منہاج ودستور مل جائے۔

بے شک یہ علماء ہی کی محنتیں اور کاوشیں تھیں کہ جس نے دنیا کو آخرت کے پھل اور باغات لگانے کی زمین بنا دیا۔لہذا اب سوال یہ ہے کہ ایسے مخلص راہنماؤں کا حق کیونکر ادا کیا جائے اور اِس سلسلہ میں اُمت کی ذمہ داری کیا بنتی ہے؟

بے شک علماء کا وجود ایک نعمت ہے جس پر خدا کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔شکر کی ادائیگی اور کمال کی معرفت اُس صورت میں ممکن ہے کہ جب انسان علماء کی کارکردگیوں سے استفادہ کرے۔اِس بنا پر علماء سے دور رہنا اُن کی صلاحیتوں اور کارکردگیوں کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔

علماء کی صحبت

روایات میں علماء کرام کی صحبت اختیار کرنے اور اُن سے راہنمائی حاصل کرنے کے بارے میں بہت زیادہ

تاکید وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ جس نے علماء کا استقبال کیا اُس نے میرا استقبال کیا، جس نے علماء کی زیارت کی اُس نے میری زیارت کی، جو علماء کی صحبت میں بیٹھا اُس نے میری صحبت اختیار کی اور جو میرے محضر میں بیٹھا گویا وہ میرے رب کے ساحتِ قدس میں رہا۔

مولائے کائناتؑ سے مروی ہے:

عجبت لمن يرغب في التكثير من الأصحاب كيف لا يصحب العلماء الألباء والأتقياء الذين يغنم فضائلهم، وتهديه علومهم وتزينه صحبتهم؟!

''مجھے اُس شخص پر تعجب ہے کہ جو زیادہ دوست بنانے کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ کیونکر دانشمند علماء اور اہلِ تقوی افراد کی صحبت اختیار نہیں کرتا کہ جن کی خوبیوں سے استفادہ کرے، جن کے علوم سے راہنمائی حاصل کرے اور جن کی صحبت اُس کے لیے باعثِ زینت ہو۔''

ایک دوسری روایت میں آپؑ سے مروی ہے:

جالس العلماء يزدد علمك، ويحسن أدبك

''علماء کی صحبت اختیار کرو۔ اِس سے تمہارے علم میں اضافہ ہوگا اور تمہارے آداب وخصائل اچھے ہو جائیں گے۔''

یہ روایات بالکل واضح طور پر علماء کی صحبت سے حاصل ہونے والے دو فوائد کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

پہلا فائدہ: علماء سے حاصل ہونے والا پہلا فائدہ ''علم'' ہے۔ جو عالم کے پاس ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں علماء سے اِستفادہ کی اہمیت پر تاکید کی گئی ہے۔ جیسے ارشاد ہے:

هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون

''کیا علم رکھنے والے اور جو علم نہیں رکھتے آپس میں برابر ہو سکتے ہیں؟''

دوسرا فائدہ: علماء کی صحبت میں رہنے سے انسان کو جو دوسری چیز حاصل ہوتی ہے۔ وہ اخلاقیات اور زندگی گزارنے کے آداب ہیں۔ کیونکہ عالم کا کردار صرف تعلیم میں منحصر نہیں۔ بلکہ اِس کے ساتھ ساتھ تربیت، اِسلامی آداب سکھانا اور نبویؐ اخلاقیات سے آراستہ کرنا بھی علماء ہی کی ذمہ داری ہے۔ بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایت میں تو یہاں تک وارد ہوا ہے کہ جو علماء کے پاس بیٹھا وہ میری صحبت میں بیٹھا اور جو میری صحبت بیٹھا وہ میری رب کے محضر میں رہا۔

اِس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ علماء کی صحبت کی برکات کا حساب لگانا مشکل ہے۔ اور اُن کی خدمت میں رہ کر ہر قسم کا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خیرِ مطلق ہے اور اُس کی صحبت اِستفادۂ مطلق سے کنایہ ہے کہ جس کی

کوئی حد نہیں۔ اِس روایت میں علماء کی محفل کو خدا کے صحبت سے تشبیہ دی گئی ہے۔لہذا علماء کے پاس رہ کر ہر قسم کی بھلائی کی توقع کی جاسکتی ہے۔

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

یا بنی! جالس العلماء وزاحمهم بر كبتيك، فإن الله عز وجل يحيى القلوب بنور الحكمة كما يحيى الأرض بوابل السماء

''اے میرے بیٹے! علماء کی صحبت وہم نشینی اختیار کرو اور اُن کے سامنے زانوُ اداب بچھادو۔کیونکہ بلاشبہ خدا دلوں کو حکمت کے نور سے زندہ کرتا ہے۔جیسے زمین کو آسمان کی بارش سے حیات بخشتا ہے۔''

اِس وصیت سے کوئی بھی شخص مستثنیٰ نہیں ہے۔حتیٰ کہ اربابِ حکومت اور ذمہ دار شخصیات بھی۔کیونکہ روایات میں یہ بات تاکید سے آئی ہے کہ امراء وملوک کو چاہیے کہ وہ علماء کی خدمت میں حاضر ہوں۔نہ کہ علماء اُن کے پاس جائیں۔جیسا کہ ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

الملوك حكام على الناس، والعلماء حكام على الملوك

''بادشاہ لوگوں پر حاکم ہوتے ہیں اور علماء بادشاہوں پر حاکم ہوتے ہیں۔''

جب ہم آیۃ اللہ یعقوبی کی توجیہات کا مطالعہ کرتے ہیں۔تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اس بات کی بہت زیادہ تاکید کرتے ہیں۔آپ نہ صرف اُن کی زیارت اور اُن کی خدمت میں جانے کی تاکید کرتے ہیں۔بلکہ اُن سے متعلق ذمہ داریوں کے بارے میں بھی توجہ دلاتے ہیں۔کیونکہ علماء کی اِسلام کی بقاء اور حفاظت کی ضمانت ہیں۔آپ فرماتے ہیں:

''بے شک حوزاتِ علمیہ نے ہی اب تک اِسلام کی حفاظت کی ہے۔اگر علماء کا وجود نہ ہوتا تو اِسلام کا نام بھی باقی نہ ہوتا۔بلاشبہ مشکل حالات اور کٹھن ادوار میں علماء کرامؒ نے اِسلام کو زندہ رکھا ہے۔لہذا اُن سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ رہو۔''

علماء سے دوری کے اثرات

بے شک علماء کی محفلیں خدا تک پہنچنے کا راستہ ہیں۔یہی وہ قلعے ہیں جن میں انسان مشکلات میں پناہ لیتا ہے۔جیسا کہ امام علی زین العابدین علیہ السلام نے اپنی دعاؤں میں اِس طرف اشارہ کیا ہے۔جو کہ ہر طبقے کے شخص کے لیے تربیت کا بہترین اور کامل ترین نصاب ہیں۔امامؑ فرماتے ہیں:

أو لعلك فقدتني من مجالس العلماء فخذلتني

''یا شاید تو نے مجھے علماء کی صحبتوں اور مجالس سے دور پایا اِس لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔''

یہاں مولا علی زین العابدین نے ایک مختصر سے کلمہ کے ذریعے اشارہ فرمایا ہے کہ علماء کی دوری سے کیسے کیسے بھیانک اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ اور وہ کلمہ خذلان (ذلیل کرنا یا اپنے حال پر چھوڑ دینا) ہے۔ بتایئے! اگر خدا ہمیں ذلیل کرنا چاہے تو ہمارا کیا بچے گا؟ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں پلک جھپکنے کی دیر بھی اپنے حال پر نہ چھوڑے۔

''انذار وتنبیہ''

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک روایت موجود ہے جو نہایت ہی توجہ کی طالب ہے۔ یہ روایت خطرے کی گھنٹی بجاتی ہے، بالخصوص اِن زمانوں میں۔ آپ فرماتے ہیں:

سيأتي زمان على أمتي يفرون من العلماء كما يفر الغنم عن الذئب، ابتلاهم الله تعالى بثلاثة أشياء:الأول: يرفع البركة من أموالهم.الثاني: سلط الله سلطاناً جائراً.الثالث: يخرجون من الدنيا بلا إيمان

''میری اُمت پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ وہ علماء سے ایسے بھاگیں گے جیسے بھیڑ، بھیڑیے سے دور بھاگتی ہے۔ اِس وجہ سے خدا اُن لوگوں کو تین طرح کے عذاب میں مبتلا کرے گا: (۱) اُن کے اَموال سے برکت اُٹھ جائے گی۔ (۲) خدا اُن پر ظالم حاکم مسلط کرے گا۔ (۳) وہ دنیا سے بغیر ایمان کے جائیں گے۔''

ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اِس روایت میں جس زمانے کے بارے میں خبردار کیا گیا ہے۔ کہیں وہ ہمارا زمانہ نہ ہو۔

اِس بارے میں مرجع عالی قدر شیخ یعقوبی فرماتے ہیں:

لابد من التمسك بالقيادة الربانية وإتباعها كي لا يحصل بنا ما حصل مع بني إسرائيل الذين إبتلاهم الله بالتيه 40 سنة لأنهم خذلوا نبيه المُرسل موسى عليه السلام ، هذه هي الضريبة التي تدفعها الأمة عندما تتخلف عن قيادتها الربانية وتتبع قيادات ضلال.

''قیادتِ ربانیہ کے ساتھ تمسک اور اُس کی اتباع ضروری ہے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہمارا حال بھی بنی اِسرائیل والا ہو جائے۔ جنہوں نے اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ نہ دیا تو خدا نے اُنہیں چالیس سال تک صحرائے تیہ میں بھٹکائے رکھا۔ خدانخواستہ اگر اِس اُمت نے بھی اپنی ربانی قیادت سے منہ موڑا اور گمراہ لیڈروں کے پیچھے چلی تو اِس کا

حال بھی بنی اسرائیل سے مختلف نہ ہوگا۔''

لوگوں کا غلط طرزِ عمل جن اہم امور کے بارے میں مرجع یعقوبی نے تنبیہ فرمائی ہے اُن میں سے ایک لوگوں کا علماء کے بارے میں جلدی منفی پروپیگنڈا کا شکار ہوجانا ہے۔ جب کسی ایک شخص کی غلطی دیکھتے ہیں تو اُس پورے شعبے کو بدنام کرنے لگتے ہیں۔ اورصرف اُسی کے متعلق سوءِ ظن پر اکتفاءنہیں کرتے۔ یہ بہت بڑی غفلت ہے کہ اِس میں کسی ایک عمامہ پوش کی غلطی، تقصیر، یا اشتباہ کی وجہ سے حوزہ اور ہر صاحبِ عمامہ بدنام ہوجاتا ہے۔

حضرت امام خمینیؒ فرماتے ہیں: جب لوگ کسی دین دار شخص کو غلط راہ پر دیکھتے ہیں تو وہ ہر دین دار کے متعلق ایسے ہی بدگمانی شروع کردیتے ہیں۔ نہ کہ صرف اُس شخص تک محدود رہتے ہیں جسے اُنہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو ۔اے کاش کہ لوگ صرف اُسی تک محدود رہتے کہ جس نے غلطی کی ہو۔ اورسب کو اِس میں شامل نہ کرتے۔ جب لوگ کسی صاحبِ عمامہ سے کوئی غیر مناسب حرکت صادر ہوتے دیکھتے ہیں تو وہ اپنے لیے سب کچھ حلال کرلیتے ہیں ۔حالانکہ اُنہیں جاننا چاہیے کہ جس طرح زندگی کے دیگر شعبوں سے وابستہ لوگوں جیسے کاروباری حضرات اور ملازمت پیشہ افراد میں کچھ لوگ منحرف اور غلط عادات کا شکار ہوتے ہیں۔

اِسی طرح عمامہ پوش اور دیندار طبقے میں کچھ منحرف اور غیر صالح افراد ہوتے ہیں۔لیکن لوگوں کا طرزِ عمل نہایت ہی عجیب ہے۔ جب وہ کسی سبزی فروش کو غلطی پر دیکھیں گے تو کہیں گے کہ فلاں سبزی فروش برا ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی عطر فروش غلط کاری پر لگا ہو تو لوگ یہی کہیں گے کہ فلاں عطار ٹھیک نہیں۔لیکن جب کوئی عمامہ پہننے والا مولوی کوئی غیر مناسب عمل انجام دے تو وہ کہتے ہیں: عمامہ پہننے والے سب ایک جیسے ہیں۔(یعنی اِن میں اچھا کوئی نہیں۔)

فہرست مضامین

مقدمہ	5
احکام	7
احکام خمسہ	10
تقلید	13
نجاسات	15
مطہرات (1)	16
مطہرات (2)	18
وضو	19
وضو کی شرائط	21
واجب غسل	22
طریقہ غسل	23
تیمم	23
جبیرہ	24
واجب نمازیں	25
واجبات نماز	26
مکروہات نماز	27
روزہ	28
احکام میت	30
کفن	31
نمازمیت کا طریقہ	32

دفن میت	33
نماز جمعہ نماز آیات نماز عیدین	33
نگاہ	35
مسجد	37
کھانا کھانے کے آداب	38
پانی پینے کے آداب	39
سونے اور رفع حاجت کے آداب	40
اخلاقیات	41
اخلاق	44
جھوٹ	47
دوسروں کے مال کا استعمال	50
نخوت وتکبر	54
امر بالمعروف ونہی عن المنکر	57
ایک مفید ملاقات (غیبت)	61
غصہ اور گالی گلوچ	64
دعا	67
حسد	71
ضیاع وقت	74
توہین مؤمن	77
ملاقات مومن (حصہ اوّل)	81
ملاقات مومن (حصہ دوم)	84
صلہ رحمی	88
قطع رحمی	90
بخل واسراف	91

بخل	91
اسراف	93
دوستی	94
احترام والدین (حصہ اول)	97
حقوق والدین (حصہ دوم)	100
بری صحبت	103
موسیقی	106
تاریخ اسلام اور سیرت معصومینؑ	109
خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)	112
بعثت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	115
ہجرت مدینہ سے فتح مکہ تک	117
جنگ بدر	118
جنگ اُحد	118
جنگ خندق	118
صلح حدیبیہ	119
جنگ خیبر	119
فتح مکہ	120
حجۃ الوداع	121
اعلانِ غدیر	122
وفات	122
حضرت امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام	123
دور خلافت	127
شہادت	130
حضرت فاطمہ الزہراء سلام اللہ علیہا	131

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام	135
حضرت امام حسین علیہ السلام	140
تحریک کربلا	145
حضرت امام علی ابن الحسین علیہ السلام	150
حضرت امام محمد باقر علیہ السلام	155
حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام	160
حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام	165
حضرت امام علی رضا علیہ السلام	168
حضرت امام محمد تقی علیہ السلام	173
حضرت امام علی نقی علیہ السلام	178
حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام	182
حضرت امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف	185
ظہور امام مہدیؑ از نظر اہل بیتؑ	187
امام مہدیؑ کی حفاظت کا الٰہی انتظام	189
غیبت امام مہدیؑ	190
غیبت و نیابت امامؑ	191
دور غیبت میں ہمارے فرائض	192
عقائد	195
اصول دین	198
اثبات وجود خدا	199
خدا کی صفات	201
توحید	203
توحید کی اقسام	203
تجسیم خدا	205

عدل کی تعریف	206
قسمت کا کھیل	208
نبوت	209
نبی کے شرائط	211
اولوالعزم انبیاء	211
آسمانی کتب	212
معجزہ	212
قرآن مجید اور آسمانی کتابیں	214
امامت	216
شرائط امامت	217
محبت اہل بیتؑ	219
عقیدہ توسل	221
شفاعت	223
مہدویت	224
رجعت	226
قیامت	228
حساب وکتاب	230
قرآنیات	234
قرآن مجید کا تعارف	236
فضائل قرآن	238
قرآن مجید کی تلاوت کے آداب وثواب	240
جمع قرآن	244
عدم تحریف قرآن	247
قرآن مجید کی جاذبیت	249

قرآن اور اہل بیتؑ	251
اجرِ رسالت	253
خدا پسند تمنائیں	255
مفاہیمِ اسلامیہ	257
اتحاد بین المومنین	259
اِسلام میں علماء کا مقام	261
تقلید اور مرجعِ تقلید	272
مرجع کی صفات	276
زمانہ غیبت میں فقہاء کی ولایت	280
شمائلِ مومن	285
اداءِ تکلیف	291
علماء سے متعلق اُمت کی ذمہ داریاں	298